مُسلم دُنیا کی بے اطمینانی

۱۱ستمبر سے پہلے اور بعد

پروفیسر خورشید احمد

IPS انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

امریکہ: مُسلم دُنیا کی بے اطمینانی

امریکہ: مُسلم دُنیا کی بے اطمینانی

۱۱ ستمبر سے پہلے اور بعد

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

کتاب : امریکہ: مسلم دنیا کی بے اطمینانی

۱۱ ستمبر سے پہلے اور بعد؟

مصنف : پروفیسر خورشید احمد

مرتب : سلیم منصور خالد

طبع اول : ۲۰۰۲ء

طبع سوم : ۲۰۰۵ء

ناشر : انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

بلاک ۱۹، مرکز ایف، سیون

اسلام آباد

فون: 051-2650971-3

فیکس: 051-2650704

www.ips.org.pk

قیمت :

ترتیب

۲- نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

۳- پاکستان' امریکہ تعلقات: عصری تقاضے

۴- امریکہ کے عالمی کردار سے بے زاری: اسباب وعوامل

۱۱ ستمبر کے بعد

۵- نئی صلیبی جنگ کا آغاز؟

۶- افغانستان پر امریکی حملہ: عالمی قانون کی خلاف ورزی

۷- افغانستان: حکومت پاکستان کے کردار کا جائزہ

۸- نیا استعمار: اہداف' حکمت عملی اور جوابی لائحہ عمل

۹- امریکہ میں دعوت اسلامی: امکانات' اہداف' مشکلات

دیباچہ

اکیسویں صدی عیسوی کو اپنے آغاز پر انسانی ترقی کے کمال اور سائنسی ترقیات کے عروج سے منسوب کیا گیا تھا۔ لیکن عالم انسانیت کی عام' بے بس اور محکوم اقوام کے ساتھ جو رویہ استعماری قوتوں کی جانب سے اختیار کیا جا رہا ہے' وہ اپنی شدت اور تباہ کاری کی وسعت کے لحاظ سے پتھر کے قدیم زمانے سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔ اس منفی عمل میں سماجی ترقی اور سائنسی ترقی' دونوں کا غلط استعمال سامنے ہے۔

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے عالمی تجارتی مرکز اور دفاعی مرکز پر نامعلوم افراد کے خودکش حملوں نے بے گناہ شہریوں کو جس انداز سے نشانہ بنایا' اس کے قابل مذمت ہونے کے بارے میں دو آرا نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا ناقابل فہم اور قابل مذمت پہلو یہ ہے کہ' ان گم نام قاتلوں کا سراغ لگانے اور ان کا نام پتا متعین کرنے سے پُراسرار طور پر دانستہ پہلوتہی برتی گئی اور اس مجرمانہ غفلت نے ایک نہایت تباہ کن صورت حال پیدا ہونے کا موقع دیا۔ امریکی پالیسی سازوں نے اس امر کا احتساب کرنے اور جائزہ لینے کے بجائے اپنے ہم وطنوں کے غم و غصے کو دوسرے رُخ پر ڈال دیا' جس کے مطابق پہلے اسامہ پھر افغانستان اور عملاً اسلام کو اس المیے کا ذمہ دار قرار دے دیا۔

اس کے ساتھ ہی ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو افغانستان پر جس خوف ناک انداز سے' یک طرفہ جنگ مسلط کی گئی' وہ بھی عصر حاضر کی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ ظلم اور دوسری اقوام پر فوج کشی کی اس روایت نے چھوٹی اقوام کے مستقبل کو ایک مستقل خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ اس ڈرامے کے خالق' ڈاروزم کے اصول: ''زندہ رہنے کا حق' صرف طاقت ور کے لیے ہے'' پر عمل پیرا ہیں۔

دنیا کی اقوام کے بارے میں بالعموم اور مسلم دنیا اور پاکستان کے سلسلے میں بالخصوص امریکہ نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے' اس کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے ماہ نامہ ترجمان القرآن میں' چند ادارتی مضامین تحریر کیے' یہ کتاب انھی مضامین پر مشتمل ہے۔

اگر چہ یہ تبصرے اور تجزیے' فوری طور پر سامنے آنے والے واقعات کے پیش نظر تحریر کیے گئے تھے' لیکن اس بحث میں مسئلے کے تہذیبی' فکری' عسکری اور سیاسی پہلوؤں پر جو معروضات پیش کی گئیں' وہ مستقل نوعیت کے امور سے متعلق ہیں۔

میں شکرگزار ہوں کہ برادرم مسلم سجاد کی دعوت پر' عزیزم سلیم منصور خالد نے ان مضامین کو کتابی ضروریات ملحوظ رکھتے ہوئے مرتب کر دیا ہے۔ اس معاونت پر اللہ تعالی سے میری دعا ہے کہ وہ انھیں بہترین جزا سے نوازے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو آوازہ حق کے لیے کھول دے۔

خورشید احمد

گزارشات

یہ ملت اسلامیہ کی غفلتوں کا نتیجہ ہے یا ملتِ کفار کی فتنہ سامانیوں کا مظہر' بہرحال اُمت پر ٹوٹ پڑنے والی آفتوں کو دیکھ کر دنیا بھر میں مسلمان کے دلوں سے یہ ہوک نکلتی ہے: ع

اُمت پہ تری' آ کے عجب وقت' پڑا ہے

اور ابھی یہ دعائیہ الفاظ لبوں ہی پر ہوتے ہیں کہ ''وہی ہے چال بے ڈھنگی' جو پہلے تھی سو اب بھی ہے'' کا منظر سامنے آتا ہے۔ مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین' بوسنیا اور چیچنیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہو یا بھارت میں مسلمانوں کی بے بسی کا عالم' معاشی محکومی ہو یا سیاسی غلامی کا عبرتناک حوالہ --- ہر منظر ہولناک ہونے کے باوجود' محض ایک وقتی تاثر کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

خانقاہی نظام تعلیم نے اسے قسمت اور تقدیر کا لکھا کہہ کر قناعت اور برداشت کرتے رہنے کا درس دیا۔ جدید نظام تعلیم نے گردنوں کی سلامتی کے لیے مغربی استعمار کے سامنے مکمل خودسپردگی کو راہ عافیت قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تڑپتے دلوں کے آہ و بکا' افکار کی دُنیا میں اٹھتے ہوئے اضطراب اور ہونٹوں پر نمودار ہوتے احتجاجی جذبات' وجود میں آنے سے پہلے فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں اور حکمران امن اور چین کا نوشتہ لکھ کر اپنے اقتدار کی رسّی کو دراز کر لیتے ہیں۔

اس طوفان خیز اور گرداب زدہ ماحول میں وہ چند ہستیاں کتنی قابل قدر ہیں' جو مسلمانوں کے اس المیے کی شدت کا شعور رکھتی ہیں اور جو حالات سے مایوس نہیں ہیں۔ جن کی نظر نہ صرف مستقبل پر ہے بلکہ وہ اپنوں کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے والی جنس فرومایہ کی فطرت سے بھی آگاہ ہیں۔ ایسی ہی ایک دانا و بینا اور صاحب بصیرت شخصیت کا نام پروفیسر خورشید احمد ہے۔

ملت اسلامیہ کے دکھ درد کی کسک محسوس کرنے کی نعمت' اللہ تعالیٰ نے انھیں زمانہ طالب علمی ہی سے عطا فرمائی ہے۔ بعدازاں متعدد قومی اور عالمی جریدوں میں انھوں نے اظہار حقیقت اور حق گوئی کا فریضہ بڑے تسلسل سے ادا کیا ہے۔ زیرنظر کتاب میں' پروفیسر صاحب کی چند تحریریں ۱۱ستمبر۲۰۰۱ء سے پہلے اور دیگر تحریریں ۱۱ستمبر کے بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔ یاد رہے' بیسویں صدی کے معرکہ آرا ماہ نامے ترجمان القرآن میں ان مقالات کا بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے۔

پروفیسر صاحب نے امریکہ کے پردے میں گرفت مضبوط بنانے والے مغربی سیکولر استعمار کے عزائم' اہداف اور حکمت عملی کو بڑی صاف گوئی سے بے نقاب کیا ہے۔ اس تلخ صورت حال میں انھوں نے اُمت مسلمہ کا مقدمہ' غیر جذباتی اور منطقی انداز میں بیان کیا ہے۔ زیرنظر تحریروں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے' جیسے ایک بلند پایہ قانون دان' مقدمے کی جزئیات اور بنیادوں کو دو اور دو چار کی طرح پیش کر رہا ہے۔ اُمت کے مقدمے کی پیش کاری میں انھوں نے مسلمان دانش وروں کے حوالہ جات پیش کرنے کے بجائے' نظائر خود اہل مغرب کے ہاں سے چنے ہیں۔ ہر بات کو پورے پس منظر کے ساتھ' خوب صورت ترتیب اور موثر طرزِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ قدم قدم پر وہ تنبیہ کرنے' غلطی کو واضح کرنے اور بچاؤ کے راستے دکھانے والے رہبر کی طرح راست روی کا پیغام دیتے ہیں۔ نئے استعمار کے مکروہ عزائم کو بے حجاب کرنے کے ساتھ' وہ مثبت طور پر مسلمانوں کے لیے راہِ فکروعمل بھی تجویز کرتے ہیں۔

ان مقالات کو اس جذبے کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے کہ اہل پاکستان اور اُمت مسلمہ میں ان حالات' مسائل اور خطرات کا صحیح تصور پیدا ہو سکے۔ خطرات کی گرفت روز بروز مضبوط تر ہوتی جارہی ہے' اگر دانش' حکمت اور تسلسل سے اُمت مسلمہ نے مل کر ان خطرات کے مقابلے کی تدابیر نہ کیں تو اس کے بڑے تباہ کن نتائج ہو سکتے ہیں۔ کوئی مشکل ایسی نہیں جس کا حل نہ تلاش کیا جا سکتا ہو اور کوئی خطرہ ایسا نہیں جس کا مقابلہ ممکن نہ ہو۔ البتہ اس کے لیے ایمان اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ موزوں حکمت عملی' صحیح تدبیر اور وسائل کا مناسب استعمال ضروری ہے۔

پروفیسر خورشید احمد صاحب کی یہ کتاب صرف ماضی اور حال ہی کا جائزہ نہیں' بلکہ مستقبل میں پیش بندی کے لیے واضح خطوط کار پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امریکہ کی قیادت میں مغرب' اپنے مادی' سیاسی اور آخرکار مذہبی مفادات کو تحفظ دینے کے لیے' تہذیب و شایستگی کی ہر قدر کو پامال کرنا اپنا خودساختہ ''قانونی'' حق سمجھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان' اپنے مفادات پر ہونے والی ڈاکازنی کا شعور رکھنے کے باوجود' کچھ نہیں مانگتے۔ وہ تو صرف اپنے اسلامی تہذیبی تشخص کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس جدوجہد کے جواب میں انھیں موت یا غلامی' میں سے ایک راستہ چننے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس تناظر میں زیرنظر کتاب کا اصل پیغام یہ ہے کہ حالات کا صحیح شعور ہو' مقابلے کے لیے موثر حکمت عملی تیار کی جائے اور حالات کے دھارے کا رُخ موڑنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ یہی زندگی' ترقی اور کامیابی کا راستہ ہے۔

مرتب اپنے احباب میں سے: جناب مسلم سجاد' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' راشد الیاس مہر اور سید حیدر زیدی کا شکرگزار ہے کہ انھوں نے' ان مقالات کی کتابی تشکیل میں اپنے ماہرانہ مشوروں اور فنی تعاون سے نوازا۔

گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور

سلیم منصور خالد

نیو ورلڈ آرڈر - دعوے اور حقائق

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں نئے نظام کی آرزو، جستجو، تلاش اور جدوجہد اُن افراد، گروہوں، طبقات یا قوموں نے کی ہے جو مروجہ نظام کے ستم زدہ ہوتے ہیں اور ظلم کی جس چکی میں وہ پس رہے ہوتے ہیں، اُس سے نجات پانے کے لیے نئی راہوں اور نئی منزلوں کی دریافت کے لیے سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

اس کی حالیہ مثال وہ جدوجہد ہے جو چند ہی سال پہلے تیسری دُنیا کی اقوام نے ''نئے عالمی معاشی نظام'' کی آواز اٹھا کر کی تھی، اور جس کے لیے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا خصوصی اجلاس ۱۹۷۴ء میں بلایا گیا۔ پھر کئی سال تک اقوامِ متحدہ اور دُنیا کے ہر دُوسرے قومی اور بین الاقوامی فورم پر اِس کی بازگشت سنائی دی۔ لیکن وقت کی حکمران اور قابض قوموں نے جن میں امریکہ سب سے پیش پیش تھا، نہ صرف یہ کہ اس آواز پر کان نہ دھرے، بلکہ اُسے خاموش کرنے کے لیے کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا اور بالآخر یہ آواز صدا بصحرا بن کر رہ گئی۔

نیا عالمی نظام

اِس پس منظر میں کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ اب خود امریکہ اور اُس کے صدر جارج

بش سینئر [۱۹۸۹-۹۳ء] نے ''نئے عالمی نظام'' (New World Order) کی بات کی ہے۔ صرف بات ہی نہیں کی' بلکہ اس کے لیے زبان' قلم' تلوار اور ترغیب و ترہیب کا ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر مجوزہ نظام کو ایک بڑے سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ برطانوی اخبار گارڈین نے نئے نظام کے بارے میں دُنیا کے چوٹی کے سات مفکرین کے تجزیے کو جس عنوان سے پیش کیا ہے' وہ یہی سوالیہ نشان ہے[1]۔

اگرچہ مغرب کے اہل نظر اِس نظام کو صرف ایک سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھ رہے ہیں' لیکن تیسری دُنیا اور خصوصیت سے عالم اسلام اور شرق اوسط کے اہل دانش و بینش صرف ایک سوالیہ نشان ہی نہیں دیکھ رہے' بلکہ اُن کو افق پر وہ خونی آندھیاں بھی صاف نظر آ رہی ہیں' جو اِس ''عالمی نظام'' کے جلو میں اُن کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں۔ چین کے وزیر خارجہ کیون کی چن نے ۱۹/اپریل ۱۹۹۱ء کو صاف لفظوں میں کہا: ''یہ خیال بھی اپنے اندر پُر ہول خطرات کا ایک طوفان رکھتا ہے کہ اب دُنیا میں صرف ایک سپر پاور ہوگی جو پوری دُنیا پر چھا جائے''۔

مسلم دُنیا سے آواز

اس سلسلے میں پاکستان کے صدر جناب غلام اسحاق خان [۱۹۸۸-۹۳ء] اور

۱- New World Order گارڈین اسٹڈیز' جلد اول' اپریل ۱۹۹۱ء' گارڈین کا منیجر ایڈمن ایلن روس بریجر اپنے ابتدائیہ میں لکھتا ہے: A question mark was judiciously placed at the end of the title. ''اس عنوان کے اختتام پر پوری دیانت کے ساتھ ایک سوالیہ نشان کا اضافہ کر دیا گیا تھا''۔ یہ تو حالیہ تاریخ کی بات ہے۔ بالکل اس سے ملتی ہوئی بات مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۲ء میں لکھی تھی: ''آج ہم نئے نظام' نیو آرڈر کی آوازیں ہر طرف سے سن رہے ہیں' لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جن بنیادی خرابیوں نے پرانے نظام کو آخرکار فتنہ بنا کر چھوڑا' وہی اگر صورت بدل کر کسی نئے نظام میں بھی موجود ہوں تو وہ نیا نظام ہوا کب؟ (ترجمان القرآن' اپریل ۱۹۴۲ء)

ایران کے رہبر جناب آیت اللہ خامنہ ای کا مشترکہ اعلامیہ' آج بھی اُمت مسلمہ کے دل کی آواز ہے' جس میں اُنھوں نے کہا:

مسلم ممالک آج کی دُنیا اور نیو ورلڈ آرڈر کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے متحد ہو جائیں' تاکہ نئے عالمی نظام میں اُن کے مفادات کا احترام کیا جا سکے۔ مسلم ممالک باہم تعاون کریں' تاکہ نیا عالمی نظام اُن پر مسلّط نہ کیا جا سکے۔ (وقت کی ضرورت ہے کہ) مسلم ممالک باہمی تعاون کے ذریعے ایک منصفانہ عالمی نظام کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔[۲]

پاکستان اور ایران دُنیا کے وہ دو مسلمان ملک ہیں جنھوں نے اپنا تشخص ''اسلامی جمہوریہ'' کے دستوری نام کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ اِن دونوں ملکوں کے اِن قائدین کا یہ انتباہ وقت کی پکار ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ صدر پاکستان کے اِس دورہ کے اس اہم ترین اعلان کا پاکستان میں قومی سطح پر یا خود عالمی سطح پر کوئی نوٹس ہی نہیں لیا گیا۔ حالانکہ' پاکستان اور اُمت مسلمہ کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم سوال ہے ہی یہ کہ: اس وقت مغربی اقوام' دُنیا کا کیسا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں اور اِس میں پاکستان' اسلامی احیا اور اُمت مسلمہ کے لیے کیا خطرات پوشیدہ ہیں؟ عالمی سیاست کے ایوانوں میں مستقبل کے لیے کیا سوچ بچار اور منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں؟ ان سوالات کو نظرانداز کرنا اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔ ان کے بارے میں اُمت کو بروقت متنبہ کرنا دراصل ان خطرات کے مقابلے کے لیے اُمت کو تیار کرنے کا ذریعہ بنے گا۔

ورلڈ آرڈر بطور نظریہ

واشنگٹن پوسٹ کا نامہ نگار' ڈان اوبرڈورفر (Dan Orberdorfer)

۲- روزنامہ جنگ' کراچی' ۱۵ ستمبر ۱۹۹۱ء' The News ۱۶ ستمبر ۱۹۹۱ء

رقم طراز ہے:

۲۳/اگست (۱۹۹۰ء) کو صدر بش اور اُن کے قومی سلامتی کے مشیر برینٹ سکو کرافٹ' چھٹیاں گزارنے کے صدارتی مسکن کے قریب بحر اٹلانٹک میں حالاتِ حاضرہ پر غور وفکر اور مچھلی کے شکار کے لیے گئے۔ صدر امریکہ سے چار گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ واپس آئے۔ اس سفر اور ملاقات کا حاصل تین مچھلیاں اور امریکی خارجہ پالیسی کا ایک نیا تصور تھا' جو بعد کے دنوں میں صدر بش کی تمام تر گرم گفتاری کا مرکز ومحور بن گیا یعنی ''نیا عالمی نظام'' (نیو ورلڈ آرڈر)[۳]

پھر چند ہی ہفتوں کے اندر نئے ''عالمی نظام'' کے نعرے نے امریکہ کی نئی عالمی پالیسی کے مرکزی ستون کی حیثیت اختیار کر لی۔ امریکی کانگرس میں خطاب سے لے کر اقوامِ متحدہ میں خطاب تک' صدر بش نے نئے عالمی نظام کا غلغلہ بلند کیا۔ ڈان اوبرڈورفر کے بقول: اگست ۱۹۹۰ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک صدر بش نے اپنے بیانوں اور تقریروں میں بیالیس (۴۲) مرتبہ اِس ''نئے عالمی نظام'' کی بات کو پورے زور شور سے پیش کیا اور اِسے مستقبل کی پالیسی کی اساس قرار دیا۔ اِس سلسلے میں جو دعوے کیے گئے اور جن حسین الفاظ کا سہارا لیا گیا' ان کی چند جھلکیاں صورتِ حال کو سمجھنے میں مددگار ہوں گی۔

۱۱ستمبر ۱۹۹۰ء امریکی کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے امریکی صدر نے کہا:

ہم آج ایک منفرد اور غیر معمولی تاریخی لمحے کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ خلیج کا بحران بلاشبہ بہت خطرناک اور گھمبیر بحران ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک نادر موقع بھی فراہم کر رہا ہے' جس کے نتیجے میں عالمی طاقتوں کے درمیان تاریخی تعاون کا نیا دَور شروع ہو جائے گا۔ اِن آفت زدہ ایام کے غبار سے ہمارا پانچواں مقصد برآمد ہوسکتا ہے یعنی --- ایک نیا عالمی نظام' ایک ایسا نیا دور' جو

۳- واشنگٹن پوسٹ' ۲۶ مئی ۱۹۹۱ء۔

طاقت کے استعمال کے خطرات سے پاک ہو' جو انصاف کے قیام کے لیے قوی اور توانا ہو اور جس میں امن و سلامتی کا حصول زیادہ ممکن ہو[۴]

امریکی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر برینٹ سکوکرافٹ نے کہا:

''ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم ایک نئے عالمی نظام کی ابتدا کر رہے ہیں اور یہ نیا نظام امریکہ اور روس کی مخاصمت کے دَور کے چکنا چور ہونے سے جنم لے رہا ہے۔ ہم حالیہ (خلیجی) بحران کو ساری دُنیا میں اس تصور کو منوانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ مستقبل کے لیے بڑا اہم ہے۔ ہم اس بحران سے ایک نیا نظام بنا لینا چاہتے ہیں''[۵]

ورلڈر آرڈر اور عزائم

صدر بش نے ۶ مارچ ۱۹۹۱ء خلیج کی جنگ میں [عراق پر اپنے فضائی حملوں کی] کامیابی کے فوراً بعد دعویٰ کیا:

''اب ہم ایک نئی دُنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے اُبھرتا دیکھ رہے ہیں''۔

بش صاحب نے اپنے اس نئے نظام کے خدوخال پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید کہا:

نئے عالمی نظام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی قومی حاکمیت (National Sovereignty) سے دست کش ہو جائیں یا اپنے قومی مفادات کو بھول جائیں۔ یہ عالمی نظام دراصل صورت گری کرتا ہے اس ذمہ داری کی' جو [خلیجی

۴- امریکی کانگرس کے سامنے صدر بش کی تقریر ۱۱ ستمبر ۱۹۹۰ء بحوالہ مجلّہ Survival انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز' لندن' مئی/ جون ۱۹۹۱ء' ص ۱۹۵۔

۵- واشنگٹن پوسٹ' ۲۶ مئی ۱۹۹۱ء۔

جنگ میں] اس کامیابی نے ہم پر عائد کی ہے۔ جارحیت (agression) کو روکنے اور استحکام' خوش حالی اور امن و آشتی کے حصول کے لیے دُوسری اقوام سے تعاون کی نئی راہیں نکالنے سے یہ نظام عبارت ہے۔ یہ ماحصل ہے اس اُمید کا جو بڑی اور چھوٹی اقوام کے درمیان ایک مشترک عزم پیدا کر رہی ہے۔ اِس کی منزل ایک ایسی دُنیا ہے جہاں تنازعات کا حل پُرامن ذرائع سے ہو' جہاں جارحیت کا مقابلہ سب متحد ہو کر کریں' جس میں اسلحے کے ذخیروں کو قابو کیا جا سکے اور جس میں تمام انسانوں کے ساتھ انصاف کا سلوک ہو سکے۔[6]

ان حسین لفظوں اور دل پسند دعووں کے ساتھ اس نئے عالمی نظام کی سب سے بڑی خصوصیت بھی امریکی حکمرانوں کی زبانوں پر آ گئی کہ اب صرف امریکہ' دُنیا کی واحد ''سپر پاور'' ہے۔ خلیج کی جنگ میں عراق کے خلاف یک طرفہ طور پر ''فتح'' پا کر ویت نام کے ڈراؤنے خواب (Vietnam syndrome) سے نجات پا چکی ہے اور آنے والے دور کا نام اب ''امریکہ کی صدی'' (American Century) کہلائے گا۔ صدر بش نے ٹائم میگزین کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے بڑے اہم ہیں:

نامہ نگار: آپ نے نئے عالمی نظام کا ذکر کیا ہے کیا دوسرے الفاظ میں اِس کا یہ مفہوم نہیں کہ امریکہ دُنیا کا پولیس مین بن کر رہے گا؟

صدر بش: موجودہ عالمی تناظر میں صاف صاف بات یہ ہے کہ جب دُنیا کو محفوظ جگہ بنانے کی بات ہو تو پھر امریکہ کے شانوں پر ایک غیر مساوی ذمہ داری (disproportionate responsibility) عائد ہوتی ہے۔ تاہم میں

۶- لورنس فریڈمین کا مضمون The Gulf and the New World Order مجلّہ *Survival* لندن' مئی/جون' ۱۹۹۱ء' ص ۶-۱۹۵۔

امریکہ کے اس کردار کو عالمی پولیس مین کا کردار نہیں کہوں گا' اس لیے کہ ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں جن میں ہم کوئی کردار ادا نہ کریں یا کرنا نہ چاہیں۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا کے مختلف ممالک کی سلامتی اور آزادی کے باب میں ہماری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے[7]

اس ''فکر اور فلسفہ'' کا ترجمہ اگر سادہ زبان میں کیا جائے تو مذکورہ دعوے کا مطلب' اِس کے سوا کچھ نہیں کہ امریکہ اپنے تصور کے مطابق عالمی نظام کے ایک ایسے کوتوال کی حیثیت رکھتا ہے' جو دُنیا کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی طرف نہیں بلکہ ''امریکی عالمی نظام'' (Pax Americana) کی طرف دھکیل رہا ہے۔اس مجوزہ نظام کا یہی وہ مفہوم ہے جو کھلے یا دبے لفظوں میں' دوست اور مخالف دونوں ہی لینے پر مجبور ہیں۔

یہ بات کہ مجوزہ نئے نظام کا اصل ہدف ایک ''امریکی نظام'' کا قیام ہے' محض کوئی مایوسی پر مبنی مفروضہ تصوراتی خاکہ (flight of imagination) نہیں ہے۔ ہوا کے رُخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اِس صدی کے اہم واقعات اور رجحانات پر نظر رکھی جائے' پھر حال اور مستقبل کی نقشہ بندی کو ماضی کے تناظر میں ٹھیک سمجھا جائے۔

برطانیہ کی عالمی بالادستی (Pax Britanica) کا عملی خاتمہ تو دوسری عالمی جنگ[8] [۳۹-۱۹۴۵ء] کے ذریعے ہوا۔ لیکن اس امکانی تبدیلی کا آغاز ۱۸۹۸ء میں ہی ہو گیا تھا' جب امریکہ نے ہسپانوی افواج کو شکست دی اور جنوبی امریکہ کو بلاشرکت غیرے امریکہ کے حلقۂ اثر (area of influence) کی گرفت میں لینا شروع کیا۔ اس طرح امریکہ علاقے کی بالاتر قوت اور دُنیا کی ایک امکانی قوت کی حیثیت سے میدان میں اُترا۔

۷- ٹائم' ۷جنوری ۱۹۹۰ء

۸- اس جنگ میں: برطانیہ' فرانس' [اشتراکی] روس' اور امریکہ کے اتحادیوں نے: جرمنی' جاپان اور اٹلی کو شکست دی۔

ادھر جرمنی اور جاپان اپنے اپنے علاقے میں اُبھر رہے تھے اور بالآخر پہلی عالمی جنگ[9] [۱۸-۱۹۱۴ء] کے ذریعے جرمنی نے برطانوی استعمار کے عالمی اقتدار کو چیلنج کر دیا۔ اتحادی قوتوں کے تعاون سے برطانیہ اور امریکہ نے پہلی جنگ تو جیت لی، لیکن برطانیہ کا عالمی طاقت کی حیثیت سے زوال شروع ہو گیا جو بالآخر دوسری عالمی جنگ میں اپنے فطری انجام کو پہنچا۔ جرمنی اور جاپان نے دو عشروں کے قلیل عرصے میں بالادست طاقتوں کو پھر چیلنج کیا۔ اس بار برطانیہ، امریکہ، روس اور فرانس نے مل کر ان نئے دعوے داروں کو قابو کیا۔

سرد جنگ کا خاتمہ

البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد نقشہ بالکل بدل گیا۔ جرمنی اور جاپان کو مکمل طور پر غیر مسلح کر دیا گیا۔ جاپان کو اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں ایک دشمن ملک قرار دیا گیا۔ برطانیہ ایک بوڑھے پہلوان کی طرح عالمی رول سے ریٹائر ہو گیا اور امریکہ اور اشتراکی روس نئی عالمی قوتوں کی حیثیت سے میدان میں رہ گئے۔ البتہ ۱۹۴۵ء میں جاپان پر ایٹم بم استعمال کر کے امریکہ نے برتری قائم کی۔ جب کہ روس نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک مشرقی یورپ کو اپنے کمیونسٹ حلقۂ اثر میں لا کر اور پھر ۱۹۴۹ء میں ایٹمی طاقت بن کر عالمی سیاسی شطرنج کی نئی بساط بچھا دی۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کے زمانے کے حلیف بہت جلد حریف بن گئے۔ یوں دُنیا دو عالمی طاقتوں کے درمیان تناؤ، کش مکش، مسابقت اور بالآخر سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی۔

عالمی رسّہ کشی کی اس نصف صدی میں امریکہ اور روس دونوں ہی دُنیا پر اپنی

۹- اس جنگ میں: برطانیہ، فرانس، [زارشاہی] روس اور امریکہ اتحادی تھے، جنھوں نے مل کر: جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور [عثمانی] ترکی کو شکست دی۔

بالادستی قائم کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ یہ کشمکش زندگی کے تقریباً ہر میدان میں ہوئی۔ نظریہ' سیاست' معیشت' عسکری قوت' سائنس اور ٹکنالوجی حتیٰ کہ ادب اور ثقافت' ہر میدان میں یہ جنگ لڑی گئی۔ دونوں عالمی طاقتوں نے اپنے اصل وسائل سے بڑھ کر بوجھ اُٹھایا۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبہ میں ترجیحات خلط ملط ہو گئیں۔

قومی دولت کا بڑا حصہ بلاواسطہ یا بالواسطہ جنگ کا سازوسامان تیار کرنے کی نذر ہونے لگا۔ ایک طرف جنگ کے آلات نے اتنی ترقی کی کہ دونوں بڑی طاقتوں نے صرف جوہری ہتھیاروں کے اتنے انبار لگا لیے کہ کسی ایک کا اسلحہ تمام دُنیا کو پچیس بار تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ ان دونوں کی عام آبادیوں کے لیے خوراک' رہایش اور علاج کی بنیادی سہولتیں کم سے کم ضروری حد سے بھی فروتر ہو گئیں۔ سرد جنگ کے اس دَور میں علاقائی جنگیں اور علامتی مقابلے (proxy wars) تو بہت سے ہوئے اور اِن میں لاکھوں بے گناہ انسان لقمۂ اجل بنے[10] اور عملاً خود جنگ اتنی تباہ کن چیز بن گئی کہ بالآخر سرد جنگ کا خاتمہ اندرونی اسباب کی بنا پر اشتراکی روس کے زوال سے ہوا۔ اس میں جہادِ افغانستان وہ آخری ضرب ثابت ہوا جس کے بعد اشتراکی روس سنبھل نہ سکا۔

سرد جنگ میں خارجہ تعلقات

سرد جنگ کے دور میں امریکی خارجہ پالیسی کی بنیادیں مندرجہ ذیل نکات پر مبنی رہیں:

۱- ایشیا اور یورپ پر روس کی بالادستی کے قیام کو روکنا اور اُسے اُن سرحدوں میں محدود

۱۰- سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے ان جنگوں کی تعداد ۱۲۰ اور ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۸ ملین یعنی ایک کروڑ اسی لاکھ بتائی ہے۔ Victory War 1999 لندن' ص ۱۲۱۔

کر دینا جہاں وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد قابض تھا۔ اس کی بنیاد عالمی سیاست کا وہ مشہور اصول ہے جسے تحدید کی حکمت عملی (strategy of containment) کہا جاتا ہے اور جس کا اصل مصنف امریکی سیاست کار جارج ایف کینن (George F. Kannen) تھا۔ اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے کے لیے روس کے گرد سیاسی' معاشی اور فوجی بلاکوں اور معاہدات کا ایک ایسا جال پھیلایا گیا' جس کے نتیجے میں وہ اپنی سرحدوں میں محصور ہو کر رہ جائے اور اُس کی پیش قدمی رک جائے۔

۲- امریکی عالمی سیاست کا دوسرا اصول مقابلے کی ایسی قوت کا حصول اور جنگ کو اتنا تباہ کن اور مہنگا بنا دینے کی حکمت عملی تھی' جس کے نتیجے میں جنگ ناممکن ہو جائے یا مخالف کی تباہی یقینی بنائی جا سکے۔

اسے سدِ جارحیت (deterrance) حکمت عملی کہتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فوجی قوت کو بے محابا ترقی دی گئی۔ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۷ء کے درمیان فوجی سازوسامان میں ۷۰۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ جوہری ہتھیاروں کے انبار لگا دیے گئے۔ بین البر اعظمی میزائل (Intercontinental Ballistic Missiles) تیار کیے گئے' ہوائی اور بحری قوت کو آخری حدوں تک ترقی دی گئی۔ یورپ اور ایشیا میں ایسے فوجی اڈے قائم کیے گئے' جن سے بہت کم وقت میں اور بڑی سُرعت کے ساتھ مخالف قوتوں پر حملہ کیا جا سکے۔ پھر اس امر کی مسلسل کاوش کی گئی کہ تحقیق اور تجربے کے ذریعے اسلحہ کے نظام میں تکنیکی فوقیت اور کمیت اور کیفیت ہر پہلو سے امریکی اسلحہ کی بالادستی قائم رہے۔ اس صلاحیت میں برتری کا مظاہرہ روس کے خلاف تو نہ ہو سکا' لیکن ۱۹۹۱ کے اوائل میں خلیج کی جنگ میں عراق کے روسی اسلحہ کے مقابلے میں امریکی اسلحہ نے اپنی فنی بالادستی کے کچھ مظاہرے دُنیا کو ضرور دکھا دیے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر معاہدہ یالٹا میں' جنگ کے بعد کی دُنیا کا جو نقشہ بنایا گیا تھا' وہ چند ہی برسوں میں درہم برہم ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء میں معاھدہ

شمالی اوقیانوس (NATO) کے قیام اور روس کے جوہری طاقت بن جانے سے سرد جنگ کا دور آ گیا۔

۱۹۸۹ء بھی ۱۹۴۵ء ہی کی طرح اہم سال ہے کہ اس سال افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی اور روس کے چنگل سے مشرقی یورپ کے نکلنے سے سرد جنگ کے دور کے اختتام کا اعلان ہوا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراق کی جارحیت ہوئی۔ اُس کے جواب میں امریکہ کی قیادت میں روس نے تعاون کیا' جس سے جنوری' فروری ۱۹۹۱ء کی خلیج کی جنگ نے نئے عالمی سیاسی دور کے خدوخال نمایاں کیے۔ پھر اگست ۱۹۹۱ء میں روس میں اشتراکیت کے چراغ کی آخری بھڑک نے حالات کی نئی کروٹ کو بالکل ہی نمایاں کر دیا۔[۱۱] ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک کے فیصلہ کن زمانے میں امریکہ نے اپنے تصور کے مطابق نئے عالمی نظام کا نقشہ بنایا ہے اور خلیج کی جنگ سے اس میں رنگ بھرا۔

نیو ورلڈ آرڈر کے اہداف

الفاظ جو بھی استعمال کیے جائیں حقیقت یہ ہے کہ اس نئے عالمی نظام کے خالقوں کے مطابق اس کے بنیادی خدوخال حسب ذیل ہیں:

۱- امریکہ دُنیا کی واحد عالمی قوت ہے۔ دُنیا کے تمام ملکوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ امریکہ سے اور خود آپس میں تعلقات استوار کرنے میں اسے بنیاد بنانا ہوگا۔

۲- روس میں اشتراکیت کی پسپائی اور روسی ایمپائر کا تتر بتر ہونا صرف اشتراکیت کی شکست ہی نہیں بلکہ مغربی لبرلزم' سرمایہ داری' جمہوری طرز حکومت اور منڈی کی

۱۱- اشتراکی روس کے آخری حکمران میخائل گورباچوف کی نرم پالیسیوں کے خلاف سرخ فوج اور کمیونسٹ پارٹی کے سخت گیر عناصر نے اگست ۱۹۹۱ء میں بغاوت کر دی۔ لیکن اشتراکیت سے بیزار عوام کی تائید نہ ملنے پر مذکورہ بغاوت اس طرح ختم ہوئی کہ اس ناکامی کے صرف چار ماہ بعد اشتراکی روس بکھر گیا۔

معیشت کے تصور کی فتح ہے۔ جس طرح امریکہ دُنیا کی واحد عالمی طاقت ہے اسی طرح مغربی لبرلزم اور سرمایہ داری اب دُنیا کا غالب سیاسی اور معاشی نظام بھی ہے۔ اس سلسلے میں امریکی حکومت کے ایک مشیر فرانسس فاکویاما کا دعویٰ ہے کہ اب ''تاریخ اپنی انتہا'' کو پہنچ گئی ہے اور مغربی نظام کو فیصلہ کن بالادستی حاصل ہوگئی ہے[12] اس میں امریکہ اپنی عالمی حیثیت قائم رکھے۔

۳۔ سرد جنگ کے دورِ تحدید (containment) کے مقابلے میں نئے نظام میں اجتماعی سلامتی (Collective Security) کا انتظام کیا جائے' جس کی قیادت امریکہ کرے گا۔ البتہ اس کو عالمی ادارہ اقوامِ متحدہ کی چھتری حاصل ہوگی۔ اجتماعی سلامتی کے اس نظام کے معنی یہ ہوں گے کہ جہاں کہیں سلامتی کے لیے کوئی خطرہ [یعنی صرف اسی کو خطرہ سمجھا جائے جسے امریکہ ''خطرہ'' قرار دے] رُونما ہو اُس کا تدارک کیا جائے۔

۴۔ دُنیا میں کہیں بھی اور خصوصاً یورپ' ایشیا اور افریقہ میں اب کسی ملک کو یہ موقع نہیں ملنا چاہیے کہ وہ ایک عالمی قوت کی حیثیت سے اُبھر سکے۔ علاقائی توازن کی بھی حفاظت

۱۲۔ فرانسس فوکویاما (Francis Fukuyame) کا مضمون ''The End of History'' امریکہ کے رسالے *The National Interest* کی ۱۹۸۹ء موسم گرما کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد موصوف کا دوسرا مضمون ستمبر ۱۹۸۹ء میں ہونو لولو کے *Sunday Star* میں ''Are We Witnessing the End of History?'' کے نام سے شائع ہوا۔ تیسرا مضمون مشہور امریکی رسالے *Fortune* (جنوری ۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا اور اس کا عنوان ''Are We at the End of History?'' تھا۔ ان مضامین کا مرکزی خیال یہ ہے کہ بیسویں صدی' جواب اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے' معاشی اور سیاسی لبرلزم کی ایسی فتح پر منتج ہوئی ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ نیز یہ کہ: ''ہم اب غالباً انسانیت کے نظریہ ارتقا کی آخری بلندیوں کا نظارہ کر رہے ہیں اور تاریخ کا یہ خزانہ عبارت ہے مغرب کی لبرل جمہوریت سے جو انسانیت لیے حکمرانی کا آخری نظام ہے''۔

کی جائے گی۔ جہاں کہیں علاقائی توازن کو خطرہ ہوگا یعنی علاقے میں جن قوتوں کو بالادستی حاصل ہے (جیسے شرق اوسط میں اسرائیل) ان کی حیثیت کو تبدیل ہونے سے بچایا جائے گا۔ شرق اوسط میں اسرائیل کا تحفظ اور پورے علاقے پر اُس کی بالادستی اس نئے نظام کا ایک لازمی حصہ ہے۔

۵- امریکہ کے عالمی مفادات کا تحفظ' جس میں سرفہرست تیل کی رسد' قیمت اور ماخذ پر کنٹرول ہے' خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ اس طرح امریکہ کے دُوسرے مفادات کی دیکھ بھال' جن میں عالمی منڈیوں تک امریکی مصنوعات کی رسائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۶- اسلحہ کی تیاری' تحقیق اور ترقی کے نظام پر کنٹرول جس کے نتیجے میں دُنیا میں ایسے دوسرے ممالک یا مراکز وجود میں نہ آ سکیں جو اسلحہ کے میدان میں امریکہ کی بالادستی کے لیے اب یا مستقبل میں خطرہ بن سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں امریکہ کو نہیں البتہ دوسرے ملکوں کو جوہری' کیمیاوی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے فروغ سے روکنا فوری اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس کام کو معاہدات اور عالمی نگرانی کے ذریعے انجام دیا جا سکے تو **فھو المراد**' لیکن اگر ضرورت پڑے تو قوت کا استعمال کر کے بھی اسلحہ کے اس پھیلاؤ کو روکنا مجوزہ عالمی نظام کے اہداف میں سے ایک ہے۔

۷- روس' جرمنی' جاپان' برطانیہ اور فرانس کو بڑی طاقت تو ماننا' البتہ انھیں عالمی طاقتوں کی حیثیت سے تسلیم نہ کرنا۔ اس امر کی کوشش کہ ان میں سے کوئی بھی ملک مستقبل میں عالمی طاقت نہ بن سکے۔ اس ضمن میں روس کو معاشی طور پر اپنے زیرِاثر لانا' جرمنی اور جاپان کی معاشی قوت اور مسابقت کی طاقت کو عالمی شراکت کے کسی نظام کے تابع کر کے حریف عالمی قوت بننے سے روکنا۔

نیو ورلڈ آرڈر کی ترجیحات

یہ وہ بنیادی اہداف ہیں جو امریکہ کے نئے عالمی نظام کے حدود اربعہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ انھی اہداف کے نتیجے کے طور پر عالمی سیاست میں امریکہ کی ترجیحات بدل چکی ہیں:

۱- روسی چیلنج کے خاتمے سے چونکہ اب افغانستان کی وہ پہلے جیسی اہمیت نہیں رہی' اس لیے پاکستان کی جیو اسٹرے ٹیجک اہمیت میں بھی فرق آیا۔ تاہم' جب کبھی ضرورت پڑی تو امریکہ ان دونوں ملکوں کے سابقہ تعلقات کی تاریخ دہرا کر ضرور مطلوبہ منافع حاصل کرے گا۔

۲- روس اب مخالف نہیں حلیف قوت ہے' اس لیے وسط ایشیا میں کسی ایسی قوت کا اُبھرنا جو روس کے لیے خطرہ بن سکتی ہو مغرب کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔

۳- اسرائیل کی بالادستی کے لیے ضروری ہے کہ فلسطین کے مسئلہ کو تحلیل کر دیا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہاں پر ''اسلامی بنیاد پرستوں'' کو قابو میں لایا جائے یا کچل دیا جائے۔ دوسری طرف اسرائیل کو اُس کے سارے ہمسایہ عرب ممالک سے کیمپ ڈیوڈ طرز کے معاہدات میں جوڑ دیا جائے۔ سب سے بڑھ کر ''کویت امریکہ دفاعی معاہدہ'' کے انداز پر علاقے کے دوسرے ممالک سے بھی دفاعی معاہدے کیے جائیں' تاکہ شرق اوسط میں امریکی افواج کے قیام' اسلحہ کے مستقل ذخیروں اور اڈوں کا یقینی بندوبست کیا جا سکے۔

۴- پوری دُنیا میں احیائے اسلام کی تحریکوں کی مخالفت کی جائے اور امریکہ مخالفت کی بنیاد پر اِن تحریکوں کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔

۵- بھارت کو جنوبی ایشیا میں ایک علاقائی قوت کی حیثیت سے تقویت دی جائے' تاکہ پاکستان' ایران' افغانستان اور خود عرب دُنیا کے تجارتی و فوجی اثرات کو محدود کیا جا سکے۔

۶- اسرائیل اور بھارت کے درمیان گرم جوشی پر مبنی تعلقات کو فروغ دیا جائے۔

نئی پالیسی کی یہ تمام شاخیں امریکی عالمی نظام (Pax Americana) کا لازمی حصہ ہیں۔ انھیں نظرانداز کر کے پاکستان اور عالم اسلام جو حکمت عملی بھی بنائے گا وہ خطرات سے پُر ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جو تجزیہ کیا گیا ہے یہ کوئی نظری تجزیہ نہیں بلکہ حقائق اور مغربی اقوام' خصوصیت سے امریکہ کے پالیسی سازوں کی سوچ کے دستاویزی ریکارڈ کا خلاصہ ہے۔ ہم اپنے دعوے کی تائید کے لیے صرف چند اہم حوالے پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمان پالیسی سازوں کو' حقائق جیسے کہ وہ ہیں' سمجھنے میں مدد ملے۔

سابق امریکی صدر جمی کارٹر [۱۹۷۷-۸۱ء] کے مشیر برائے قومی سلامتی پروفیسر زبگنیو بریزنسکی نے خلیج کی جنگ اور نئے عالمی نظام کا جائزہ لیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا ہے:

[شرق اوسط کے لیے] امریکہ کی فوجی چھتری ناگزیر ہوگی۔ بالآخر حالات جو بھی ہوں' اس علاقے میں امریکہ کی فوجی موجودگی مستقل نوعیت کی ہوگی۔ گمان غالب ہے کہ فوجوں کا مستقر کویت ہوگا یا سعودی عرب یا دونوں۔ آخر یہ دونوں ملک ہمارے حاشیہ نشین (client regime) ملک ہی تو ہیں۔ یہ بہت دولت مند ہی نہیں غیر محفوظ (vulnerable) بھی ہیں۔ فطری طور پر ان ملکوں کا سارا انحصار امریکہ پر ہے ___ حالات کا تقاضا ہے اور امریکہ کے لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ اس نظام کے قیام کے لیے جو منصفانہ ہو اور امن کا ضامن' زیادہ تیزی کے ساتھ متحرک ہو جائے۔[۱۳]

لندن آبزرور میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں بریزنسکی نے انھی

۱۳- زبگنیو بریزنسکی کا انٹرویو' مطبوعہ لاس اینجلز ٹائمز' The News' یکم مارچ ۱۹۹۱ء۔

باتوں کا اعادہ کیا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد' امریکی صدر ہیری ایس ٹرومین [۵۳-۱۹۴۵ء] نے یورپ کی تعمیر اور دُنیا میں اپنے سیاسی معاہدوں کے بارے میں' جس پر جوش تحرک کا مظاہرہ کیا تھا' امریکہ کو آج پھر اسی حکمت عملی پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے۔ بریزنسکی کا مشورہ ہے:

> آج اس پورے علاقے کی قسمت امریکہ کے ہاتھوں میں ہے' جسے اس سے پہلے کبھی اتنا اثر و رسوخ حاصل نہ تھا جو آج حاصل ہے۔ اب امریکہ کی ذمہ داری ہے کہ علاقے کے لوگوں کی مشکلات کے حل کے لیے اپنی ذمہ داریاں ادا کرے ___ جغرافیائی اور سیاسی حوالے ہی سے نہیں بلکہ خود اخلاقی اسباب سے بھی ضروری ہے کہ امریکہ جس سرگرمی کا مظاہرہ کرے (وہ ۱۹۴۵ء کے فوراً بعد والی سرگرمی سے) کم نہ ہو۔[۱۴]

امریکہ کے اسی خود ساختہ عالمی رول کے بارے میں ایک اور دانش ور ایلٹ اے کوہن نے لکھا ہے:

> آج یہ نہ صرف امریکہ کے قومی مفاد میں ہے بلکہ دوسرے ممالک کے مفاد میں بھی ہے کہ امریکہ شعوری طور پر طے کرے کہ اسے دُنیا کی مضبوط ترین عسکری قوت کی حیثیت سے باقی رہنا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل میں اس بالادستی کو اس سے کم وسائل (cost) کے صرف سے قائم رکھا جا سکتا ہے' جو سرد جنگ [۹۱-۱۹۴۹ء] کے زمانے میں کرنا پڑتے تھے۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ امریکی عوام کو اس قومی مفاد کے بارے میں مطمئن کرنا آسان نہیں' لیکن یہ امریکی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر ہم اُن کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو پھر اکیسویں صدی کے آغاز پر دُنیا ایسی

۱۴- The Observer لندن' ۲۱ اپریل ۱۹۹۱ء۔

پرسکون اور محفوظ جگہ نہ ہوگی جیسی ۱۹۹۰ء کے اس موسم خزاں میں ہے۔[۱۵]

لندن کے اخبار گارڈین میں مقالہ نگار ڈیوڈ مارکوانڈ رقم طراز ہے:

جدید تاریخ کی پہلی حقیقی جنگ (خلیج کی جنگ) جس کا طرۂ امتیاز اعلیٰ ٹکنالوجی کا استعمال تھا۔ اس میں امریکی افواج نہ صرف اعلیٰ فوجی کارکردگی میں ممتاز تھیں بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی (امریکہ) پوری جنگ پر چھایا ہوا تھا۔ امریکی قیادت میں جنگی اتحاد کے عرب ارکان امریکہ کے حاشیہ بردار تو تھے ہی، خود برطانیہ بھی امریکہ کے پرجوش سپاہی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ آغاز میں بغاوت کے سارے نازک لمحات کے باوجود فرانس بھی ہمراہی ثابت ہوا، خواہ اس کا جوش و جذبہ کچھ کم ہی کیوں نہ تھا۔ باقی یورپ اس کھیل سے تقریباً باہر رہا۔ روس ایک پالیسی پر ضرور گامزن تھا مگر یہ پالیسی بے حد کمزور اور غیر موثر تھی۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ سرد جنگ کے دور کا توازنِ قوت پارہ پارہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کسی نئے توازن نے نہیں لی ہے۔ بحالتِ موجودہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ جس نئے عالمی نظام کی دھوم ہے وہ صرف امریکی نظام (Pax American) ہی بنتا نظر آ رہا ہے۔[۱۶]

امریکہ کی وزارتِ دفاع کے ایک سابق افسر اور جارج ٹاؤن یونی ورسٹی میں پروفیسر ارل ریوی ٹال نے *Foreign Policy* میں اپنا تجزیہ بایں الفاظ پیش کیا ہے:

امریکہ اسٹرے ٹیجک خودمختاری کی راہ پر بڑے جارحانہ انداز میں گامزن ہو گیا ہے۔ خلیج فارس میں فوج بندی امریکہ کی اس پرعزم انفرادیت پسندی اور

15- Elwt A. Cohen "The Future of Fore and American Strategy" *The National Interest*, Feb 1990 p.15.

16- David Marquand "New World Order or Pax American" *Guardian* reproduced by *Dawn*, Karachi, 14 March 1991.

خودنمائی (unilateralism) کے آغاز کی علامت اور خود اس کے اس نئے مقام و مرتبہ کی مظہر ہے جو ''دُنیا کی واحد عالمی قوت'' کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ شاید اسی کا نام نظریہ بش (Bush Doctrine) ہے۔ لیکن اس کی نوعیت اور حقیقی مقاصد ابھی پردۂ اخفا میں ہیں۔ (جو کچھ نظر آ رہا ہے اس کی بنیاد پر) کہا جا سکتا ہے کہ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ اب امریکہ واحد عالمی قوت کی حیثیت سے' اپنی عسکری قوت کو برقرار رکھنے پر مجبور ہے' تاکہ اس کے ذریعے اپنے عالمی اثرات کو مستحکم رکھ سکے۔ اب امریکی حکمت عملی دوسرے علاقوں اور معاملات میں موثر مداخلت سے عبارت نظر آتی ہے۔ تاکہ اس مداخلت کے ذریعہ ان تنازعات کو امریکہ کے مفاد کے مطابق طے کرایا جا سکے۔ اس تناظر میں آیندہ امریکہ کے مفادات کی تعریف میں بھی خاصی وسعت برتی جائے گی۔[17]

ایک اور امریکی مبصر' جان اوسولیوان جو محض ایک تجزیہ نگار نہیں' بلکہ خود بھی اس پالیسی کا داعی ہے' امریکی مجلّہ نیشنل ریویو کے ایک مضمون میں امریکی حکمت عملی کے مختلف پہلو واضح کر کے اس طرح پردہ اٹھاتا ہے:

بلاشبہ امریکہ واحد عالمی طاقت ہوگا جو آزادانہ طور پر اور صرف اپنی مرضی سے فوجی مداخلت کا فیصلہ کرے گا خواہ اُس کا تعلق ایسی کولیشن ہی سے کیوں نہ ہو جو علاقے میں امن کو خطرات سے نمٹنے کے لیے کی جائے۔ البتہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ امریکی اقدامات کو اقوامِ متحدہ کی سرپرستی حاصل ہو' خواہ اس کے لیے عالمی ادارہ کو کچھ ضمنی اثر و نفوذ (influnece at the margin) کا

17- Earl C. Ravenal "The Case for Adjustment" *Foreign Policy*, Winter 1990-91, p.67.

حق دینا پڑے۔ صرف طاقت ہی سے طاقت کی کاٹ ممکن ہے' اور جب مداخلت کرنی ہی پڑ جائے تو پھر اس کو بہت تیز رفتار اور سفاکانہ ہونا چاہیے۔ اس اصول کے مطابق بروقت ایک زبردست گھونسا کافی ہوتا ہے۔ خلیج میں امریکہ نے اس پالیسی پر عمل کیا ہے۔ یہ غلبہ اور پھیلاؤ کے امریکی اسلوب کا پیش خیمہ ہے جس کی بنیاد امریکہ کی عسکری بالادستی پر ہوگی۔ جس میں اسے سابقہ بڑی طاقتوں مثلاً برطانیہ اور فرانس کی تائید حاصل ہوگی اور جس میں جرمنی اور جاپان جیسے ملکوں کا سرمایہ اس کام آئے گا۔

اس سے آگے بڑی صفائی اور بڑی ڈھٹائی سے جان ادسولیوان لکھتا ہے:

اس نظام میں امریکہ کی حیثیت وہی ہوگی جو قرونِ وسطیٰ کے فیوڈل معاشروں میں بادشاہ کی ہوتی تھی یعنی اصل حاکم اعلیٰ (sole sovereign) جسے قوت کے استعمال کے لیے مکمل اختیار حاصل ہوتا تھا۔ البتہ جو دوسروں سے خاصی تعداد میں سپاہی اور سرمایہ حاصل کرسکتا ہو اور اُن کے فراہم کرنے والوں کے خیالات و احساسات کا وہ کچھ پاس بھی کر لیتا ہو۔ رہا معاملہ پارلیمنٹ کا تو وہ اس سے اخلاقی تائید حاصل کرنے کے لیے نیم دلانہ معاملہ کرتا ہو اور جب چاہے اُسے نظر انداز کرسکتا ہو۔[۱۸]

اس تمثیل میں ''بادشاہ'' امریکہ ہے۔ ''فیوڈل معاشروں'' کی حیثیت کولیشن کے دوسرے ارکین کی ہے' جیسے برطانیہ' فرانس' جرمنی' جاپان' اور شرق اوسط کے ممالک اور ''پارلیمنٹ'' کا کردار اقوام متحدہ ادا کرتی نظر آ رہی ہے۔ یہ ہے امریکہ کے نئے نظام کا اصل چہرہ۔

18- *The News International*, Weekend Magazine, August 1991.

نیو ورلڈ آرڈر کا خاکہ

بس ایک پہلو کا ذکر اور ہو جائے اور وہ یہ کہ امریکی مفاد کو درپیش آنے والے خطرات کا تعلق صرف عسکری خطرات اور معاشی مفادات ہی سے نہیں' بلکہ اس میں دوسرے ملکوں کا آزاد رویہ بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ جس کی حیثیت ایک طرح سے بغاوت کی ہوگی۔

پھر اس ذیل میں ''مسلمانوں کی بنیاد پرستی'' بھی آتی ہے جو اس نظام کے علم برداروں کی نگاہ میں مغربی تہذیب و تمدن کی نعمتوں کو ٹھکرا کر ایک ''فرسودہ نظام'' کے احیا کی ''حماقت'' کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح جب بھی کوئی ملک جوہری توانائی کے میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے گا وہ باغی سمجھا جائے گا اور اس جرم میں گردن زدنی ہوگا۔[19]

امریکہ کے اس نئے نظام میں اسلام اور امت مسلمہ کا کیا مقام ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سابق صدر رچرڈ نکسن [۱۹۶۹-۷۴ء] نے ''گورباچوف- ریگن ملاقات'' (۱۹۸۵ء) کے موقع پر امریکی رسالے Foreign Affairs میں اپنے مضمون میں کہا تھا' روس اور امریکہ دونوں کو ''اسلامی بنیاد پرستی'' کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے تمام اختلافات کے باوجود باہم تعاون کرنا چاہیے۔ سابق صدر رونالڈ ریگن [۱۹۸۱-۸۹ء] اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

> اگرچہ اہل اسلام میں آپس کے بے شمار اختلافات ہیں' لیکن اسلامی بنیاد پسندی نے اسرائیل دشمنی میں انھیں اس طرح سے یک جہت کر رکھا ہے۔ جس میں وہ اپنے سارے اختلافات بھول کر نہ صرف عرب بلکہ غیر عرب حتیٰ کہ

۱۹- سولیوبان لکھتا ہے: ''جب بھی کوئی اسلامی ملک یا تیسری دنیا کا ملک جیسے عراق' پاکستان اور برازیل جوہری توانائی کی دوڑ میں شریک ہو جاتا ہے تو فطری طور پر امریکہ کی ناراضی مول لینے کا باعث ہوتا ہے''۔

ایران اور افغانستان کے باشندے بھی اسرائیل کی تباہی پر کمربستہ ہیں۔
اسلامی بنیاد پسندی، جو آزاد خیال سیکولر حکومت کی دشمن ہے، اسلامی نظام کی علم بردار ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ کے نام پر کشت و خون تک سے گریز نہیں کرتی۔ اس لیے کہ اسلامی بنیاد پسندی نے اپنے پیروکاروں کو یہ سکھا رکھا ہے کہ وہ مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اگر مارے گئے تو شہید ہوں گے اور باغ عدن کے سارے دروازے اُن پر کھلیں گے۔ انھی متعصب بنیاد پسندوں کے ہاتھوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، شرق اوسط میں اپنے دو عظیم وفادار اتحادیوں، شہنشاہِ ایران اور انور سادات سے محروم ہوا۔
اگر اسلامی بنیاد پسندوں کو عروج نصیب ہو گیا تو دُنیا صدیوں پرانی رجعت پسندی سے دوچار ہو جائے گی، بالخصوص اگر ایٹمی اور کیمیائی اسلحے ان مشتعل مزاج عناصر کے ہاتھ آ گئے اور اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرنا اُنھوں نے سیکھ لیا--- زندگی بھر میرا بہت ساری حقیقتوں پر ایمان رہا ہے لیکن اگر یہ جرم ہے تو میں فخر کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں: یہ میرا ایمان کہ امریکہ پر اسرائیل کی بقا کو یقینی بنانا ایک لازمی امر ہے۔[20]

اور اسرائیل کے دفاع کے لیے امریکہ کی حکمت عملی میں جس نئے عنصر کا اضافہ ہوا ہے وہ بھی ملحوظ رہے تو بہتر ہے۔ Foreign Policy کا ایڈیٹر چارلز ولیم بے نز، خلیج کی جنگ پر لکھتا ہے کہ اس جنگ کے اصل اسباب چار تھے یعنی امریکہ اور مغربی اقوام کے لیے تیل کے حصول کو محفوظ کرنا، عالمی نظام کا قیام، امریکہ کی سلامتی اور اسرائیل کا تحفظ۔ وہ لکھتا ہے:

امریکہ اور اسرائیل کے تعلقات اب نئی گہرائیوں سے آشنا ہو رہے ہیں۔ خلیج

20- Ronald Regan *An American Life,* Chapter 57.

کے اس بحران میں امریکہ اسرائیل کے مالی سرپرست (financier) سے بڑھ کر اب اسرائیل کا محافظ (protector) بن گیا ہے۔ تاریخ میں پہلی بار اسرائیل اس امر کا بچشم سر مشاہدہ کر رہا ہے کہ اس کے ایک دوست ملک کی افواج اس کے ایک بہت بڑے دشمن کو قابو میں کرنے اور اس کی عسکری صلاحیت کو ختم کرنے کا کام انجام دے رہی ہیں۔[21]

آخر میں ہارورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر سیموئیل پی ہنٹنگٹن کے مقالے کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے جو استعماری تصویر کو مکمل کرنے میں مدد دے گا:

رونما ہونے والی دُنیا کے لیے شاید سب سے بہتر عنوان Uni-Multipolar World ہے یعنی جس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ وہ واحد ملک ہے جسے سپر پاور کہا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ چھ ملک ایسے ہیں جنھیں بڑی طاقتیں کہنا مناسب ہوگا یعنی روس، جاپان، چین، جرمنی، برطانیہ اور فرانس۔

اس دُنیا میں امریکہ کے تین بڑے اسٹرے ٹیجک مفادات ہیں:

- ریاست ہائے متحدہ امریکہ سب سے بڑی عالمی طاقت کی حیثیت سے اپنی حیثیت کو باقی رکھے۔ اس کا یہ تقاضا ہے کہ آنے والے عشروں میں جاپان کے معاشی چیلنج کا بھی مقابلہ کیا جائے۔
- یورپ اور ایشیا میں کسی بالاتر سیاسی یا فوجی قوت کو نہ اُبھرنے دیا جائے، جو Hegemonic Power کی حامل ہو سکے۔
- تیسری دُنیا میں امریکہ کے حقیقی مفادات کا تحفظ اور اس میں اولیت خلیج فارس اور وسط امریکہ میں ریاست ہائے متحدہ کے مفادات کے تحفظ کو حاصل ہوگی۔[22]

21- Charles William Maynes `Dateline Washington: A Necessary War *Foreign Policy* No. 82 Spring 1991, p 176.

22- Samuel P. Huntington "American Changing Strategic Interests" *Survival*, London, Jan/Feb 1991 p.6 and p.8.

لمحہ فکریہ

یہ تو ہے نئے عالمی نظام کا وہ خاکہ جسے امریکہ اور اس کے حواری قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ خلیج کے سانحے کے سبھی کردار اس نظام کو حقیقت کا جامہ پہنانے میں اپنا اپنا رول ادا کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس نئے نظام کو روس کے زوال' خلیج کے بحران اور اسلامی احیا کے امکانی تناظر سے ہٹ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے اس نظام کے چند بنیادی خدوخال کو اُن کے حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ لیکن ابھی اس امر کی ضرورت ہے کہ تاریخی معروضیت کے ساتھ اس امر کا جائزہ بھی لیا جائے کہ اس نظام کے قائم ہونے کے کیا امکانات ہیں؟ کیا انسانیت کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اس نظام کے آگے سپر ڈال دے؟ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اگر یہ نظام قائم اور مستحکم ہو گیا تو انسانیت کے لیے اس کے کیا مضمرات ہوں گے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت کے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اُمت مسلمہ کی کیا ذمہ داری ہے؟ ☆

☆ ترجمان القرآن' اکتوبر ۱۹۹۱ء

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور عالم اسلام

دُنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے لیے ''نیو ورلڈ آرڈر'' (نیا عالمی نظام) جنم لینے سے پہلے ہی اپنی اپیل کھو چکا ہے۔☆ بیسویں صدی نے بہت سے رہنماؤں کو ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈرو ولسن [۲۱-۱۹۱۳ء] نے مستقبل کے عالمی نظام کے موضوع پر مباحثے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک ایسی دُنیا کا خواب دیکھا جس میں کچھ اصولوں اور تسلیم شدہ آفاقی قدروں کی حکمرانی کا تصور تھا۔ یہ خواب ''مجلس اقوام'' (لیگ آف نیشنز) کی ناقص ساخت اور اس کے فوری خاتمے کے ساتھ بکھر گیا۔ دُنیا نہ ایک نئی جنگ سے بچ سکی اور نہ جمہوریت ہی محفوظ رہی، بلکہ دُنیا ''دائیں'' اور ''بائیں'' بازو کی بھول بھلیوں کے نرغے میں گھر گئی۔

دوسری جنگ عظیم [۱۹۴۵ء] کے بعد ایک بار پھر نئی اُمیدیں پروان چڑھنے لگیں۔ اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نئے عہد کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔

☆ یہ مضمون امریکہ سے شائع ہونے والے Middle East Affairs Journal (شمارہ ۳، جلد ۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا، بعدازاں اس کا اُردو ترجمہ ''عالم اسلام اور عیسائیت'' [فروری ۱۹۹۳ء] انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں شائع ہوا۔

مگر بہت جلد یہ اُمیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور نسل انسانی تباہ کن سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی جو چار عشروں پر پھیلا ہوا ہے۔

حالیہ برسوں میں ''نئے عالمی نظام'' کی تلاش میں تیزی آئی۔ سرد جنگ کے مفروضہ اختتام پر سابق امریکی صدر جارج بش سینئر [۱۹۸۹-۹۳ء] نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ اگست ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملے اور جنوری ۱۹۹۱ء میں امریکہ کی سرکردگی میں لڑی گئی خلیجی جنگ کو نئے عالمی نظام کا ابتدائیہ قرار دیا گیا۔ یہ دعویٰ کیا گیا: ''مستقبل میں کوئی جارح اپنے کیے کی سزا پائے بغیر نہ رہے گا'' اور ''طاقت کے بل بوتے پر کسی کا قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا''۔ مزید کہا گیا: ''بین الاقوامی سرحدوں میں یک طرفہ طور پر ردوبدل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سب کو انسانی حقوق کی پابندی کرنا پڑے گی'' اور ''یہ امر بھی یقینی بنایا جائے گا کہ قومی سرحدوں کی پروا کیے بغیر انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا خاتمہ ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اقوام متحدہ دُنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک نیا کردار ادا کرے گی''۔ ان اصولوں کے تعین کے ساتھ یہ باور کرلیا گیا کہ اب نسل انسانی' جمہوریت اور سلامتی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔

ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ کسے اتفاق نہیں ہوگا؟ تاہم سوال یہ ہے کہ وہ قومیں جو آج کی دُنیا میں سیاسی لحاظ سے طاقت ور ہیں' کیا وہ ان مقاصد کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں یا وہ محض اپنے مخصوص سامراجی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ان نعروں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟ یہ انتہائی بنیادی اور اہم سوال ہے۔

مسلم دُنیا ــــــ کل اور آج

آج مسلمان دُنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ دُنیا بھر میں ان کی تعداد تقریباً ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے۔ ۵۳ سے زیادہ آزاد مسلم مملکتوں میں ۸۰ کروڑ سے زیادہ

مسلمان رہتے ہیں۔ یہ مسلم ریاستیں دُنیا کے ۲۳ فی صد رقبے پر محیط ہیں۔ اگرچہ مسلم آبادی مشرقی اور وسطی یورپ میں بھی ہے' تاہم البانیہ میں مسلمانوں کی تعداد ۷۰ فی صد ہے' جبکہ بوسنیا ہرزی گووینیا میں یہ قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ دُنیا کے دیگر حصوں میں بھی مسلمان بھاری تعداد میں آباد ہیں' بالخصوص یورپ اور امریکہ میں' جہاں اسلام' عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔

تاہم اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے بارے میں مغرب میں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک ایسا مذہب جو امن اور انصاف کا علم بردار ہے' اس مذہب کو جنگ اور جنونیت کے مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزار سال سے زائد کے عرصے میں مسلمان' دُنیا میں نہ صرف ایک غالب قوت رہے ہیں' بلکہ اسلامی تہذیب اور معاشرے نے غیر مسلموں سمیت سب کو امن اور تحفظ فراہم کیا۔ حقیقت میں یہ مسلم دُنیا ہی تھی جو ان تمام لوگوں کے لیے پناہ گاہ اور جائے امان رہی' جنھیں دُنیا کے مختلف حصوں' بالخصوص یورپ میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

مسلم ریاست اور معاشرے' جو بڑی حد تک اسلامی تہذیب کے مظہر تھے' اس کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ لکھتے ہیں:

> مشرق میں تھیا کریسی فکری لحاظ سے ظالم اور جابر نہیں تھی۔ ہم وہاں ابہام اور جمود' سوچ پر پابندی اور فکری اختلاف کے خلاف مسلسل جنگ کا وجود نہیں پاتے' جو یورپی دُنیا کی معروف خصوصیت ہے اور جسے یونان اور روم کی پشت پناہی حاصل تھی۔[1]

برطانوی مستشرق ولیم میور [Muir-م:۱۹۰۵ء] واضح الفاظ میں رقم طراز ہے:

> مفتوحین کے ساتھ [مسلمانوں کی] نرم روی' ان کا انصاف اور دیانت داری'

1- Robert Briffault *"The Making of Humanity"* p 113.

رومی حکمرانوں کے ظلم و تشدد اور عدم رواداری کے مقابلے میں ایک متضاد تصویر پیش کرتی ہے۔ شامی عیسائیوں کو عرب فاتحین کے تحت اس سے کہیں زیادہ شہری آزادی حاصل تھی، جتنی انھیں ہرکولیس کے اقتدار میں حاصل تھی، اور انھیں اپنی سابقہ حالت میں لوٹ جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔[2]

یہ ہے انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا ریکارڈ۔

گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں صورت حال میں ٹھوس تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس عرصے میں مغربی استعماری طاقتیں دُنیا پر حکمران رہی ہیں اور مسلم دُنیا بحیثیت مجموعی مغربی ملکوں کے زیر تسلط رہی ہے۔ اس دور میں تیسری دُنیا کی اقوام اور عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص استعماری طاقتوں کے ہاتھوں کئی انداز میں نقصان اٹھانا پڑا۔ معروف مورخ اور فلسفی پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی نے مغرب کے ساتھ دُنیا کے تعلقات پر بڑی خوب صورتی کے ساتھ ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

دُنیا اور مغرب کے درمیان تعلقات میں، جو گذشتہ چار پانچ سو سال سے چلے آ رہے ہیں، مغرب نہیں بلکہ دُنیا ہی اب تک وہ فریق ہے جسے ایک سخت تجربے سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مغرب نہیں، جس پر دُنیا کی ضرب پڑی ہے، بلکہ یہ دُنیا ہے جسے مغرب کی چوٹ برداشت کرنی پڑی ہے اور یہ چوٹ بہت سخت ہے۔ دُنیا کہے گی کہ مغرب عصرِ جدید کا سرکردہ جارح ہے۔ یقیناً مغرب کے بارے میں دُنیا کا یہ فیصلہ گذشتہ ساڑھے چار صدیوں کے عرصے کے حوالے سے، جو ۱۹۵۰ء میں ختم ہوا، بجا دکھائی دیتا ہے۔[3]

پروفیسر فلپ کے حتی ماضی قریب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں:

2- William Muir *"The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall"*, p 138.

3- Arnold J. Toynbee *"The World and The West"*, pp 1-4

بدقسمتی سے، بالخصوص گذشتہ ایک زمانے سے، مغرب کے اثرات سب طرف اچھے نہیں رہے۔ مغربی [مسیحی] مشنریوں، اساتذہ اور مبلغین کے انسانیت نواز نظریات اور یورپی و امریکی سیاست دانوں اور جنگ جوؤں کی طرف سے انسانی اقدار کی بے حرمتی کے واقعات کے درمیان ایک واضح تضاد دکھائی دیتا ہے۔ قول و فعل کے درمیان تضاد ہے اور اس عرصے میں اقتصادی اور قوم پرستانہ اقتدار پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ گذشتہ دو [عظیم] جنگوں میں ترقی یافتہ اقوام نے جس [انسانیت کش] طرز عمل کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مغرب کے انسان میں ان شیطانی قوتوں کو جو اس کی سائنس اور مشینوں نے تیار کی ہیں، اور جو اس وقت دُنیا کی تباہی کا باعث بن چکی ہیں۔ ان ہلاکت خیز مشینوں کو استعمال کرنے کی صلاحیت، اور پھر شرق اوسط کے حوالے سے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیگر اقوام کا مسئلہ فلسطین کے بارے میں طرزعمل، یہ وہ باتیں ہیں جنھوں نے مشرق قریب کے اس انسان کو مایوس کرنے میں حصہ لیا ہے، جو مغرب کے ساتھ تعلق استوار کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ مغرب کے ان اقدامات سے مشرق کا انسان، اس سے برگشتہ ہوا ہے۔ اس کا مغربی انسان کے کردار اور اس کے اخلاق سے، چاہے وہ نجی ہوں یا معاشرتی، اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔[4]

ستم ظریفی یہ ہے کہ: وہ مسلم دُنیا جو ماضی میں مغرب کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکی ہے، اور جو ابھی تک مادی، اقتصادی، تکنیکی اور فوجی لحاظ سے کمزور ہے، اسے مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اپنے تشخص کی بازیافت کے لیے مسلمانوں کی کوششوں اور اُن کی طرف سے

4- Phillip K. Hitte *"Islam in the Modern World"*

اپنے معاملات کو درست کرنے کی مساعی کو مغرب کے لیے ایک چیلنج بتایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاں جمہوری عمل کی تقویت اور خودانحصاری کے حصول کے لیے جو بے ضرر سی کوششیں کر رہے ہیں' انھیں ''اسلامی بنیاد پرستی'' (Islamic Fundamentalism) کے خود ساختہ دیو کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امریکہ کے سابق صدور جیسے رچرڈ نکسن [۱۹۶۹-۷۴ء] کی Seize The Moment اور رونالڈ ریگن [۱۹۸۱-۸۹ء] کی کتاب An American Life سے لے کر فرانسس فوکویاما (The End of History and the Last Man) جیسے دانش وروں نے اور رچرڈ نفف جیسے کالم نگاروں اور دوسرے بہت سے مغربی دانش ور اسلام کو مغرب کے لیے ایک خطرے کے طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ وہ سب یہی ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں: ''اگر کوئی بھوت یورپ اور امریکہ کا پیچھا کر رہا ہے تو وہ اسلامی بنیاد پرستی کا بھوت ہے''۔ یہ ایک غیر حقیقی اور یک طرفہ جنگ ہے اور سیاست دان' صحافی اور ذرائع ابلاغ کے لوگ' حتیٰ کہ بعض اہل تحقیق بھی ایسا خوف سے بھرپور منظرنامہ اُبھارنے میں فریق بن چکے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر سچائی سے بعید کوئی اور بات نہیں ہوسکتی۔

یہ بجا ہے کہ اس وقت دُنیا بھر میں اسلامی احیاء کی تحریک جاری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اپنے ملکوں میں یا ان سے باہر کسی کے خلاف کوئی جارحانہ عزائم نہیں ہیں۔ استعماری تسلط کے دوران مسلمانوں نے نظریاتی' اقتصادی' سیاسی' ثقافتی حتیٰ کہ اخلاقی لحاظ سے نقصان اٹھایا ہے۔ تاہم مسلم ریاستوں کی آزادی کے بعد سیاسی لحاظ سے انھوں نے کچھ پیش رفت کی ہے۔

اس وقت ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان' اقتدار اور تاریخ کی روشنی میں اقتصادی' تکنیکی' تعلیمی' نظریاتی اور ثقافتی پہلوؤں سے اپنی زندگیوں کو استوار کرسکیں۔ وہ الگ تھلگ ہوکر رہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر رہنا

چاہتے ہیں، لیکن وہ دوسروں کے ''باج گزار'' اور تابع مہمل بن کر نہیں، انسانی حلقے کے باوقار رکن کی حیثیت سے عزت اور احترام کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔

بنیاد پرستی کا ہوّا

''بنیاد پرستی'' واضح طور پر عیسائی مذہب کا ایک مظہر ہے۔ اس کا اسلامی فکر و عمل میں مطلق کوئی مقام نہیں ہے۔

ماضی قریب کی مغربی تاریخ میں یہ اصطلاح امریکہ کے ان انجیلی لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے جو بائبل کی لفظی تعبیر کے علم بردار اور کنواری مریمؑ کے بطن سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت پر ایمان رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں نہ صرف ذاتی سیرت و کردار مسیحی اخلاقیات پر مبنی ہونا چاہیے، بلکہ سماجی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی مسیحی اخلاقیات ہے۔ انھوں نے مغربی زندگی اور ثقافت کے بعض پہلوؤں پر کڑی نکتہ چینی کی اور انھیں مسیحی اخلاقیات سے کھلا انحراف قرار دیا۔ ان گروہوں کو مخالفین نے انتہا پسند اور جنونی قرار دیا، اس لیے ان کے لیے ''بنیاد پرست'' کی اصطلاح منفی معنوں میں استعمال کی جانے لگی۔

چنانچہ اس واضح مسیحی اصطلاح کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا نہ صرف غلط اور بدنیتی پر مبنی ہے، بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی قابل نفرین ہے۔ اسلام میں روحانی اور مادی زندگی کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ روحانی اور دینی زندگی ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ اسلام میں سیاست اور مذہب میں اس قسم کی کوئی مغائرت نہیں، جیسی عیسائی دُنیا میں موجود ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتا ہے۔ پورے قرآن پر ایمان ضروری ہے اور اس میں سے کچھ لینے اور کچھ چھوڑنے کی قطعاً گنجایش نہیں۔

مغرب کے دوہرے معیار

اِکا دکا انسانی ناکامیوں کے باوجود تاریخ میں رواداری کے حوالے سے اسلام کا ریکارڈ نہایت شان دار ہے۔

اسلام اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے پیروکاروں کو انتہاپسندی سے احتراز کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام رواداری اور دوسروں کے جذبات کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ معاصر مسلمان تشدد اور دہشت گردی کی مخالفت میں کسی بھی مہذب شخص سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو ان دوہرے معیارات پر حیرت ہے' جن کا مظاہرہ مغربی دُنیا کی قیادتوں نے کیا ہے۔

اگر کویت کے معاملے میں عراق کا غیر قانونی اور یک طرفہ قبضہ [اگست ۱۹۹۰ء] ایک جرم تھا' تو فلسطین پر اسرائیلی' کشمیر پر بھارتی اور بوسنیا پر سربیا کے قبضے کو بھی ویسا ہی جرم قرار دیا جانا چاہیے۔ اگر بعض مسلمانوں کے تشدد کی مذمت کی جاتی ہے تو ارض فلسطین میں اسرائیلی شہریوں اور قابض فوجوں کے کہیں زیادہ مظالم کی مذمت کیوں نہیں ہوتی؟ یہی صورت حال بھارت کے مسلم کش فسادات اور کشمیر میں بھارتی مظالم کی ہے۔

جابر حکمرانوں کے ستائے ہوئے افراد کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے کہیں زیادہ گھناؤنا جرم کسی ریاست کی طرف سے تشدد پر اتر آنا ہے۔ مستبد طرزِ حکومت برا ہے' لیکن یہ ہر کہیں برا ہونا چاہیے۔ ایسا کیوں ہے کہ دُنیا کے کچھ حصوں میں مستبد حکومتوں کی حمایت کی جاتی ہے اور کچھ دوسرے حصوں میں ان کی مذمت! کیا پسند کے ظالم اور پسند کے مظلوم کا یہ فلسفہ منافقت نہیں ہے؟

ہرچند کہ جمہوری عمل پسندیدہ ہے' لیکن اسے ہر کہیں پسندیدہ ہونا چاہیے۔ مصر' الجزائر اور انڈونیشیا وغیرہ کے عوام برابر کا حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی حکومتیں منتخب کر سکیں۔ جب ان مسلم ملکوں میں' جن کے حکمران عالمی طاقتوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں' آزاد انتخابات سبوتاژ کر دیے جاتے ہیں تو مغرب کے بہت سے رہنماؤں کے ضمیر

کوئی خلش محسوس نہیں کرتے۔

جب ترک قبرصیوں کو ہر طرح کے تعصب کا نشانہ بنایا گیا' ان کے حقوق سلب کر لیے گئے' انھیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا' حتیٰ کہ ان کا وجود ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مغرب ٹس سے مس نہ ہوا۔ حد یہ ہے کہ قبرص میں ضامن طاقت کا کردار رکھنے والی برطانوی حکومت' جس کا قبرص میں فوجی اڈہ تھا' خاموش تماشائی بنی رہی۔ یونانی قبرصیوں کو موقع فراہم کیا گیا کہ وہ حتمی بغاوت برپا کریں۔ لیکن جب ترکی نے دوسری ضامن طاقت کے طور پر اپنا حق استعمال کیا تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ لیبیا کو بھی اسی طرح کی یک طرفہ مداخلت' بین الاقوامی پابندیوں اور بلیک میل کے لیے نشانہ بنایا گیا۔ پھر بوسنیا ہرزی گووینیا میں جو کچھ ہوا ہے' وہ اس کی ایک اور واضح مثال ہے۔

مغربی طاقتیں' جارح فریق کو یہ پیغام دینے میں ناکام رہی ہیں کہ جارحیت کی کوئی سزا ہے۔ اس کے بجائے تمام اشارے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا مغربی دُنیا' نیٹو اور امریکہ جیسی عالمی طاقت' اپنی تمام تر عسکری قوت کے باوجود سربیائی جارحین کے سامنے بے بس ہے' جنھیں اس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو مظالم چاہیں توڑتے رہیں' جس قدر زمین وہ چاہتے ہیں اس پر قبضہ کریں' جتنے لوگوں کو چاہیں قتل کریں اور جتنے رقبے کو چاہیں مخالفین کے وجود سے ''پاک'' کر دیں۔

وہ جو بین الاقوامی قانون' امن اور سلامتی کے علم بردار ہیں' طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ ٹوٹے ہوئے معاہدوں اور مظلوم اور بے بس مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر پر اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں کہ جارح اپنا کام ختم کر لے' اور پھر یہ حرکت میں آئیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے جارح اور مظلوم کے درمیان ایک معاہدہ کرا دیں' تاکہ جارح نے جو کچھ طاقت کے اندھے استعمال سے حاصل کیا ہے اسے سندِ جواز حاصل ہو جائے۔ جب مظلوم بوسنیائی مسلمان اپنے دفاع کے لیے امداد اور ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں' تو ان کے راستے میں اقوام

متحدہ کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں۔[5] اگر اتفاق سے کچھ ہمدرد "مہذب" رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو انھیں "جنونی اور بنیاد پرست" قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلم احیاء اور اس کی رفتار کو "جنونیت" اور "بنیاد پرستی" کہہ دینے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوگا، صرف مسلم عوام کی نظروں میں مغربی قیادت کا اعتماد ہی مجروح ہوگا۔

مسلمانوں سے خطرہ؟

مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس قسم کے کوئی آثار بھی نہیں، بلکہ اس بات کا دُور دُور تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مسلح ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں یا وہ مغرب کے سیاسی نظام کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن جائیں۔ مسلمان تو محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اقدار اور تصورات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں سنوارنے کا حق چاہتے ہیں۔

اسلامی احیاء کی تحریکیں عصری و سائنسی تقاضوں کی افادیت اور جدید کاری (modernization) سے الرجک نہیں ہیں۔ وہ جدید کاری اور مادی ترقی کی حامی ہیں، لیکن یہ جدت اور ترقی وہ اپنی ثقافت اور اقدار کے تناظر میں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتیں کہ ایک روشن تہذیب اور ثقافت کی حامل قوم پر کھلم کھلا یا ڈھکے چھپے ہتھکنڈوں سے مغربی تہذیب اور اس کی اقدار عیارانہ طور پر مسلط کر دی جائیں۔

اقتصادی یا ثقافتی استعمار بھی اتنا ہی بُرا اور تباہ کن ہے جتنا کہ سیاسی استعمار۔ دُنیا

۵- دیکھیے: عبداللہ اساچ "یوگوسلاویہ کا خاتمہ اور بوسنیا کے مسلمان" (ترجمہ اشفاق حسین) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

زندگی بسر کرنے کے لیے صرف اسی صورت میں محفوظ جگہ بن سکتی ہے' جب تمام قومیں اور عوام یہ اصول تسلیم کرلیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا مستقبل' اپنے نظریات اور اصولوں کے مطابق تشکیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ خیالات پر آزادانہ مکالمہ ہونا چاہیے' مگر کسی خاص مجموعہ اقدار' ثقافت یا نظام کو دوسروں پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ زندگی کی بوقلمونی اور ثقافتی ونظریاتی تنوع کو حقیقی اور جائز تسلیم کرنے سے ہی مختلف اقوام اور عوام ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کی فضا میں رہ سکتے ہیں۔

مسلم عوام کسی خاص ملک کی' چاہے وہ اقتصادی یا فوجی لحاظ سے کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو' بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ اس دُنیا میں چھوٹی قومیں اور کمزور ممالک بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہیں۔ امریکی بالادستی (Pax-Americana) بھی اتنی ہی گھناؤنی چیز ہے' جتنی کہ برطانوی بالادستی (Pax-Britainica) یا ہسپانوی بالادستی بُری قرار دی جاتی تھی۔ یک قطبی (uni-polar) دُنیا یا ایک عالمی طاقت کی باتیں نئے خوف اور خدشات کو جنم دے رہی ہیں۔ جس میں ایک نیا استعماری نظام اُبھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی منصفانہ عالمی نظام کسی ایک کی بالادستی پر مبنی کارروائیوں کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔

مسلم عوام اور تیسری دُنیا کی اقوام' اس نئی بالادستی کو کبھی بھی قبول نہ کریں گی۔ چھوٹی اور بڑی' غریب اور امیر' کمزور اور طاقت ور سب اقوام کو جینے اور اپنی اقدار اور معیارات کے مطابق زندہ رہنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ سب کو پھولنے پھلنے کے برابر کے مواقع ملنے چاہییں۔ کسی کی طرف سے دوسروں پر اپنی بالادستی کا تسلط ہی بین الاقوامی کشیدگی اور تصادم کی جڑ ہے۔ اگر مغرب انسانیت کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی جانب پیش رفت میں مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے' تو اسے ذرا زیادہ خود احتسابی سے بھی کام لینا چاہیے۔

اسلام اور جمہوریت

یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ''اسلام جمہوریت کے خلاف ہے''۔ اس مفروضے کی بنیاد سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔

جمہوریت' فلسفیانہ سطح پر' انسان کی حاکمیت اعلیٰ کا اصول تسلیم کرتی ہے' نیز ابدی اور حتمی مذہبی یا اخلاقی قدروں سے انکار کرتی ہے۔ جمہوریت کا یہ فلسفیانہ تصور دُنیا اور معاشرے کے سلسلے میں اسلامی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو الٰہی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مسلمان کہا ہی اس شخص کو جاتا ہے جو الٰہی قانون کو اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ اسلام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی وجود نہیں' غلط فہمی یا دانستہ مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔

اسلام نے انسانی نیابت (خلافت) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ خلافت بحیثیت مجموعی عوام کو حاصل ہے' یہ کسی ایک گروہ یا طبقے یا خاندان تک محدود نہیں۔ الٰہی قانون اس کے لیے دائرہ کار فراہم کرتا ہے۔ اس نظامِ قانون میں لچک اور تبدیلی کی وسیع گنجایش ہے' جو ''مباح'' کے ذیل میں آتی ہے۔ کتاب اللہ کی تشریح و تعبیر کا حق ہر اس شخص کے لیے ہے جو علم رکھتا ہے اور جس میں اس کی تفہیم و تعبیر کی صلاحیت ہے۔ اسلام کے قانونی نظام کے دائرہ کار میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔

اسلام میں حکمرانی کا اختیار کسی کو اس کے مذہبی منصب کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔ معاشرے کے تمام افراد کا نہ صرف یہ حق' بلکہ فرض ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور ان افراد کے حوالے کریں جن پر انھیں اعتماد ہے۔ سیاسی قیادت' عوام اور خدا کے سامنے براہِ راست جواب دہ ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کی حکمرانی ہے اور اس میں اقلیتوں سمیت معاشرے کے تمام ارکان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا اصول موجود ہے۔ حکومت کے جواب دہ ہونے کا تصور اسلامی نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح

قیادت کا عوام کی مرضی سے انتخاب اور اس کی برخواستگی مسلمہ اصول ہے' اور یہی بات اختلاف رائے اور عدم اتفاق کے سلسلے میں درست ہے۔

عملی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام ان اصولوں پر مبنی ہے اور اس طرح جمہوری عمل کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں جن مقاصد کے حصول کا خواہش مند ہے' انھیں مسلم دُنیا کی بعض حکومتوں کے طور طریقوں کے ساتھ گڈمڈ نہ کیا جانا چاہیے' چاہے وہ اسلام کا نام ہی کیوں نہ استعمال کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ معاصر دُنیا میں جمہوریت کی ناگوار صورت حال کے قریب قریب ہے۔ بہت سے جمہوریت کے دعوے دار حقیقت میں جمہوری اصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے۔ اس انحراف کو جمہوریت کی ناکامی پر محمول نہ کیا جانا چاہیے' بلکہ اسے محض کچھ لوگوں یا ملکوں کا انحراف خیال کرنا چاہیے۔

اگر اسلامی جمہوری نظام کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسے الٰہی تعلیمات پر مبنی جمہوری نظام سمجھا جانا چاہیے--- یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں سرکردہ مسلم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) نے اسلام کے سیاسی نظام کو ''الٰہی جمہوری'' (Theo-democratic) قرار دیا ہے۔ اسلام میں تھیاکریسی کی کوئی گنجایش نہیں [۶] کیونکہ تھیوکریسی میں ایک مخصوص مذہبی گروہ کو مذہبی قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہی گروہ سیاسی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔ اسلام ایسے کسی بھی مذہبی انتظام کی حمایت نہیں کرتا۔

اس کے برعکس اسلام قانون کی حکمرانی اور قانون کی نظر میں سب کے مساوی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ جواب دہی کے اصول اور عوام کی مرضی سے حکومت کی تبدیلی اور تشکیل کا علم بردار ہے۔ آج مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر تشویش ہے کہ ایک

۶- سید ابوالاعلیٰ مودودی ''اسلامی ریاست'' (مرتب: خورشید احمد) اسلامک پبلی کیشنز' لاہور

طرف اسلام کو جمہوریت مخالف نظریے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے' اور دوسری طرف جمہوری عمل سے اُبھرنے والی اسلامی قوتوں کو اپنے ہی ملکوں میں برسراقتدار آنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے' جیسا کہ حال ہی میں الجزائر میں ہوا ہے۔ اسلامی جمہوری قوتوں کا راستہ روکنے والوں کو مغرب کی پوری تائید حاصل ہے۔

اسلامی احیا اور نیو ورلڈ آرڈر

آج کے مسلم ذہن کو سمجھنے کے لیے اسلامی احیا کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ مسلمان محض ایک نئے عالمی نظام کے نہیں' بلکہ ایک نئے منصفانہ عالمی نظام کے وجود میں آنے کے شدت سے منتظر ہیں' جس میں کسی ایک ملک کی بالادستی مقصود نہ ہو۔ اسلامی احیاء نہ صرف منفرد شان کا حامل ہے بلکہ عالمگیر بھی ہے۔ اسلام میں تنوع کے ساتھ وحدت ہے' اور یہ تنوع انفرادیت کو مجروح نہیں کرتا۔ اسلام ایک عالم گیر دین ہے۔ اس میں ''عرب اسلام''، ''پاکستانی اسلام''، ''ایرانی اسلام'' یا ''ترک اسلام'' نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی عالم گیریت میں وحدت ہے' یکسانیت نہیں۔

اسلام میں بعض نمایاں پہلو ہیں' جو ہر جگہ مشترک ہیں۔ لیکن اس سے اسلامی تحریک احیا کی زرخیزی متاثر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر عربی' قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کی زبان ہے' لیکن یہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اگرچہ ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ عربی زبان سیکھتا ہے لیکن دیگر زبانیں بولنا اور انھیں ایسے تصورات کو پروان چڑھانے کے لیے' جو اسلامی روایات سے مطابقت رکھتے ہوں' بطور آلہ استعمال کرنا کچھ کم اسلامی نہیں ہے۔

مسلمان اپنا احتساب خود کرتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی کے سطحی مظاہر کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور قرآن وسنت میں بیان کردہ بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس عمل میں ان علامات مثلاً بعض مخصوص رسوم یا فقہی ضوابط کی بعض تفاصیل وغیرہ سے بے پرواہی بھی شامل ہو سکتی ہے' جو مذہبی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔

حالیہ تحریک احیائے اسلام کی بنیادی روح یہی ''اصل کی جانب رجوع'' ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع ایک حریت بخش قوت ہے۔ اسلام میں اس سے ایک متحرک عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع ''بنیاد پرستی'' کو جنم نہیں دیتا' جو انسان کو وقت کے ساتھ چلنے نہیں دیتی۔ بلکہ یہ عمل زاویۂ نظر کی تازگی' ایک نئی لگن' نیا تحرک اور نئی لچک دیتا ہے' نیز نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی اپنے اندر اہلیت رکھتا ہے۔ لوگ اسلام کو تہذیب اور ثقافت کے ماخذ کے طور پر دوبارہ دریافت کر رہے ہیں۔ اس دریافت کو معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔

میری رائے میں' جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں مغرب کی غلامانہ نقالی سے دُوری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں' اس میں فرق آتا جا رہا ہے۔ مغربی تجربے سے ہم متعدد طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' مگر ہم غیر ملکی ثقافتوں کو اپنے ہاں مسلط کرنے کے لیے بطور آلہ کار استعمال ہونے کو تیار نہیں۔

بلاشبہ تمام مسلم ممالک کا مغربی ثقافت کی جانب رویہ یکساں نہیں ہے۔ وہ ملک جو کچھ عرصہ پہلے مغربیت پرستی کے ہراول دستے میں شامل تھے' وہ اب اسلامی احیاء کے علم بردار ہیں۔ جبکہ ایسے ممالک جو دُنیا سے کافی پیچھے دکھائی دیتے تھے' اور اپنی روایات کے ساتھ سختی سے چمٹے ہوئے تھے' اب مغربی طرز زندگی اور ثقافت کے دلدادہ ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ''کیا مسلم ممالک ترقی اور ٹکنالوجی کے معاملات کو مسترد کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں' جو ان کی علاقائی خوش حالی اور ان کے انسانی وسائل کی ترقی کی بنیاد ہیں؟''

یہ سوال اس مسئلے پر پائے جانے والے اُلجھاؤ کا ایک جامع خلاصہ ہے۔ ترقی اور ٹکنالوجی سے کسے انکار ہے' لیکن حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ کس قسم کی ترقی' اور کن مقاصد

کے لیے؟ کیا یہ محض اقتصادی ترقی ہوگی یا مجموعی انسانی ترقی ہوگی جس میں اقتصادی' سماجی' اخلاقی اور نظریاتی پہلو شامل ہوں گے' اور یہ ترقی منصفانہ سماجی نظام کے قیام پر منتج ہوگی؟ کیا ہر ایک ریاست کے تناظر میں ترقی کا تصور مختلف ہے یا واقعی اُمت مسلمہ کی ترقی مقصود ہے؟ کیا اس کا مطلب مسلم قومی ریاستوں کو ختم کرنا ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ریاستیں اُمت مسلمہ کے لیے ایک نئے مستقبل کی تشکیل پر توجہ دیں؟

ہم ماضی قریب کے اپنے پیش رووں کے مقابلے میں زیادہ تعمیری انداز میں پیش رفت ضرور کرنا چاہتے ہیں۔ ہم قومی ریاست [نیشن سٹیٹ] کو ایک نکتۂ آغاز کے طور پر قبول کر سکتے ہیں' اگرچہ علاقائی یا لسانی ''قومی ریاست'' مسلم نقطۂ نظر سے مثالی ریاست نہیں ہے۔ تاہم موجودہ زمانے میں حقیقت یہی ہے۔ جس میں ہم سیاسی نظاموں کو فی الفور ختم نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اُمت مسلمہ میں اتحاد' قریبی تعاون اور مختلف مسلم ریاستوں میں یک جہتی کے احساس کو مزید پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ اسلامی عینیت کے حوالے سے ہر قومی ریاست بتدریج ایک نظریاتی ریاست بن جائے گی' اور ان کا اتحاد بالآخر اسلامی دولت مشترکہ پر منتج ہوگا۔

مغرب کا ناقص فہم

اسلامی تحریک کی طاقت کیا ہے اور یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟

مغرب اسے سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ مغرب نے اسے ''بنیاد پرست' جنونی' مغرب مخالف' بے وقعت'' اور نہ جانے کیا کیا بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ رویہ ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے میں ممد و معاون نہیں ہو سکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ مغرب ایک بار پھر یہ خطرناک غلطی کر رہا ہے کہ وہ ایک مختلف طرز زندگی رکھنے والوں کو اپنے مخصوص معیارات اور مسخ شدہ تصورات کے آئینے میں دیکھ رہا ہے۔

اس افسوس ناک نقطۂ نظر کے نتیجے میں انسانیت پر بے پناہ مظالم توڑے جا رہے

ہیں۔ اسی طرح مغرب کے عوام اور پالیسی سازوں کو اسلامی احیاء کی حقیقی نوعیت کے بارے میں غلط معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ انھیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کے ایک ناخوشگوار باب کی روشنی میں ان معاملات کو دیکھیں۔

تحریک احیائے اسلام مستقبل کی جانب دیکھنے والی ایک تحریک ہے اور عیسائی گروہوں کی بنیاد پرستانہ سوچ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے جدیدکاری (ماڈرنائزیشن) سے وابستہ مسائل اور ٹیکنالوجی کے چیلنجوں سے آگاہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اسلام کے اصل ماخذوں، یعنی قرآن اور سنت پر اس کا زور دینا اور اس کے ساتھ روح عصر کو سمجھ کر راستہ بنانا اس کی لچک کا مظہر ہے۔ اس میں اختراع (innovation) کی صلاحیت ہے، کیوں کہ احیائے اسلام کی تحریک میں قدامت پرستی کا رویہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص فقہی مسلک سے ہی منسلک رہا جائے۔ یہ تمام امکانات ان تجزیہ نگاروں کی طرف سے نظرانداز کر دیے جاتے ہیں، جو موجودہ اسلامی دُنیا کو ایسے منطقوں (categories) کی صورت میں دیکھتے ہیں جو اسلامی دُنیا سے متعلق ہی نہیں۔

موجودہ مسلم ذہن کو اس وقت تک صحیح معنوں میں نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک ہمیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ موجودہ پریشان کن صورت حال کے بارے میں مسلمانوں کا ادراک، محض سیاسی بے چینی سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اسلامی احیاء کو سمجھنے کی کوششیں اکثر سطحی اور متعصبانہ ہیں۔ یہ نظریہ کہ اسلامی احیاء بالخصوص ایران کا تجربہ، محض تیزرفتار ترقیاتی کوششوں کا نتیجہ ہے، نہایت ہی سادہ توجیہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترقیاتی پہلو کے اپنے مسائل ہیں، لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مسلم عوام کا اسلامی احیاء کی قوتوں کی طرف رجوع، تیزرفتار اقتصادی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں پیدا شدہ عناصر سے ظہور میں آیا ہے۔ یہ تشخیص، مسلم معاشرے کے جذبوں کے بارے میں لاعلمی پر مبنی ہے۔

اسی طرح اسلامی احیاء کو محض مغربی استعمار کے خلاف عوام کا غم و غصے سے بھرپور

''حاسدانہ ردعمل'' قرار دینا بھی گمراہ کن نتیجہ ہے۔ استعمار کے خلاف ردعمل میں کوئی شک نہیں ہے' تاہم یہ ردعمل سیاسی طیش کے اظہار سے کہیں زیادہ گہرائی رکھتا ہے۔ اس کی ایک زیادہ گہری وجہ ان تصورات' اقدار' حکومت کے نظام اور اداروں پر عدم اطمینان ہے' جو مغرب سے درآمد کر کے ان پر مسلط کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ عدم اطمینان اپنی قیادت سے ہے' جسے وہ مغربی مفادات سے وابستہ خیال کرتے ہیں' اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیادت مغربی ترقی کے نمونوں اور اقدار کو مسلم معاشروں پر مسلط کرنے کے لیے محض آلہ کار ہے۔ اس طرح یہ احیاء ایک ہمہ جہتی مظہر ہے۔ ایک طرف یہ عوام کی اُمنگوں اور تاریخی آئینے میں مسلم تشویش کا اظہار ہے' جو حقیقتاً اندرونی اور مقامی عناصر پر مبنی ہے۔ دوسری جانب یہ بیرونی حلقوں کی جانب سے مسلط کردہ فکری اور سیاسی چیلنج کے خلاف ایک ردعمل بھی ہے۔ یہ چیلنج استعمار کے خاتمے پر' مسلم معاشرے میں بیرونی مداخلت ہے۔

اسلامی احیاء کی تحریک' مسلم دُنیا کی موجودہ صورت حال کی ناقد ہے۔ یہ ہمارے دور کے غالب کلچر' یعنی مغربی تہذیب و ثقافت کی بھی ناقد ہے جو اکثر ملکوں میں چھائی ہوئی ہے۔ یہ تنقید ایک مختلف بنیاد اور مختلف زاویۂ نظر یعنی اسلام کے اصل ماخذوں ـــــ قرآن اور سنت ـــــ کے حوالے سے ہے۔

یہ تحریک ایمان کے احیاء کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسلامی احیاء کی یہ جہت بیش تر مغربی تحریروں میں نظرانداز دکھائی دیتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ ''یہ محض سیاسی اور سماجی ترتیب نو کا سوال ہے''۔ سماجی نظم یقیناً اہم ہے' لیکن نکتہ آغاز ایمان کا احیاء اور اس کا استحکام ہے' نیز فرد کی اخلاقی شخصیت اور اس کے کردار کی تعمیر نو ہے۔ روحانیت اور عینیت پسندی کا ایک بے پناہ جذبہ ہے' جو درست سمت کے لیے ایک نیا احساس اُبھار رہا ہے اور لوگوں کو اپنی دُنیا کی تعمیر نو پر آمادہ کر رہا ہے۔

استعماری دور میں اور اس کے بعد قیادت کا جو نمونہ سامنے آیا' اس میں نام نہاد

مسلم قوم پرست اور سیکولر قیادت نے ذاتی مفادات کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ اخلاقی قدروں سے تہی دامن ہے اور بدعنوانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسلم ملکوں میں بدعنوانی اور استحصال طرزِ زندگی بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں اور انھیں عالمی صورت حال میں بہت دھچکے برداشت کرنے پڑے ہیں' تاہم بدعنوانیوں کا موجودہ طوفان جو آج مسلم دُنیا میں دیکھا جا رہا ہے' بالکل نئی صورت حال ہے۔ عام طور پر مسلمان اس صورت حال کو سیکولرازم اور مغربیت کے اثرات کا منطقی نتیجہ بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں انفرادی اور اجتماعی اخلاق جو توحید اور سنت رسولؐ سے وفاداری پر مبنی تھے' ان غیر ملکی اثرات کے زیر اثر کمزور پڑ گئے ہیں۔

''مسلم تجدد پسندی'' مسلم ممالک میں سیکولرازم کے نفوذ کی کوشش تھی۔ اس نے مغربی لبرل ازم کی اقدار کو مسلم معاشرے پر اوپر سے تھوپنے کی کوشش کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے پر روایتی اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کوئی نئی اخلاقیات وجود میں نہ آ سکی۔ یہ وہ اخلاقی خلا ہے جس میں اقتصادی ترقی اور مادی خوش حالی کے نام پر ذاتی مفادات کے حصول' اپنی دولت میں اضافے اور سماجی واقتصادی استحصال کی کوششیں عام ہو گئیں۔

اسلامی احیاء معاملات کی اس صورت حال کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ تحریک' اسلامی اخلاق کی بحالی اور اُمت مسلمہ کے مادی اور انسانی وسائل کو اُمت میں سماجی انصاف اور خود انحصاری کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ مسلم نوجوان' اسلام کے فراہم کردہ اصولوں اور سیرت رسولؐ کے مطابق اپنی انفرادی اور سماجی زندگی کی تعمیر نو کے جذبے سے سرشار ہیں۔ وہ نہ صرف ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں' بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نیا عالمی نظام صرف انھی کے لیے نہیں بلکہ دُنیا کے تمام پسے ہوئے لوگوں کے لیے امن' وقار اور انصاف کا ضامن بن کر اُبھرے۔

آخر میں' میں یہ کہوں گا کہ اسلامی احیاء بنیادی طور پر مسلم معاشرے کی اندرونی'

مقامی' مثبت اور نظریاتی تحریک ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس کا دوسری قوتوں سے ربط ہو بلکہ کشمکش بھی ممکن ہے۔ مسلمانوں کا مغرب کے ساتھ' بالخصوص نوآبادیاتی دور میں قریبی ربط اور معاملات کی تفہیم کا رویہ سمجھ میں آتا ہے' لیکن یہ جوابی ردعمل' اسلام کا سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر نہیں رہا۔

اسلامی تہذیب کا چیلنج

مسلمان اپنا سماجی اور اقتصادی نظام اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی ان قوتوں سے کشمکش لازمی ہے' جو موجودہ حالات (status - quo) کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے حق میں ہیں' اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مغربی تہذیب پر مسلمانوں کی تنقید بنیادی طور پر سیاسی تصادم کی کوئی مشق نہیں ہے۔ بلکہ یہ معرکہ دو ثقافتوں اور تہذیبوں کی سطح پر ہوگا۔ ایک تہذیب اسلامی اقدار پر مبنی ہوگی اور دوسری کی اساس مادیت' قومیت پرستی اور سیاسی و اقتصادی لبرل ازم پر ہوگی۔ اگر مغربی ثقافت' عیسائیت' اخلاق کی مستقل اقدار اور ایمان پر مبنی ہوتی تو ربط یا مقابلے کی زبان اور طریق کار کی نوعیت مختلف ہوتی' لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔[۷]

انتخاب' ''الہامی اصول'' اور ایک سیکولر مادی کلچر کے درمیان ہے' اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے' کہ اس مقابلے کو تمام باشعور انسان محض مغرب اور مشرق کی جغرافیائی' سیاسی حدبندیوں یا عیسائیت بمقابلہ اسلام کے انداز میں دیکھیں گے۔ درحقیقت وہ تمام انسان' چاہے وہ دُنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں' جنھیں ہمارے دور کے روحانی اور اخلاقی بحران پر تشویش ہے' وہ اسلامی احیاء پر اطمینان کا سانس لیں گے' نہ کہ وہ اس سے خائف ہوں گے۔

۷۔ مفصل بحث کے لیے دیکھیے: تہذیب کا مستقبل اور اسلام' ترجمان القرآن' اپریل ۲۰۰۲ء

اقدار اور ثقافت کی سطح پر جاری تنازعے کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس صورت حال کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔

مسلم تحریک احیا میں عصبیت پر مبنی مغرب مخالف جراثیم نہیں ہیں۔ مغربی ملکوں اور مسلم دُنیا کے درمیان سیاسی تعلق کے حوالے سے یہ تحریک نہ تو آنکھیں بند کر کے مغرب کے حق میں ہے، نہ سرتاپا اس کے خلاف۔ حالانکہ مسلم ممالک اور مغرب کے درمیان دورِ استعمار کی تلخ یادیں موجود ہیں جو تعلقات کو مجروح کرنے کے امکانات رکھتی ہیں۔ اگر چین اور امریکہ کسی مشترکہ ثقافت اور یکساں سیاسی و اقتصادی نظام کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر سکتے ہیں، تو مغرب اور مسلم دُنیا آپس میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ بہت حد تک اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغرب، اسلامی احیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر مسلم ذہن اور مسلم نقطۂ نظر سے، مغربی طاقتیں، مسلم معاشرے پر مغربی ماڈل مسلط کرنے اور مسلمانوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مغربی غلبے کے نظام میں جکڑ رکھنے اور مسلم کلچر اور سوسائٹی کو براہ راست یا بالواسطہ غیر مستحکم کرنے کی کوششیں جاری رکھتی ہیں تو لازمی طور پر کشیدگی بڑھے گی، اور باہمی اختلافات میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اور اگر معاملات، مکالمے اور افہام و تفہیم کے ذریعے پُرامن طور پر، اور ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کے جذبات سے حل نہ ہوئے، تو ان معاملات کے حل کے لیے دوسرے طریقوں پر چل پڑنا ناگزیر ہے۔

دوسری طرف ہم تسلیم کریں کہ یہ ایک مختلف طرز کے معاشروں کی دُنیا ہے۔ مغربی کلچر دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے شانہ بشانہ ان پر غلبہ پائے بغیر پھل پھول سکتا ہے، اور دوسرے لوگ لازمی طور پر دشمن نہیں ہیں۔ اس صورت میں اس بات کا حقیقی امکان ہے کہ ہم اختلاف رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ اگر ہم اس

نقطۂ نظر کی پیروی کے لیے تیار ہیں تو ہم بہت سی مشترکہ بنیادیں اور مشترک چیلنج تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی مستقبل کے عالمی نظام کی کلید ہے۔

کیا ہم تمام ثقافتوں، مذاہب اور اقوام کی بقائے باہمی، بلکہ انھیں اپنی بقاء میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مستقبل روشن ہے۔ مسلم دُنیا، انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، تاہم اس کا زیادہ تر انحصار مغرب کی سیاسی، فکری، فوجی اور ابلاغی قیادت پر ہے کہ وہ اس چیلنج کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتی ہے؟ (ترجمہ: سجاول خاں رانجھا، ڈاکٹر سفیر اختر۔)☆

☆ اسلامی تحریک: درپیش چیلنج، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص۱۱-۲۷۔

پاکستان' امریکہ تعلقات: عصری تقاضے

مارچ ۲۰۰۰ء میں امریکی صدر کلنٹن [۱۹۹۳-۲۰۰۱ء] نے پانچ روزہ دورۂ بھارت کے بعد' جاتے جاتے پاکستان میں پانچ گھنٹے قیام کی جو زحمت گوارا کی وہ پاک و ہند ہی نہیں' پورے ایشیا کی سیاست میں امریکہ کے مستقبل کے کردار کے خدوخال نمایاں کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ دورہ اس علاقے کے باب میں امریکہ کی گذشتہ چالیس پچاس سال پر محیط پالیسی میں بڑی بنیادی تبدیلیوں کا پیامبر ہے۔ امریکی قیادت نے ''عبارت' اشارت اور ادا'' غرض ہر ہر طریقے سے اپنے عزائم اور نئی ترجیحات کا اظہار کر دیا ہے۔ بھارت سے دوستی اور پاکستان سے کشیدگی کا پیغام بڑا صاف اور معنی خیز ہے۔ امریکہ کا یہ رویہ پاکستانی قوم اور اس کی قیادت کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے۔

دوستانہ تعلقات کا جائزہ

ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری دیانت' حقیقت پسندی اور ملک وملت سے وفاداری کے ساتھ امریکہ سے اپنے تعلقات' ماضی' حال اور مستقبل کا ازسرنو جائزہ لیں۔ خوابوں اور تمناؤں کی دُنیا سے نکلیں اور نئے حالات کی روشنی میں' دن کی

روشنی کی طرح روشن حقائق کے مطابق اپنے نظریاتی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی مقاصد و مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے ایک جان دار' واضح اور دیرپا حکمت عملی وضع کریں۔ اس دورے کا اگر کوئی حقیقی پیغام ہے تو وہ یہ ہے کہ ''دوستوں میں سب سے قریبی دوست'' (friendliest of the friend) اور ''سب سے قریبی ساتھی'' (most allied ally) کی دوستی اور قربت کی حقیقت کو سمجھیں' ہوا کے رخ کو پہچانیں' خوش فہمیوں کی بھول بھلیوں سے نکلیں اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ فیصلے کی اس گھڑی کا فائدہ اٹھائیں' کسی تاخیر کے بغیر اپنی پالیسی اور اہداف کا تعین کریں اور ان کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔

مومن کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔ ایک باوقار اور آزادی کی قدر کرنے والی قوم کی حیثیت سے آج ایک نئے عزم اور واضح پالیسی کی ضرورت ہے۔ لیت ولعل اور ماضی کی طرح وقت گزاری سم قاتل ہو گی۔ دوستی کے مجہول اور مبہم خوابوں کی دُنیا سے نکلنا اور مردانہ وار اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے نئے عزم اور نئے پروگرام کی تشکیل امت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ امریکہ سے دوستی کے پچاس سالہ دور کا بے لاگ جائزہ' اور امریکہ کی نئی ترجیحات اور دوستی کے نئے دروبست کی روشنی میں اپنے مقام اور اپنے اہداف کا تعین ہی ہماری اولین ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ پاکستان ملت اسلامیہ پاک و ہند کی جمہوری جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے نتیجے میں قائم ہوا ہے اور اللہ کی دی ہوئی اس امانت کی اصل امین ملت اسلامیہ پاکستان ہے۔ جو کام اس وقت درپیش ہے یہ کسی ایک فرد کے کرنے کا نہیں۔ نہ اسے چند نام نہاد دانش وروں' سول سرونٹس' فوجی جرنیل یا این جی اوز کے کرتا دھرتا حضرات پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ فیصلہ قوم کو کرنا ہے اور کھلی بحث اور قومی اجماع (consensus) کی بنیاد پر کرنا ہے اور ہر مصلحت سے بالا ہو کر کرنا ہے۔

چونکہ اس فیصلے پر ہماری آزادی' سلامتی اور باعزت قومی زندگی کا انحصار ہے'

اس لیے کسی کو یہ حق اور اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی قسمت سے کھیلے۔ موجودہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قوم کو اعتماد میں لے اور اس کے تاریخی عزائم' ملی جذبات اور قومی سلامتی کے تصورات کے مطابق خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کرے جو حقیقی قومی یک جہتی اور اتفاق رائے پر مبنی ہو۔

جائزے کی وسیع بنیادیں

اس وقت مرکزی مسئلہ امریکہ سے تعلقات کے منہج کا ہے' لیکن ناگزیر ہے کہ اس میں بھارت اور دوسری عالمی قوتوں سے تعلقات بھی زیر بحث آئیں۔ اس وقت عالمی سیاست کا جو نقشہ زیر تشکیل ہے اس کے پس منظر میں یہ سارا کام ہونا ہے' اس لیے خارجہ پالیسی کے سارے ہی پہلوؤں پر اس وقت از سرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ وقتی یا نمایشی اقدامات کا نہیں' بلکہ طویل عرصے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر پالیسی سازی کے اہتمام کا ہے۔

یہ کام بند کمروں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قومی سطح پر کھلی بحث ہو اور حکومت بھی پوری قوم اور اس کے معتمد نمایندوں کو مشورے میں شریک کرے' تاکہ حقیقی قومی پالیسی وجود میں آ سکے۔ بیرونی مبصر بھی اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ اس وقت پاکستانی قوم کے افکار' اس کی خواہشات اور جذبات اور مغربی سیاست سے وابستہ اور انگلش میڈیم کلاس کے احساسات جدا جدا ہیں۔ ہفت روزہ اکانومسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں کلنٹن کے اس دورے کے پس منظر میں پاکستانی قوم کے مخمصے کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے صرف نظر بہت بڑی افتاد پر منتج ہو سکتا ہے:

یہ بات واضح ہونے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے کہ جناب کلنٹن نے پاکستان کو ٹھنڈا کیا ہے یا مشتعل کیا ہے۔ پاکستان کے انگریزی زبان کے اخبارات نے جو پاکستان کے آیندہ رخ کے بارے میں کلنٹن کے ہم خیال ہیں' اس کی

> ڈانٹ ڈپٹ کا تقریباً خیر مقدم کیا۔ [پاکستان کے] اردو پریس نے جو عوامی رائے سے زیادہ قریب ہے' اس نے امریکی صدر پر بھارت کو پرچانے اور خوش کر کے الزام لگایا ہے۔[1]

بات صرف اردو پریس کی نہیں۔ انگریزی پریس میں بھی عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنے والی تحریریں آتی ہیں' چاہے تعداد میں کم ہوں۔ اصل مسئلہ مخصوص طبقات کی خواہشات یا مفادات کا نہیں' بحیثیت مجموعی قوم کے جذبات' احساسات' عزائم اور امنگوں کا ہے اور عوام کی مرضی سے بے پروا ہو کر اگر کوئی راستہ اختیار کیا جاتا ہے تو وہ تصادم اور تباہی کا راستہ ہے' جس سے بچنا بہتر ہے۔

اس لیے ہم سب سے پہلے ان دو باتوں کا برملا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ:

۱- اولیں ضرورت پاک امریکی تعلقات کے بے لاگ جائزے اور قومی عزائم' سلامتی اور آزادی کے تقاضوں کے حوالے سے واضح اور دیرپا پالیسی کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ شترمرغ کی طرح زمین میں سر چھپانے' کبوتر کی طرح خطرے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے اور گیدڑ کی طرح خائف ہو کر دم ہلانے میں آزادی اور عزت داروں کی موت ہے۔ ضرورت شیر کی طرح حالات کا مقابلہ کرنے کی ہے لیکن یہ کام پوری حقیقت پسندی' بالغ نظری اور دیرپا اثرات کو نگاہ میں رکھ کر کرنے کا ہے۔

۲- پالیسی کے جائزے اور تشکیل نو کا کام نہ صرف یہ کہ قومی عزائم اور مفادات کی روشنی میں انجام پانا چاہیے' بلکہ اس موقف کو اختیار کرنے اور اس پر جم جانے کی ضرورت ہے جس کی تشکیل قومی اتفاق رائے سے ہو۔ قوم کو اعتماد میں لیا جائے اور اس کی موثر شرکت سے پالیسی سازی انجام دی جائے۔ یہ کام محض وزارت خارجہ یا پاکستانی سربراہ حکومت کے سیکرٹریٹ کا نہیں' اس میں قوم کے تمام حقیقی نمایندوں کی شرکت

۱- ہفت روزہ اکانومسٹ' یکم اپریل ۲۰۰۰ء' ص ۶۱

اور ان کا اطمینان ضروری ہے۔ وہی فیصلہ قائم رہ سکتا ہے جو قومی سوچ پر مبنی ہو اور جسے اجتماعی ضمیر کی پشت پناہی حاصل ہو اور یہی اسلام اور جمہوریت کی روح ہے۔

قابل توجہ پہلو

ہم اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ صدر کلنٹن کا دورہ کامیاب رہا یا ناکام؟ گو دورے کے بعد سے اس موضوع پر بھارت اور پاکستان ہی نہیں' یورپ اور خود امریکہ میں بھی بڑی لے دے ہو رہی ہے۔

پاک و ہند کا یہ دورہ صدر کلنٹن کے دور صدارت کا باسٹھواں (۶۲) دورہ تھا اور جس تام جھام اور شاہی کروفر سے اس کا اہتمام کیا گیا اس میں یہ منفرد تھا۔ صدر کے ایرفورس ون کے ساتھ ۷۶ جہازوں کا ایک پرشکوہ قافلہ تھا جو امریکہ کی ایرفورس کی کارگو ڈویژن کا ایک تہائی ہے۔ محض جہازوں نے چار دن تک روزانہ ۵۰ پروازوں کے ذریعے وہ سارا ساز و سامان اور عملہ کے افراد بھارت پہنچائے جو جمہوری صدر کی حفاظت پر مامور تھے۔ خفیہ اداروں کے ۱۰۰' ۲۰۰ جوان ۳۰ بلٹ پروف گاڑیاں' دو فوجی ٹرک' ایک درجن ہیلی کاپٹر حتی کہ بستر' پانی اور حفاظتی کتوں کا لشکر ہر لمحہ خدمت پر کمربستہ رہے۔ جمہوریت اور مساوات کے اس پیامبر کے صرف ایک سفر پر ۷۵ ملین [ساڑھے سات کروڑ پچاس لاکھ] ڈالر خرچ آئے۔ گویا جمہوری صدر نے بادشاہی دور کی یادگار تاج محل کو دیکھنے والے سفر پر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالا جو تاج محل کی تعمیر پر خرچ ہوا ہو گا۔

اس سب کے باوجود امریکی تجزیہ نگاروں کے مطابق جن مقاصد کے لیے یہ دورہ کیا گیا تھا اور جن کا اظہار خود صدر کلنٹن نے اپنے اس مضمون میں کیا تھا جو ۲۰ مارچ ۲۰۰۰ء کے انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون میں شائع ہوا تھا' یعنی: دُنیا کے خطرناک ترین علاقے کو جنگ کے خطرات سے پاک کرنا' نیوکلیر عدم پھیلاؤ کی امریکی پالیسی پر بھارت اور پاکستان کی آمادگی' اور کشمیر کے مسئلہ کے حل کی کوئی راہ نکالنا ـــــ ان

اہداف کی حد تک کلنٹن خالی ہاتھ واپس گئے اور ناقدین کے جواب میں سخت جھنجھلاہٹ کے عالم میں یوں برس پڑے کہ ''میرے کامیاب نہ ہونے کی وجہ سینٹ میں ری پبلکن پارٹی کا سیاسی کھیل ہے جس نے سی ٹی بی ٹی کی توثیق نہ ہونے دی''۔ اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز' واشنگٹن پوسٹ' واشنگٹن ٹائمز' سبھی نے یک زبان ہو کر اس دورے کو سب سے زیادہ مسرفانہ اور امریکہ کے اس علاقہ میں اہداف کے اعتبار سے ناکام قرار دیا۔ ہفت روزہ ٹائم (Time) نے اس کا خلاصہ یوں بیان کیا:

> صدر امریکہ جنوبی ایشیا کے دورے سے واپس آئے تو دہلی میں خوشی و مسرت ہے' جبکہ اسلام آباد میں ناامیدی' اور کشمیر میں مایوسی کی کیفیت ہے۔ امریکی صدر اپنے ساتھ تحائف سے بھرا ہوا سوٹ کیس لائے اور جسے وہ آج کی دُنیا کا خطرناک ترین علاقہ کہتے ہیں' اس کی سفارتی بارودی سرنگوں سے بچ آنے پر سکون محسوس کر رہے ہیں۔ دورے کے نتیجے میں کلنٹن اس سے زیادہ خطرناک علاقہ چھوڑ کر آئے ہیں جتنے خطرناک علاقے میں وہ گئے تھے۔[۲]

اور مستقبل کے بارے میں ٹائم کی پیش گوئی یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں کلنٹن کے مشورے پر عمل نہیں کرتیں تو:

> آنے والے مہینوں میں دہلی کی خوشیاں غم میں اور اسلام آباد کی ناامیدیاں مایوسی میں تبدیل ہو جائیں گی اور کشمیریوں کی مایوسی علیٰ حالہ رہے گی۔[۳]

یہ کام امریکہ کے ارباب حل وعقد کا ہے کہ وہ سوچیں کہ امریکہ نے اس دورے سے کیا پایا اور کیا کھویا۔ واشنگٹن ٹائمز نے تو کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے اس دورے کو مہنگی ناکامی (costly failure) قرار دیا ہے لیکن پاکستان کے لیے اس میں سیکھنے کے لیے

۲- ہفت روزہ ٹائم' ۳۰ اپریل ۲۰۰۰ء

۳- ایضاً

بہت کچھ ہے۔ اگر اب بھی پاکستانی قیادت اور امریکہ پر ایمان رکھنے والے بااثر طبقات کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو کم از کم پاکستانی قوم کی حد تک اپنی ساری کج مہری' بدذوقی' طوطا چشمی اور ہتک آمیزی کے باوجود یہ تلخ تجربہ ایک محفوظ' قابل اعتماد اور کامیاب تر مستقبل کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بات گلے شکوے سے آگے جا چکی ہے اور ہمارے لیے بحیثیت قوم ضروری ہو گیا ہے کہ توقعات رکھنے کے چکر سے نکل کر حقائق کا مقابلہ کریں اور اپنی راہ خود نکالنے کے باعزت رویے پر سختی سے قائم ہونے کا عزم کریں۔

تعلقات کا تاریخی تناظر

امریکہ سے تعلقات کے موجودہ دور کا آغاز ۱۹۵۰ء میں پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خاں کے دورہ امریکہ سے ہوا' جو مارچ ۲۰۰۰ء میں صدر کلنٹن کے دورہ بھارت پر ختم ہو گیا۔

○ **پہلا دور:** امریکہ نے پہلے چار سال (۵۴-۱۹۵۰ء) پوری کوشش کی کہ پاکستان' بھارت اور افغانستان یکساں پالیسی اختیار کریں اور پاکستان جنوبی ایشیا کی ایک ریاست کی حیثیت سے آگے بڑھے اور یہ تینوں مل کر دوسری جنگ کے بعد کی سیاست میں امریکہ کا ساتھ دیں۔ امریکہ کی بے پناہ خواہش اور کوشش تھی کہ بھارت اس کا ساتھ دے اور اشتراکی دُنیا کے گرد جو حصار امریکہ بنانا چاہتا ہے اس میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن پنڈت نہرو نے کسی صورت میں بھی اس نظام کا حصہ بننے کے لیے آمادگی کا اظہار نہ کیا بلکہ انڈونیشیا اور چین کے ساتھ مل کر غیر جانب دار تحریک (non-aligned movement) کو مضبوط کرنے کی کوشش کی' جو امریکی پالیسی کے خلاف تھی۔

پاکستان' خود اپنی حکمت عملی کے تحت' جنوبی ایشیا سے زیادہ اپنے کو وسطی ایشیا اور شرق اوسط کا حصہ سمجھتا تھا اور انھی ممالک کے درمیان اپنے مستقبل کا کردار دیکھ رہا تھا۔

ان حالات میں ۱۹۵۴ء میں پاکستان امریکہ کے دفاعی معاہدوں سیٹو (SEATO) اور سینٹو (CENTO)' بغداد پیکٹ کا رکن اور سرد جنگ میں امریکہ کا سب سے قریبی حلیف بن گیا۔ امریکی جمہوریت کو پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان کی فوجی آمریت میں کوئی خرابی نظر نہ آئی اور دونوں خوب شیروشکر ہوئے۔ جنرل ایوب نے امریکی کانگریس سے خطاب کیا اور ابدی دوستی کے عہد و پیمان ہوئے۔

○ دوسرا دور: لیکن ۱۹۶۲ء کی پہلی آزمایش میں امریکہ پھر بھارت کی طرف لوٹ گیا' چین سے نام نہاد مقابلے کے لیے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو کیل کانٹے سے لیس کیا' اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنالوجی اور نیوکلیر ٹیکنالوجی سے نوازا اور پاکستان کو تقریباً زبردستی کشمیر میں اقدام کرنے سے روک دیا' جس سے ایک تاریخی موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔

پھر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے تین سالہ امریکی فوجی اور معاشی امداد سے حاصل ہونے والی قوت کے زعم میں پاکستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے اپنے حلیف کا ساتھ دینے کی بجائے دونوں سے برابری (even handedness) کے نام پر پاکستان کی فوجی امداد روک دی' حالانکہ بھارت کی فوجی سپلائی کا بڑا انحصار روس پر تھا' جب کہ پاکستان کا تقریباً مکمل انحصار امریکی اسلحہ کے نظام پر تھا۔ صدر جنرل محمد یحییٰ [۱۹۶۹-۷۱ء] دورحکومت میں بھی بھارت روس دوستی تیزی سے بڑھتی رہی۔

امریکی وزیرخارجہ کسنجر اور صدر رچرڈ نکسن [۱۹۶۹-۷۴ء] کے لیے عوامی جمہوریہ چین تک رسائی کی خدمات انجام دینے والے پاکستان سے پھر ۱۹۷۱ء کے نازک لمحے میں جب بھارت نے دہشت گردی اور مکتی باہنی کی کھلی تائید کی اور پھر نومبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی' اسی طرح بے وفائی کی گئی جس طرح ۱۹۶۵ء میں کی گئی تھی۔ اب جو سرکاری دستاویزات شائع ہوئی ہیں' ان میں امریکی وزیرخارجہ کے وہ نوٹ موجود ہیں جو دونوں مواقع پر صدر امریکہ کو لکھے گئے اور دونوں میں صاف الفاظ میں کہا

گیا ہے کہ گو پاکستان سے ہماری دوستی اور معاہدات ہیں مگر ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیں۔

○ تیسرا دور: امریکہ کی مخالفت کا سب سے نمایاں اظہار ہماری نیوکلیر پالیسی کے سلسلے میں ہوا جس کے بارے میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے ان سارے احسانات کے باوجود جو چین سے روابط کے باب میں پاکستان نے خطرات مول لے کر کیا تھا اور جن کے باعث اسے ''وفادار دوست'' سمجھا جاتا تھا ایک ''عبرت ناک مثال'' (horrible example) بنانے کی دھمکی دی اور امریکی صدر جمی کارٹر [۱۹۷۷-۸۱ء] نے قطع تعلق کر کے معاشی پابندیوں کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیا۔

یہ تو افغانستان پر روس کا حملہ اور اشتراکیت کی اس یورش کے خلاف افغان مجاہدین اور پاکستان کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان کی دوستی کی ضرورت پڑی لیکن جیسے ہی افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے‘ افغانستان اور پاکستان دونوں سے آنکھیں پھیر لی گئیں۔

امریکہ میں دوستی کا مفہوم

یہ ضرور ہے کہ جزوی طور پر پاکستان کو فوج کی تنظیم نو‘ عسکری قوت کی ترتیب و تزئین اور معاشی میدان میں امریکہ سے اس دور میں کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ایسے فوائد ہم حاصل نہ کر سکے جن کا امکان اور موقع تھا‘ مگر قیادت کی نااہلی‘ بدعنوانی اور خوشامدانہ ذہنیت کی وجہ سے انھیں حاصل نہ کیا جا سکا۔

اگر پورے دور کا میزانیہ مکمل معروضی انداز میں تیار کیا جائے تو چند نتائج سامنے آتے ہیں:

امریکہ نے اس پورے دور میں پاکستان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا اور

عالم اسلام کے جن جن ممالک کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا وہ خالص امریکی مفاد کی بنیاد پر تھا۔ گو اس پورے عرصے میں آزاد دُنیا' جمہوری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا تذکرہ رہا اور نظریاتی اور اخلاقی اصولوں اور عالمی اقدار کی بات بھی بڑے بلند بانگ انداز میں کی گئی لیکن فی الحقیقت امریکی پالیسی کا ایک ہی مرکزی اصول ہے اور وہ امریکہ کا بحیثیت ایک عالمی قوت مفاد ہے۔ اس کی دوستی نہایت نا قابل اعتماد اور نا قابل بھروسہ ہے۔ اس کے لیے چشم زدن میں آنکھیں پھیر لینا ایک معمول ہے۔ یہ محض ہمارا تجربہ ہی نہیں' امریکہ کے اعلیٰ ترین پالیسی سازوں نے پوری میکیاولانہ چابک دستی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ ''یہی ان کی حقیقی پالیسی ہے اور اگر اسے دوسرے نہیں سمجھتے تو یہ ان کی کورچشمی ہے' امریکہ کا دوغلا پن نہیں''۔

امریکہ سے پاکستان کے جتنے بھی معاہدے ہوئے ہیں ان میں کبھی بھی امریکہ نے مصیبت کے وقت مدد کی قانونی اور دستوری ذمہ داری قبول نہیں کی۔ کئی امریکی صدور اور خارجہ امور اور دفاع کے سیکرٹریوں نے مدد کی زبانی یقین ہانی کرائی مگر اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی۔ پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان [۶۹-۱۹۵۸ء] نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۱ء کو امریکی کانگرس کے مشترکہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> وہ لوگ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے صرف پاکستان کے لوگ ہوں گے' بشرطیکہ آپ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے جواب میں امریکی صدر جان ایف کینیڈی [۶۳-۱۹۶۱ء] نے کہا تھا:

> پاکستان فوری اور دیرپا ضرورت کے وقت کا دوست ہے۔ امریکی اپنی نجی اور عوامی زندگی میں دوستوں کی دوستی اور اس کی پائیداری کی قدر کرتے ہیں۔

لیکن ۱۹۶۲ء میں ہی اس کا پول کھل گیا اور پھر امریکی وزیر خارجہ ڈین رسک نے یہ اصول بیان کر کے' پاکستان ہی نہیں' پوری دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا:

> وعدے ہمیں کسی خاص اقدام کا پابند نہیں بناتے۔ زیادہ تر میں یہ بیان کیا گیا

ہے کہ جارحیت کی صورت میں ہم مشترک خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دستوری طریق کار کے مطابق اقدام کریں گے۔ ہم دستوری تقاضوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس کا انحصار صورت حال کے حقائق پر ہو گا۔ بعض صورتیں دوسری کے مقابلے میں ہمارے کم اقدام کا تقاضا کرتی ہیں۔

۱۹۶۶ء میں سینیٹر سیمنگٹن نے وزارت خارجہ کو مجبور کیا کہ وہ commitment (ایفائے عہد) کی وضاحت کرے، تو محکمہ خارجہ کے ایک سینیر افسر نے اس میکاویلین اصول کو بیان ہی کر دیا:

> صدر آج ایک بیان دے سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اگلے دن اس سے دست بردار ہو جائیں۔ امریکہ پر صدر کے بیانات کی وجہ سے کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

پاک امریکی تعلقات کی پچاس سالہ داستان انھی کہہ مکرنیوں کی داستان ہے اور اس ''اصول'' کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے امریکی جمہوریت کے بانی جارج واشنگٹن نے بیان کیا تھا:

> ایک چھوٹی اور کمزور ریاست کا، ایک بڑی اور طاقت ور ریاست سے تعلق اول الذکر کے لیے آخر الذکر کا لاحقہ ہونا لازمی کر دیتا ہے۔ کسی قوم کا غیر متعلق لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ وہ اس حوالے سے اگر کچھ حاصل کرے تو اسے اپنی آزادی کے ایک حصے سے اس کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔

علامہ اقبالؒ [۱۹۳۸ء-۱۸۷۷ء] نے طاقت کی سیاست کے اس کھیل سے بروقت متنبہ کیا تھا، اگر ہم نے آنکھیں بند رکھیں تو غلطی ہماری ہے۔

> تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
> ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

امریکی دوستی کی قیمت

امریکہ کی دوستی کا ایک اور لازمی نتیجہ سیاسی' معاشی اور خود عسکری میدان میں محتاجی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہم نے عالمی سیاست میں اپنی دوستیوں اور دشمنیوں کو بڑی حد تک امریکہ کے عالمی عزائم اور نظام کے تابع کر لیا اور ایک حقیقی طور پر آزاد اور ملت اسلامیہ کے مفاد کی محافظ خارجہ پالیسی وضع نہ کر سکے۔

معاشی میدان میں ہم بیرونی امداد اور قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ آج عالم یہ ہے کہ قرضوں کی غلامی نے ہماری آزادی کو پابند سلاسل کر دیا ہے اور ہماری پوری معیشت ملک کی حقیقی ضروریات اور قوم کی ترجیحات کے بجائے بیرونی ساہوکاروں کے اشارۂ چشم و ابرو کی تعمیل میں لگی ہوئی ہے۔ فوجی سروسامان اور جنگی آلات اور صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی ہمارا بڑا انحصار امریکہ پر ہو گیا ہے اور چونکہ وہ اپنے وعدوں کا پابند نہیں (حتیٰ کہ F-16 جنگی طیارے جن کی قیمت بھی ہم پیشگی ادا کر چکے ہیں' ان تک کو نہ ہم حاصل کر سکے اور نہ ان کی قیمت واپس لے سکے ہیں) اور جب چاہے اپنے مصالح کے تحت رسد کی راہیں مسدود کر سکتا ہے اس لیے ہماری دفاعی صلاحیت میں مسلسل کمی آرہی ہے۔

یہ دوستی ہمیں ہر میدان میں بحیثیت مجموعی بہت مہنگی پڑی۔ تاہم سارا الزام امریکہ کی مفاد پرستی اور دوغلے پن کو دینا انصاف کے خلاف ہوگا۔ اس نے اپنے قومی مفاد میں جو مناسب 'سمجھا' کیا۔ لیکن اصل ذمہ داری ہماری اپنی قیادتوں کی ہے' جن میں فوجی اور سول کے ساتھ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں برابر کی شریک ہیں۔

اس پہلو سے ہمیں صدر کلنٹن کا ایک حد تک ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے بڑی رعونت سے ہتک آمیز انداز میں پاکستانی قوم کی غیرت کو جگایا اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا ہے اور ہمیں فیصلہ کن موڑ کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ سارا کام پوری منصوبہ سازی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ قوم کے سامنے اس

ڈرامے کے تمام سین رکھے جائیں تاکہ محض دوستی اور بے وفائی کے تذکرے میں بات گم نہ ہو جائے۔

امریکی عالمی نظام کی بنیادیں

عالمی قوت کی حیثیت سے سوویت یونین کے منتشر ہونے کے بعد امریکہ نے جس نئے عالمی نظام کا خاکہ تیار کیا ہے اس کے چار اہم ستون ہیں۔ ان چاروں کا اصل مقصد یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں جب تک ممکن ہو امریکہ کو واحد سوپر پاور کی حیثیت حاصل رہے اور کوئی متبادل قوت وجود میں نہ آنے پائے۔[۴]

اس فریم ورک میں دسیوں تحقیقی مقالات اور تھنک ٹینک کی رپورٹیں اور سیاست دانوں کی عملی کارروائیاں ہیں‘ جن کے مطالعے اور تجزیے سے مستقبل کے نقشے کے دروبست صاف نظر آتے ہیں۔ یہ چار نکاتی فارمولا کچھ اس طرح ہے:

۱- عالم گیریت (Globalisation): جس کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے جس میں آزاد تجارت‘ سرمایہ کی آزاد حرکت اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ذریعے عالمی معیشت پر مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ کے تسلط کو دائمی شکل دی جائے۔ اس طرح دولت کی اس غیر مساویانہ تقسیم کو مستحکم کر لیا جائے جو سامراجی دور کی پیداوار ہے اور جس کے نتیجے میں مغربی اقوام (یورپ اور امریکہ) جو ۱۸۰۰ء میں عالمی پیداوار کا صرف ۲۷ فی صد پیدا کر رہی تھیں‘ ۱۹۱۸ء میں ان کا یہ حصہ بڑھ کر ۸۷ فی صد ہو گیا‘ جبکہ ان کی آبادی دُنیا کی کل آبادی کا صرف ۱۸ فی صد ہے۔

۴- اس سلسلے میں جن مفکرین نے اس حکمت عملی کو فکری بنیادیں فراہم کی ہیں ان میں فرانسس فاکویاما کا The End of History کا فلسفہ‘ سیمول پی ہن ٹنگٹن کا Clash of Civilisation کا نظریہ اور بریزنسکی کی The Grand Chessboard خصوصیت کی حامل ہیں۔

اس نظام کو مستقل صورت اسی وقت دی جا سکتی ہے جب دُنیا کے دوسرے ممالک اپنی معیشت کو خود انحصاری کی بنیاد پر ترقی نہ دے سکیں' بلکہ اس عالمی نظام کا حصہ بن کر خام مال فراہم کرنے اور مصنوعات درآمد کرنے کا کام انجام دیں۔ اس طرح ترقی یافتہ ممالک کو نہ صرف یہ مسلسل بالادستی حاصل رہے بلکہ باقی دُنیا ان کی محتاج رہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ آزاد تجارت اور آزادی نقل و حرکت کے یہ علم بردار' انسانوں کی آزاد نقل و حرکت کے قائل نہیں ہیں اور انسانی آبادی کی حرکت اور نقل مکانی (migration) پر کڑی پابندیاں رکھنا چاہتے ہیں' تاکہ مغربی اقوام کی بالادستی متاثر نہ ہو سکے۔ اگر آبادی کی کچھ حرکت ہو تو وہ بھی اس شکل میں کہ ترقی پذیر ممالک کے پڑھے لکھے اور دولت و ثروت کے مالک افراد مغربی ممالک میں داخل ہو سکیں۔ مادی وسائل کے بہاؤ کے ساتھ اعلیٰ صلاحیت اور وسائل کا بہاؤ ہوتا رہے اور یہ ممالک ترقی یافتہ ممالک کی تقویت کا ذریعہ بنتے رہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی معدنیات' توانائی کے سرچشموں خصوصیت سے تیل اور گیس پر مستقل قبضہ اور ان تک رسائی کے راستوں کی حفاظت کی جائے۔

۲- **جمہوریت:** اس نظام کا دوسرا ستون سیاسی ہے یعنی انفرادی آزادی' جمہوریت' حقوق انسانی کا تحفظ اور مذہبی رواداری کی ترویج اور اس کے پردے میں ان ممالک میں ایسے نظاموں کا قیام عمل میں لایا جائے جن کو سیاسی جوڑ توڑ' مالی وسائل' معاشی مراعات اور ذرائع معلومات کے توسط سے فکری کنٹرول اور تہذیبی غلبے کے ذریعے بہ آسانی متاثر کیا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کی جمہوریت کی تعبیر بڑی نرالی ہے۔ جمہوریت کے معنی تمام انسانوں کی مساوات نہیں اور نہ لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے عقائد' اقدار اور ترجیحات کی روشنی میں اپنا نظام زندگی طے کریں۔

جمہوریت کی تعبیر یہ ہے کہ مغربی جمہوریت کو اس طرح پروان چڑھایا جائے کہ یہ ممالک مغرب کے رنگ میں رنگ جائیں اور ان پر ایسی قیادتیں مسلط رہیں جو مغربی تہذیب کی دلدادہ اور مغربی مفادات کی محافظ ہوں۔ نیٹو (تنظیم معاھدہ شمالی اوقیانوس) کو اب وسعت دے کر یورپ کی ان اقوام کو بھی اس کے چنگل میں پھانسا جا رہا ہے' جو اپنا الگ تہذیبی وجود رکھتی ہیں اور کل کسی متبادل نظام کے لیے زمین فراہم کر سکتی ہیں۔ ترکی میں جمہوری تماشے کے باوجود پورا ملک سیکولر فوجی قیادت کی گرفت میں رہے۔ الجزائر میں عوام اپنی آزاد مرضی سے اگر اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں تو ان کی پوری قیادت کو پابند طوق و سلاسل کیا جائے' ملک میں سول وار کی کیفیت پیدا کر دی جائے اور یہ سب ''جمہوریت کے نام پر'' ہو۔ جمہوریت' تہذیبوں اور نظام زندگی کے تعدد کا ذریعہ نہ بنے' بلکہ جمہوریت کے عنوان سے مغربی سیاسی اور معاشی ادارے پوری دُنیا پر مسلط کیے جائیں اور ان کے ذریعے وہاں کی آبادیوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ جہاں کہیں حالات مغربی اقوام کی مرضی کے مطابق نہ ہوں وہاں انسانی بنیادوں پر مداخلت کے نام پر فوج کشی تک کا حق اپنے پاس محفوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی عالمی ادارے کی اجازت بھی ضروری نہیں بلکہ یہ سب امریکہ اور اس کے ہم نوا ممالک کے دائرہ اختیار میں رکھا جائے۔

جمہوریت کے یہ علم بردار کسی بالاتر قانون اور کسی غیر جانب دار اتھارٹی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اقوام متحدہ کو ایک غیر موثر ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے پاس کوئی اختیار نہیں اور سیکورٹی کونسل جسے کارروائی کا اختیار ہے' اس میں پانچ طاقتوں کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔ اگر اس حق کی توسیع کی بات ہو رہی ہے تو وہ بھی کسی جمہوری اصول پر نہیں بلکہ اپنے ہی طائفے کے کچھ دوسرے ارکان کو مسلط کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) اور ورلڈ بنک جو اہم عالمی مالیاتی ادارے ہیں

ان میں بھی انھی مال دار ممالک کو اکثریت حاصل ہے اور ان کے اشارہ ابرو کے بغیر وہ ذرا بھی جنبش نہیں کر سکتے۔ جمہوریت کے ان علم برداروں کو اگر جمہوریت سے حقیقی دل چسپی ہوتی تو سب سے پہلے ان اداروں کو جمہوری رنگ میں رنگنے کی فکر کرتے لیکن اس کا دور دور پتہ نہیں۔ عالمی میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے ذرائع پر مغربی اقوام کا کنٹرول بھی اسی لبرل آرڈر کا حصہ ہے ___ اس طرح عالم گیریت اور جمہوری آزادروی (democratic liberalisation) اس نئے نظام کے ایک دوسرے کو مضبوط کرنے والے دو ستون ہیں۔

۳۔ ٹکنالوجی: اس نظام کا تیسرا ستون ٹکنالوجی ہے' خصوصیت سے نیوکلیر اور ہائی ٹیک (Hi-tech) کمپیوٹر ٹکنالوجی پر مغربی اقوام کی اجارہ داری ہے۔ نئے دفاعی نظام کا بنیادی ستون امریکہ کی مستقل اور ناقابل چیلنج عسکری قوت کا استحکام اور اسے جہاں سے بھی کوئی خطرہ ہو (خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو) اسے ختم کرنے کا حق ہے۔ سد جارحیت (deterrance) کے معنی اس نظام میں یہ ہیں کہ: ''امریکہ اور اس کے حواریوں کی قوت اور بالادستی کو چیلنج کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ ایٹمی عدم پھیلاؤ کا مقصد دُنیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کرنا نہیں' مغرب کی نیوکلیر بالادستی کو دائمی بنانا اور ہر چیلنج کا راستہ روکنا ہے''۔ کیمیاوی اور گیس کے ہتھیاروں پر پابندی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اسی طرح میزائل کے نظام کو لگام دینے کا پروگرام بھی اس عسکری بالادستی کا تحفظ ہے۔

دہشت گردی (terrorism) کے باب میں جو محاذ کھولا گیا ہے' اس کا مقصد بھی دُنیا میں ابھرنے والی ہر متبادل قوت کو ایک قسم کے سوچے سمجھے تشدد کا نشانہ بنانا ہے جو خود انسانیت کے خلاف ایک سنگین جرم ہے۔ کوئی صحیح العقل انسان دہشت گردی اور تشدد کی حمایت نہیں کر سکتا لیکن مظلوم اگر ظالم کے خلاف ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جائے یا محکوم اقوام اپنی آزادی کے لیے سیاسی جدوجہد کی راہیں مسدود ہونے کی صورت میں ظالم اور

استعماری حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کریں تو اسے دہشت گردی کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اگر یہ دہشت گردی ہے تو دُنیا کے موجودہ سیاسی نقشے کا ۸۰ فی صد ایسی ہی جدوجہد کے نتیجے میں صورت پذیر ہوا ہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ اس کی سب سے قریبی مثال مشرقی تیمور [انڈونیشیا] ہے' جہاں ۲۰ سالہ عسکری جدوجہد کے بعد اقوام متحدہ کے زیرانتظام استصواب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مشرقی تیمور اپنے تیل کے ممکنہ ذخائر کی وجہ سے مغربی اقوام کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور ایک مسلمان ملک کو کمزور کر کے ایک عیسائی ریاست کا قیام اس کا نتیجہ ہے۔ لیکن بات اصول کی ہے اور جس حق کے تحت اقوام متحدہ کے ۱۴۰ ممالک آزاد ہوئے ہیں اسے محض اس لیے دہشت گردی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کشمیر' کوسووا' چیچنیا اور منڈاناؤ میں اس کا فائدہ مسلمانوں کو پہنچے گا۔

۴- **سیاسی حصار بندی:** اس نظام کا چوتھا ستون نئی سیاسی حصار بندی ہے جسے بہت ہی ہوشیاری لیکن عیاری کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔ اس میں نیٹو کی توسیع' مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کے قیام کے بعد اس کے معاشی غلبے کے لیے صلح کاری' وسط ایشیا میں ایک بار پھر روس اور مغرب سے منسلک ریاستوں کے مسلمان ریاستوں پر اثرانداز ہونے کے نظام کے دروبست' بھارت کو ایک ایشیائی قوت کے طور پر آگے لانے کی کوشش ہے۔

اس حصار بندی کا اصل ہدف اب چین اور عالم اسلام اور خصوصیت سے عالم اسلام کے وہ ممالک ہیں جو کچھ بھی آزاد روی اختیار کر سکتے ہیں اور جن میں اسلامی تحریکات ایک غالب قوت بن سکتی ہیں۔ اولیں ہدف چین کے ساتھ ایران' افغانستان اور پاکستان ہیں۔ ترکی کو یورپی یونین میں ضم کرنے اور ترک کرد کش مکش کے ذریعے مستقل طور پر جنگ و جدال میں مصروف رکھنے کا پروگرام ہے۔ وسط ایشیا کی اسلامی تحریکوں کو ''دہشت گردی'' کے نام پر قابو کرنے کا منصوبہ ہے۔ ایران اور افغانستان کو دبانے یا ان کے ریاستی وفکری سانچے کو بدلنے کا ہدف ہے۔ پاکستان کو کمزور کرنے' چین

کے ساتھ غلط فہمیاں پیدا کرنے اور اس کو مسلم دنیا کے قریب نہ ہونے دینے کی کوششیں ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان پر معاشی دباؤ کے ساتھ ساتھ اسے بھارت کی طرف سے عسکری خطرات سے بھی دوچار کرنا ہے۔

یہ اپنی روح اور مقاصد کے اعتبارات سے اسی طرح کا ایک حصار بندی کا نظام ہے جیسا سرد جنگ کے زمانے میں اشتراکی روس' چین اور مشرقی یورپ کے خلاف قائم کیا گیا تھا' گو نئے حالات کے پیش نظر اس کا اسلوب اور عنوانات مختلف ہیں۔ اس انتظام میں علاقے' ملک اور سیاسی ساتھیوں سب کے مقام اور تعلقات کی نوعیت میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں: ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!''

امریکی مفادات اور بھارت

اس پس منظر میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے کہ بھارت امریکہ کا ''فطری حلیف'' اور ''اسٹریٹیجک پارٹنر'' بن گیا ہے۔ خواہ بھارت میں حکومت اس پارٹی کے ہاتھوں میں ہو جو ہندو تشدد پرستی (Hindu Chanvinism) کی پرچارک' سیکولرازم کے مقابلے میں ہندوتا کی مبلغ' مسلمانوں' عیسائیوں اور تمام اقلیتی گروہوں کے خون کی دشمن اور ان کے تہذیبی قتل پر کاربند ہو۔

یہ نقشہ' نئی دوستیوں اور پرانے تعلقات پر نظر ثانی کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین نے کہا ہے کہ: ''عملی سیاست میں کوئی دوستی مستقل نہیں ہوتی' مستقل چیز تو صرف مفاد کا حصول ہے اور مفادات کی شکل اور نوعیت صحرا کی ریت کی حرکت کی طرح بدلتی رہتے۔ اسی روشنی میں دوستوں اور مخالفین کی درجہ بندی ہوتی ہے''۔ ہمیں امریکہ کی نئی ترجیحات اور نئی راہوں کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں اپنے مقاصد اور مفادات کے تحفظ کے لیے کاربندی کی فکر کرنی چاہیے۔ محض پرانی دوستیوں کا گلہ یا ان کے بحال ہو جانے کے خواب دیکھنا حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو' غالب
ترے بے مہر کہنے سے' وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

بھارت کے لیے امریکہ کی مختلف حکومتوں میں' خصوصیت سے ڈیموکریٹ صدور اور پارٹی لیڈرشپ میں' ایک نرم گوشہ تو شروع سے رہا ہے۔ بھارت کے جغرافیائی محل وقوع' رقبے' آبادی' معاشی وسائل' مارکیٹ کی وسعت اور سیاسی اثرورسوخ کی وجہ سے اسے غیرفطری نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ بھارت کی قیادت نے' پنڈت جواہر لعل نہرو کے دور ہی سے' خود کو سوشلسٹ نظام کے علم بردار' اشتراکی روس سے خصوصی تعلق اور غیر جانب تحریک کے رکن رکین کی حیثیت سے پیش کیا' اور سرد جنگ کے دور میں اپنے آپ کو امریکہ سے دُور رکھا۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد حالات بدلتے ہی بھارت نے بھی منڈی کی معیشت کا راستہ اختیار کیا اور تجارت میں بھی نسبتاً آزاد روی کی پالیسی اختیار کی۔ افغانستان کے بارے میں روس کا ساتھ دینے کے باوجود اس نے آہستہ آہستہ امریکہ سے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ۱۹۹۵ء تک ان روابط نے ایک واضح شکل اختیار کر لی: جس میں معاشی تعاون' تجارت میں روز افزوں اضافہ' امریکی سرمایہ کاری میں اضافہ' سیاسی معاملات میں مفاہمت اور ۱۹۹۱ء میں عراق کے خلاف جنگ کے موقع پر امریکی ہوائی جہازوں کو تیل کی سہولت دی گئی۔ بالآخر جنوری ۱۹۹۵ء میں امریکہ کے وزیر دفاع سے باقاعدہ معاہدے کے تحت بھارت اور امریکہ کے درمیان مشترک جنگی مشقوں کا آغاز ہوا۔

بھارت کا کاروباری نفوذ

اس زمانے میں ایک اور اہم عنصر امریکہ میں بھارتی تاجروں' صنعت کاروں اور خصوصیت سے انفارمیشن ٹکنالوجی کے اداروں کا کردار ہے۔

امریکہ میں بھارتی نژاد لوگوں کی تعداد میں گذشتہ بیس سال میں چار لاکھ کا

اضافہ ہوا ہے جو ۱۹۸۰ء کی تعداد پر ۶۶ فی صد اضافہ ہے۔ انڈین سافٹ ویئر نے امریکی مارکیٹ میں اپنا مقام بنایا اور صرف اس میدان میں یہ تجارت ۱۹۹۱ء کے چار کروڑ پچاس لاکھ ڈالر سے بڑھ کر ۱۹۹۹ء میں ۵ ارب ڈالر تک پہنچ گئی۔ اس وقت امریکہ کی سیلی کون ویلی میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار بھارتی سافٹ ویئر انجینئر کام کر رہے ہیں۔ امریکہ کے لیے بھارت کی کل برآمدات گذشتہ سال ۱۰ ارب ڈالر سے متجاوز ہو گئی ہیں' جو بھارت کی کل برآمدات کا تقریباً ۲۲ فی صد ہے۔ اس طرح بھارت کی کل درآمدات کا تقریباً ۹ فی صد امریکہ سے آ رہا ہے۔ امریکہ سے بھارت کا توازن تجارت بھارت کے حق میں ہے (تقریباً ۶ ارب ڈالر سالانہ فاضل) اس لیے امریکہ کی مصنوعات کے لیے بھارت کی منڈیوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

بھارت میں امریکی سرمایہ کاری میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت بھارت میں کی جانے والی بیرونی سرمایہ کاری میں امریکہ کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی ہے اور تقریباً ساڑھے چار سو امریکی کارپوریشنیں بھارت میں مصروف سرمایہ کاری ہیں۔ پاکستان سے تقابلی صورت حال کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بھارت کی امریکہ کو سالانہ برآمدات (۱۰ ارب ڈالر) پاکستان کی کل برآمدات (ساڑھے آٹھ ارب ڈالر) سے زیادہ ہیں اور بھارت میں کی جانے والی صرف امریکی سرمایہ کاری (۴۵۶ ارب روپے بھارتی) پاکستان کے کل سالانہ بجٹ سے زیادہ ہے۔

مستقبل کے ''یہودی''؟

بھارت نے صرف اپنی وزارت خارجہ یا واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے سفارت خانوں پر تکیہ نہیں کیا' بلکہ بھارت نواز تنظیموں کا ایک وسیع جال بچھا دیا ہے۔ سوا سو سے زیادہ امریکی ارکان کانگرس بھارتی لابی کا حصہ ہیں۔ امریکہ میں بھارت نژاد ووٹر اپنے پیسے اور سیاسی اثر و رسوخ کو بڑے موثر انداز میں استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا کردار اتنا

اہم ہے کہ ایک ممتاز بھارتی ماہر معاشیات پروفیسر جگدیش بھگوتی (کولمبیا یونی ورسٹی) نے کہا ہے:

> امریکہ میں ہمارا رسوخ جس حقیقت کی بنیاد پر ہے' وہ یہ ہے کہ بھارتی کمیونٹی میرے کہنے کے مطابق امریکہ کے ''اگلے یہودی'' (next jews) ہیں۔ بہت زیادہ کامیاب' علمی طور پر بلند' معاشی طور پر نمایاں' ان افراد کو وہ تمام networking فوائد حاصل ہیں جو میرٹ پر مبنی انفارمیشن کا رجحان رکھنے والا معاشرہ جیسا کہ امریکہ ہے' دے سکتا ہے۔ ہمارا اثر و رسوخ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہمارے نمایاں دانش ور' آرٹسٹ' سائنس دان' پالیسی ماہرین اور تحقیق کار' بارسوخ امریکیوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ میڈیا میں ہمارے مضامین بھی اس رسوخ کی وجہ سے شائع ہوتے ہیں۔ ایک ایسے سیاسی نظام میں جو نقد عطیات پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہو' ہمارا سیاسی اثر و رسوخ اس لیے بھی برابر بڑھ رہا ہے کہ ہمارے تاجر خصوصاً انفارمیشن ٹکنالوجی میں ان نئے ارب پتیوں میں ہیں' جن کو جناب کلنٹن' گور' اور بش محض لالچ کی وجہ سے نہایت احترام سے دیکھتے ہیں۔[۵]

بھارت نے اپنا ہوم ورک بڑی ہوشیاری' مہارت' محنت اور چابک دستی سے کیا ہے۔ بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ اور ٹالبوٹ کی دس ملاقاتوں نے امریکہ کے پالیسی سازوں کی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ جسونت سنگھ نے اپنی کتاب Defending India میں جو ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی تھی' اس میں غیر جانب دار تحریک پر سخت تنقید کی ہے اور اس پالیسی کے ۴۰ سالوں کو برباد شدہ سال (lost year) قرار دیا ہے اور امریکہ سے دوستی ہی نہیں معاہداتی اور اداراتی تعلق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

۵- The Next Jews' انڈیا ٹوڈے' اپریل ۲۰۰۰ء

بھارت امریکہ تعلقات کے اُفق

اس سوچ کا مجسم نتیجہ ''دستاویز بصیرت'' (Document on Vision) کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے بھارت اور امریکہ ویسے ہی حلیفانہ رشتے میں جڑ گئے ہیں' جیسا بھارت نے مشرقی پاکستان پر یورش سے پہلے روس سے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔

صدر امریکہ کے دورے سے پہلے امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے ایک بڑا اہم بیان دیا' جس میں کہا: ''ہم بھارت سے ماضی کے پچاس سالوں میں بے توجہی کے لیے معذرت کرتے ہیں'' اور کارل انڈرفرتھ نے صاف لفظوں میں یہ تک کہہ دیا:

بھارت سے ہمارے مجموعی تعلقات کسی دوسرے ملک سے ہمارے تعلقات کے یرغمال نہیں ہوں گے۔

امریکہ کے چوٹی کے اکیس دانش وروں نے ایک ٹاسک فورس کی طرف سے' جس کے سربراہ دی بروکنگز انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر اس کے فارن پالیسی اسٹڈیز کے ڈائرکٹر رچرڈ ہاس ہیں' ایک رپورٹ تیار کی۔ جس میں کلنٹن کو مشورہ دیا گیا کہ ''سرد جنگ کے بعد دُنیا میں بھارت کے کردار کو مرکزی اہمیت دی جائے اور پاک بھارت تنازع اور نیوکلیر معاملات کو اس نئے تعلق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا جائے۔ کشمیر کو پس پشت ڈالا جائے اور دہشت گردی اور اسلامی تشدد پسندی کے خطرات کو اہمیت دی جائے''۔ اسی ٹاسک فورس نے یہ تجویز بھی دی تھی کہ: ''پاکستانی عوام سے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے براہ راست خطاب کیا جائے''۔ جس پر عمل کرتے ہوئے صدر کلنٹن نے پاکستانی عوام سے براہِ راست خطاب کیا۔

صدر کلنٹن کے وفد میں ایک بڑی تعداد امریکی تاجروں' صنعت کاروں' سرمایہ کاروں اور بھارت نژاد امریکی پروفیشنل افراد کی تھی۔ اس ساری کوشش کا ہدف بھارت اور امریکہ کو ایک نئے حلیفانہ رشتے میں باندھنا اور مستقبل کے تعاون اور فیصلہ سازی

کے لیے تعاون اور مکالمے کا ایک نظام بنانا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاکستان اور ان ایشوز کو پس پشت ڈالا جائے جو پاکستان کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ جس کے بارے میں صدر کلنٹن نے اپنے پہلے جنرل اسمبلی کے خطاب میں تشویش کا اظہار کیا تھا' ۴ جولائی کے اعلانیہ میں ''ذاتی دل چسپی'' کا وعدہ کیا تھا۔

تاہم اس جانب پیش رفت کے بجائے اصل مرکزی مسئلہ دہشت پسندی بن گیا اور وہ بھی پاکستان کی ''دراندازیوں'' کی پیداوار کی حیثیت سے۔ چشم زدن میں صدر کلنٹن اور ان کی ٹیم کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو بھی بھول گئے جن کا ذکر خود ان کی تقریروں' خطوط اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور ھیومن رائٹس واچ کی رپورٹوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ کشمیر میں جنگ بندی کے وقت بھارت کی فوج کی تعداد ۱۲ ہزار تھی' جسے مزید کم کرنے کی بات کی گئی تھی۔ آج وہ ۷ لاکھ سے زیادہ ہے جو بھارت کی کل بری فوج کے نصف کے برابر ہے۔ گذشتہ ۱۰ سالوں میں ۷۰ ہزار کشمیری جوان' بوڑھے اور بچے شہید کیے جا چکے ہیں لیکن اس ریاستی دہشت گردی کی کوئی خلش بھی اس دوسرے دور کے بیانات میں نظر نہیں آتی۔

''دستاویز بصیرت'' سے لے کر صدر امریکہ اور ان کے رفقا کی تقاریر کا تجزیہ کیجیے' صاف نظر آتا ہے کہ ڈپلومیسی کی زبان میں وہ اسی کے لگ بھگ بات کہہ رہے ہیں جو بھارت کہہ رہا ہے اور ان سے کہلوانا چاہتا ہے۔ بھارت کی جمہوریت کے قصیدے گائے جا رہے ہیں اور بھارت میں اقلیتوں پر جو ظلم و ستم جاری ہے اس کا کوئی احساس موجود نہیں۔ بھارت میں اس وقت سترہ آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن امریکی صدر کو وہاں نسلی' لسانی اور مذہبی رواداری اور ہم آہنگی ہی نظر آتی ہے۔ دبے لفظوں میں اور بڑی چابک دستی کے ساتھ خود نیوکلیر پالیسی میں بھی تبدیلی کے بیج رکھوائے گئے ہیں۔ بھارت نیوکلیر اسلحہ سے دُنیا کو پاک کرنے کے موقف سے ہٹ کر صرف ''عدم پھیلاؤ'' کی طرف آ گیا ہے' جبکہ امریکہ نے بھارت کے ''سیکورٹی خدشات'' کو بالواسطہ

تسلیم کرلیا ہے اور اسے علاقے ہی میں نہیں عالمی سطح پر قیادت کی اشیرباد دے دی ہے۔
''دستاویز بصیرت'' میں یہ ''بصیرت افروز'' اعلان بھی موجود ہے:

> اکیسویں صدی میں بھارت اور امریکہ علاقائی اور بین الاقوامی سلامتی یقینی بنانے کے لیے باہم ذمہ داری اور مشترک مفاد کی خاطر امن کے لیے ساتھی ہوں گے (partners in peace)۔ ہم ایشیا اور اس سے ماورا اسٹریٹیجک استحکام کے لیے مل جل کر کام کریں گے اور باقاعدہ مشاورت جاری رکھیں گے۔ ہم علاقائی امن کو درپیش چیلنج اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے مشترک کوششوں میں اضافہ کریں گے۔

امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے دورے کے بعد اپنے ایک مضمون میں' جو امریکی اخبارات میں ۴ اپریل ۲۰۰۰ء کو شائع ہوا' فرمایا:

> بھارت میں جمہوری ادارے زندگی سے بھرپور ہیں' بنگلہ دیش میں نشوونما پا رہے ہیں اور پاکستان میں خطرے سے دوچار ہیں--- صدر امریکہ کے بھارت کے دورے کا بنیادی مقصد بھارت کے ساتھ جوہری دھماکوں سے پہلے [مئی ۱۹۹۸ء] کی صورت حال کی طرف پلٹنا نہیں بلکہ بہتر اور کارآمد تعلقات کی راہ ہموار کرنا تھا۔

ہفت روزہ اکانومسٹ' لندن نے اس دورے کے نتیجے کے طور پر بھارت اور امریکہ میں ہم آہنگی اور پاکستان کے لیے اس کے مضمرات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> صدر کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے چھ روزہ دورے کے دوران جو بیش تر بھارت کا تھا امریکہ نے علاقے کے سب سے بڑے تنازعے کے بارے میں بھارت کے نقطہ نظر کا اتنا ساتھ دیا جتنا اس سے پہلے کبھی نہ دیا تھا۔ جناب کلنٹن نے صاف صاف کہا کہ ''بھارت سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کشمیر میں تشدد کی کارروائیاں ختم ہونے سے پہلے پاکستان سے مذاکرات کرے''۔ انھوں نے

قریب قریب اس بات کو تسلیم کیا: ''چونکہ بھارت اپنے حصے کے کشمیر سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا' اس لیے لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد ہو جانا چاہیے''۔ یہ ایسا حل ہے جو بیشتر بھارتی لیکن ابھی تک بہت کم پاکستانی تسلیم کریں گے۔ کچھ پنڈتوں کا دعویٰ ہے کہ امریکہ کی پالیسی میں یہ تبدیلی بھارت کو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی مداخلت کا انتقام لینے پر اکسائے گی۔[6]

بلاشبہ بھارت میں اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ ایشین ایج نے لکھا ہے:

وہ سب کہتے ہیں کہ صدر امریکہ کے دورے نے امریکہ کی دوستی کا توازن پاکستان سے ہٹا کر بھارت کی طرف جھکا دیا ہے۔[7]

پاکستانی قیادت کے لیے سبق

اگر پاکستان کی قیادت اور قوم ان جوہری تبدیلیوں کو نظر انداز کرتی ہے اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی اور موثر حکمت عملی تیار نہیں کرتی تو یہ زندگی اور ترقی کا نہیں' قومی خودکشی کا راستہ ہوگا۔ صدر کلنٹن نے امریکہ کی ترجیحات' دل چسپیوں' مفادات اور منصوبوں سے مطلع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ جس انداز میں کلنٹن صاحب پاکستان کی سرزمین پر نازل ہوئے وہ کسی جاسوسی ناول کا منظر پیش کرتا ہے۔ تقریر اور گفت و شنید کے لیے جو زبان' طریقہ اور انداز اختیار کیا اس سے کوئی پردہ نہیں رہا۔

۶- اکانومسٹ' یکم اپریل ۲۰۰۰ء۔

۷- ایشین ایج' ۱۶ اپریل ۲۰۰۰ء

تصویرکشی تک کے لیے بھی دیے گئے احکام تھے کہ صدر رفیق تارڑ اور منتظم اعلیٰ جنرل پرویز مشرف سے مصافحہ اور ملاقات کی کوئی شبیہ بھی دُنیا کے سامنے نہ آنے پائے۔ جمہوریت کے علم بردار جس طرح جمہور سے دور رہے اور صرف سرزنش اور دھمکیوں کو تکیہ کلام بنایا اس پر تو بجاطور پر ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر بھی یہ سوال زیر بحث آرہا ہے کہ کیا فی الحقیقت اس منظر کی خاطر دورے کا اہتمام کرایا گیا تھا؟[۸]

غالب پر بھی شاید کوئی ایسی ہی قیامت ٹوٹی ہوگی جو وہ پکار اٹھا ؎

رات کے وقت مئے پیے' ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے' پر نہ کرے خدا کہ یوں

پاکستان امریکہ تعلقات' بنیادی سوال

جو سوال اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ کہ ان حالات میں پاکستان کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور وہ کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرے؟

دکھ' افسوس' ندامت' غصہ--- سب بجا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی حالات کا مداوا نہیں کرسکتی۔ ہمارا ردعمل جذباتی اور وقتی حالات کے دباؤ میں نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طبقہ لچک کی باتیں کر رہا ہے اور حقیقت پسندی کے نام پر امریکہ کے نشان زدہ راستے پر کچھ تحفظات اور ظاہری لیپاپوتی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے چلنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ حالات کی نامساعدت' معیشت کی زبوں حالی اور عالمی فضا کی دہائی دے رہا ہے۔ عالمی مالیاتی فنڈ (IMF) اور ورلڈ بنک کے ارادوں کی بھی بات کی جا رہی ہے۔ سی ٹی بی ٹی پر

۸- ملاحظہ ہو ڈان میں ایم ضیاء الدین کا کالم The Clinton Visit' مسعود حیدر کا نیویارک سے مضمون 'The Fall out of Clinton Visit' (۲۱ مارچ)' اور شاہین صہبائی کا واشنگٹن سے مضمون Who Pushed me in the Pool? (۳۰ مارچ ۲۰۰۰ء)۔

دستخطوں' جہاد کشمیر میں نرمی' دینی مدارس پر گرفت اور افغانستان سے کشیدگی کے مشورے بھی دیے جا رہے ہیں۔ ٹریک ٹو ڈپلومیسی کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے اور امریکہ کی carrot and stick پالیسی سے خوف اور طمع دونوں کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

یہ آوازیں اور سرگوشیاں ایک محدود طبقے کی طرف سے سامنے آ رہی ہیں۔ جب کہ قوم کی اکثریت دکھ اور صدمے کے ابتدائی احساس کے بعد بالکل ایک نئے اقدام (initiative) کی متمنی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ قوم ''امریکہ مخالف جذباتیت'' (anti America emotionalism) کا شکار ہوئے بغیر پورے عزم اور احترام سے امریکہ کو یہ پیغام دے دے کہ دوستی اور تعاون کا راستہ کھلا ہوا ہے' لیکن اس کے لیے محکومی اور تابعداری کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ اپنے مفادات کی خاطر معقول روش' اپنانے کا حق رکھتا ہے لیکن ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہونے کے باوجود پاکستان اور اس کے عوام بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی آزادی' سلامتی اور قومی مفادات کی روشنی میں اپنا موقف طے کریں۔

آج پاکستانی قوم جو ہر اعتبار سے کچھ ویسے ہی حالات سے دوچار ہے جو ملت اسلامیہ پاک و ہند کو ساٹھ سال پہلے برطانوی دور میں درپیش تھے۔ برطانوی حکومت' انڈین نیشنل کانگرس اور ہندو اکثریت جمہوریت اور عالمی رائے کے نام پر مسلمانوں کے نظریاتی اور سیاسی تشخص کو نظرانداز کر کے انھیں ایک ایسے سیاسی نظام کے شکنجے میں کسنا چاہتی تھی' جس میں ان کے لیے دائمی محکومی اور محرومی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمان کمزور تھے' غیر منظم تھے' معاشی اعتبار سے پیچھے تھے اور کانگرس نے برملا اعلان کر دیا تھا کہ ہندستان میں دو ہی قوتیں ہیں: انگریز اور کانگرس--- ان دونوں کو مستقبل کے فیصلے کا حق ہے۔

قائداعظمؒ [۱۸۷۶ء-۱۹۴۸ء] اور مسلمانان پاک و ہند نے اس اعلان کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: ''ایک تیسری قوت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان' جن کا اپنا قومی

تشخص ہے--- اور ان کے فیصلے میں شریک ہوئے بغیر اور ان کی رضامندی کے بغیر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں بن سکتا''۔ انگریز اور ہندو دونوں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی آواز بے وقت کی راگنی ہے۔ مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تصورات میں مذہب کی بنیاد پر قومیت ایک عجوبہ ہے۔ نیشنلزم اور جمہوریت ہی وقت کے غالب نظریات ہیں اور مسلمان سیاسی طور پر کمزور اور معاشی اعتبار سے غیر موثر ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے عزم اور قربانی' قائداعظمؒ کی بالغ نظر قیادت اور نظریہ پاکستان کی دل کشی اور تسخیری قوت نے سات سال میں حالات کا نقشہ بدل دیا اور جو بظاہر ناممکن تھا وہ ایک زندہ حقیقت بن گیا۔

مغرب زدہ مقتدر طبقہ

آج بھی ہم ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں انگریز کی اس تہذیبی ذریت نے جو آزادی کے بعد اقتدار پر قابض رہی ہے' تحریک پاکستان کی کامیابیوں پر پانی پھیر دیا۔ قائداعظمؒ کے پاکستان کو دولخت کیا اور جو قوم انگریز اور ہندو دونوں کی غلامی سے آزاد ہوئی تھی' اسے بڑی چابک دستی سے امریکہ کی جھولی میں ڈال دیا اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ آج صدر امریکہ ہمیں پھر بھارت کی بالادستی کے تحت چین کی زندگی اور معاشی ترقی کے سراب دکھانے کی جسارت کر رہے ہیں۔

لیکن ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ ''کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی''--- اس قوم کے جوہر آزمائش ہی میں کھلتے ہیں اور آج ہم ایک ایسی ہی آزمائش سے دوچار ہیں۔

زمانے کے ساتھ چلنے' اور مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر پلٹ جانے کا مشورہ دینے والے دراصل ہمیں غلامی اور محکومی کی طرف لے جا رہے ہیں اور ہمیں حسن ظن ہے کہ غالباً غیر شعوری طور پر فرار کی اس راہ میں زندگی کا پرتو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عزت اور ترقی کا راستہ صرف ایک ہے اور وہ اپنی اصل منزل' اپنے مقصد وجود'

اپنی آزادی اور نظریاتی تشخص کے بارے میں کسی سمجھوتے اور نام نہاد لچک کے جال سے بچنا' زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کر کے محنت' جدوجہد اور قربانی کے ذریعے اپنے مطلوب کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو جانا ہے ۔

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

قرآن کا راستہ

اُمت مسلمہ کی شیرازہ بندی قرآن نے کی ہے اور اس کا پیغام یہی ہے [ترجمہ]:

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے' یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو' نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے' ہم اس دُنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھ ہیں اور آخرت میں بھی (حٰم السجدہ ۴۱:۳۰-۳۱)۔

مشکل وقت میں صبر اور مقابلہ کا حکم دیا گیا [ترجمہ]:

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' صبر سے کام لو' باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ' حق کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے (اٰل عمرٰن ۳: ۲۰۰)۔

بلاشبہ ہمیں ہر معاملے میں اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ ہم حق پر ہیں' لیکن حق کے باب میں کمزوری اور سمجھوتے کا راستہ اختیار کرنا' یہ اہل ایمان کی روش نہیں۔ جس کی بہترین مثال خود اسوہ نبویؐ میں ملتی ہے کہ جب قریش کے دباؤ میں خود ان کے محترم و مکرم چچا حضرت ابو طالب نے سمجھوتے اور لچک کی بات کی تو آپؐ نے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ لوگ میرے سیدھے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں حق کی دعوت پہنچانے سے باز نہیں آؤں گا حتیٰ کہ یہ دعوت کامیاب ہو جائے یا میں اس میں کام

آ جاؤں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

بانیان پاکستان کی رہنمائی

علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اسی اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں زمانے کے ساتھ چلنے کے بجائے زمانے کو بدلنے کی تلقین کی تھی ۔

حدیث بے خبران است کہ بازمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز

ضرب کلیم کے سارے پیغام کا خلاصہ ہی یہ ہے:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست وضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!
خون دل وجگر سے ہے سرمایہ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ!

اور یہی وہ عزم اور رہنمائی تھی جو قائداعظمؒ نے اس قوم کو دی اور اسے کش مکش اور پیکار کے ذریعے آزادی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۲۵ ویں سالانہ اجلاس' لکھنو سے خطاب کرتے ہوئے (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء) فرمایا تھا:

آبرومندانہ تصفیہ صرف برابری رکھنے والے فریقین کے مابین ہو سکتا ہے۔ جب تک دونوں فریق ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے سے خوف زدہ ہونا نہیں سیکھتے' اس وقت تک ان کے درمیان کسی تصفیے کی کوئی مضبوط اساس نہیں ہوتی--- کمزور جماعت کی جانب سے امن کی پیش کش کا ہمیشہ مطلب اپنی کمزوری کا اعتراف اور جارحیت کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ (اندریں حالات)

حب الوطنی' انصاف' ایمان داری اور خیر سگالی کی اپیلیں رائیگاں ہوں گی۔[9]

یہ وہی حکمت عملی ہے جسے قرآن نے وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ (انفال ۸: ۶۰) اور تم لوگ' جہاں تک تمھارا بس چلے' زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلی ضرورت خدا پر بھروسا' اپنے مقاصد اور اہداف کی حقانیت پر یقین' اپنے موقف پر استقامت اور نفس پرستی اور ذاتی مصالح سے بالا ہو کر اس قوم کی آزادی' سلامتی' عزت اور ترقی کے لیے ڈٹ جانے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم اور جدوجہد ہے ؎

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانۂ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

داخلی محاذ پر

اس حکمت عملی کی صحت' صداقت اور افادیت کے بارے میں تو دو رائے ممکن نہیں' البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں پورا کیے بغیر یہ موثر نہیں ہوسکتی۔ دوسروں کی طرف نگاہیں لگانے اور دست سوال دراز کرنے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسا' اپنے اللہ پر بھروسا اور اپنی قوم پر بھروسہ ضروری ہے:

○ اس کے لیے قوم پر اعتماد' اس کو اصل حالات سے آگاہ کر کے جدوجہد پر آمادہ کرنا اور قیادت کی وہ مثال پیش کرنا ضروری ہے جس کا نمونہ ہمارے

9- Speechs, Statements and Messages of Quaid-e-Azam (ed.Khurshid A. Yusufi) Vol, 1, p 651.

آقا اور قائد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔

- اندرونی یک جہتی' اور باہمی آویزشوں اور وقتی اور گروہی مصالح سے بالاتر ہو کر پوری قوم کو خود انحصاری کے حصول اور ایسی معاشی اور عسکری قوت کی تشکیل و تعمیر کے لیے سرگرم کرنا ہے' جو دشمن پر ہماری ہیبت طاری کر سکے۔
- ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور ترقی اس کا ایک پہلو ہے لیکن اس کے ساتھ معاشرتی' ملی یک جہتی' فکری قیادت' تعلیم و تحقیق کے میدان میں اپنا لوہا منوانا بھی ضروری ہے۔
- قوم میں حقیقی اسلامی جہاد کی روح اور اجتماعی زندگی میں انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم اس کا موثر ترین ذریعہ ہے۔
- آج نفرتوں کی جس آگ میں ہم جھلس رہے ہیں اور غربت اور معاشی فساد کے جس جہنم میں آبادی کا بڑا حصہ مبتلا ہے' اس سے نجات ہی ہمیں آزادی اور قومی سلامتی کی حفاظت کے لائق بنا سکتی ہے۔
- جمہوری اداروں کا احیا اور قوم کی معتمد علیہ قیادت کا زمام کار کو سنبھالنا اس عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

آج بھی اس عزم' اسی بالغ نظری اور اسی بے لوث جدوجہد کی ضرورت ہے جو ملت اسلامیہ ہند نے قائداعظمؒ کی قیادت میں ساٹھ سال پہلے کی تھی۔ ان حالات میں فطری طور پر قوم کی نظریں تحریک اسلامی اور ان تمام محب وطن افراد اور قوتوں کی طرف اٹھتی ہیں جن کا دامن ماضی میں کیے جانے والے استحصال' بدعنوانیوں اور بے وفائیوں سے پاک ہے۔ قوم میں آج بھی جان ہے اور ایسے عناصر کی کمی نہیں جو صحیح قیادت فراہم کر سکتے ہیں۔ آزمائے ہوئے انسانوں اور کھوٹے سکوں سے نجات اور نئی' پرعزم' ایمان دار اور باصلاحیت قیادت کو بروئے کار لانا وقت کی اہم ضرورت ہے جو مجوزہ حکمت عملی کی کامیابی کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

فوجی قیادت اور اس کی سول ٹیم کی اب تک کی کارکردگی سخت غیر تسلی بخش ہے لیکن صدر کے امریکہ کے حالیہ دورے اور امریکہ کی سیاست کے نئے رخ نے ایک تاریخی موقع دیا ہے جس سے کسی تاخیر کے بغیر فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے قوم میں اتفاق و اتحاد' تمام اہم عناصر کا ایک مقصد کے لیے تحرک' اور قوم اور فوج میں تعاون' ایک حقیقی طور پر نمایندہ جمہوری نظام کا قیام' اور دفاع اور قومی تعمیرنو دونوں کے تقاضوں کو پورا کرنے والی قیادت کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کا تقاضا اور درپیش چیلنج کا جواب ہے۔ ☆

☆ ترجمان القرآن' مئی ۲۰۰۰ء

امریکہ کے عالمی کردار سے بے زاری

اسباب و عوامل

اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن (یو این ہیومن رائٹس کمیشن) میں نصف صدی تک کلیدی کردار ادا کرنے کے بعد [۲۰۰۱ء کے وسط میں] امریکہ کا بہ یک بنی و دوگوش فارغ کیا جانا محض ایک اتفاقی حادثہ یا صرف ایک سیاسی واقعہ نہیں ہے۔

یہ امریکہ کے عالمی کردار کے بارے میں دُنیا کے دوسرے ممالک میں پائے جانے والے احساسات کا ایک مظہر' عالمی سیاست کے ابھرنے والے رجحانات کی ایک واضح علامت اور طاقت ور ملکوں کے لیے ایک غیر مبہم انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کوئی تنہا (isolated) واقعہ نہیں' بلکہ ایک رخ اور رجحان کا پتہ دیتا ہے جس کا اظہار اقوام متحدہ ہی کے ایک دوسرے اہم ادارے انٹرنیشنل نارکوٹکس کمیشن [عالمی ادارہ تحدید منشیات] سے بھی امریکہ کی فراغت کی صورت میں بھی ہوا ہے۔

اضطراب کی لہریں

صدر امریکہ جارج بش پہلے ہی بیرونی دورے پر نکلے تو انھیں موثر عوامی احتجاج

کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوبک (کینیڈا) میں تمام امریکی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس اور گوڈن برگ (سویڈن) میں ۱۵ یورپی ممالک کے سربراہی اجلاس کے موقع پر ہونے والے عوامی مظاہرے اور ان میں اٹھائے جانے والے ایشوز' امریکہ پر بے اعتمادی اور اس کے سنگ دلانہ رویے اور پالیسیوں سے بے زاری کے منہ بولتے مظاہر تھے۔

صاف نظر آ رہا ہے کہ جو لاوا ایک مدت سے اندر ہی اندر پک رہا تھا' وہ اب اپنے اظہار کے لیے مختلف راستے اختیار کر رہا ہے۔ جو جذبات و احساسات ایک عرصے تک خلش' کسک' انقباض' اور اضطراب کے مرحلے میں تھے' وہ اب اظہار' اختلاف' تنقید اور اس سے بھی بڑھ کر غصے اور بغاوت کی شکلیں اختیار کر رہے ہیں۔ یہ جذبات کسی ایک ملک یا گروہ کے نہیں' بلکہ بڑی حد تک دُنیا کے بیش تر ممالک و اقوام اور سب سے بڑھ کر عام انسانوں کے احتجاج کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ ان جذبات اور ان کے پیچھے کارفرما محرکات کا جائزہ نہ لینا ایک ایسی عظیم غلطی ہے' جس کے صرف وہی لوگ مرتکب ہوتے ہیں جو تاریخ سے سبق لینے کو تیار نہیں ہوتے اور نوشتہ دیوار پڑھنے کی زحمت گوارا کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

۱

امریکہ اور اس کے عالمی کردار کے بارے میں اس احتجاجی لہر کی بڑی وجہ ان لوگوں اور قوموں کے مزاجوں میں کوئی رچی بسی امریکہ دشمنی یا مخاصمت نہیں ہے۔

یہ وہی ملک اور لوگ ہیں جو امریکہ کی طرف بڑی امیدوں سے دیکھتے تھے' اور اسے ایک ایسی طاقت سمجھتے تھے' جو خود عالمی سامراج کے خلاف لڑ کر معرض وجود میں آئی ہے۔ جو عصر حاضر میں جمہوری دستوری ریاست کے دور کا آغاز کرنے والی ہے۔ جس کی فوجوں نے تو عالمی جنگوں میں حصہ لیا ہے مگر خود جس کی سرزمین کسی عالمی جنگ کے

خون سے داغ دار نہیں ہوئی۔ جو بین الاقوامی سیاسی افق پر جمہوریت' حقوق انسانی اور قوموں کے حق خود ارادیت کی علم بردار بن کر جلوہ گر ہوئی۔

ایک ایسی عالمی طاقت سے اتنی مایوسی اور بے زاری اور اتنی تیزی اور شدت سے اس کا ہمہ گیر اظہار نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہوسکتا ہے اور نہ محض کسی سازش کا شاخسانہ۔ اس کے ٹھوس اسباب اور عوامل ہونے چاہییں اور ہیں۔ ان کا سمجھنا امریکہ کی قیادت کے لیے بھی ضروری ہے اور ان اقوام کے لیے بھی' جو احتجاج میں تو شریک ہیں لیکن ان کا مقصد حالات کی اصلاح اور عالمی تصادم کے اسباب و عوامل کا تدارک ہے' تاکہ دُنیا جنگ و جدال اور خون خرابے سے محفوظ رہ سکے۔

بالادستی کا زعم

انسانوں اور قوموں میں' طاقت کا عدم توازن اور وسائل کا غیر متناسب وجود ایک حقیقت ہے۔ محض اس کی وجہ سے اضطراب' اور تصادم ایک غیر منصفانہ اور غیر فطری عمل ہوگا۔ لیکن فرق جب ایک قوت کی دوسروں پر بالادستی' استیلا اور ان کے استحصال (exploitation) کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تو بے زاری اضطراب اور تصادم کے دروازے کھلنے لگتے ہیں جو آخر کار ٹکراؤ اور خون خرابے پر منتج ہوتے ہیں۔ یہی وہ عمل ہے جو امریکہ اور دُنیا کی دوسری اقوام کے درمیان شروع ہو چکا ہے۔ یہ عمل ۱۹۸۹ء میں اشتراکی روس کے ایک سوپر پاور کی حیثیت سے میدان سے نکل جانے کے بعد اور بھی واضح اور تیز ہوگیا ہے۔

امریکہ کے پاس مادی اور قدرتی وسائل کی اتنی بہتات ہے' کہ اپنے باشندوں کے لیے وہ زندگی کی تمام سہولتیں بہ افراط فراہم کرسکتا ہے۔ لیکن عالمی بالادستی کا خواب' دُنیا کی دوسری اقوام کے وسائل حیات کو اپنی گرفت میں لینے کے عزائم' دُنیا کو اپنے تصورات کے مطابق ڈھالنے اور دوسروں پر اپنی اقدار اور نظریے کو بہ زور مسلط کرنے

کے منصوبے ہی دراصل تصادم اور ٹکراؤ کی جڑ ہیں۔ یہ خواہشات دوسری عالمی جنگ کے بعد سے امریکہ کی عالمی حکمت عملی کے اجزا بنتی جا رہی ہیں۔ سرد جنگ کے دور میں آزاد دُنیا کے تحفظ اور اشتراکیت دشمنی کے نام پر ان اہداف کو حاصل کرنے کی سعی کی گئی، لیکن سرد جنگ کے بظاہر خاتمے کے بعد سے یہ لَے اور بھی تیز ہوگئی ہے۔

عالم گیریت، استعماری جبر

اکیسویں صدی کو امریکہ کی صدی اور ساری دُنیا کو امریکہ کے رنگ میں رنگنے کی مہم، جس کا نام ''عالم گیریت'' (globalisation) رکھا گیا ہے، ان حدود میں داخل ہو گئی ہے جہاں ایک طاقت ور ملک انـا و لا غیـری کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر طاقت ور ہونا کافی نہیں رہتا، بلکہ دوسروں پر اپنی طاقت کا رعب جمانا اس کا مقصد بن جاتا ہے، اور قوت کا نشہ کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لانے دیتا۔ یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں دوسری اقوام بھی مجبور ہوتی ہیں کہ اپنی آزادی، اپنی عزت اور اپنی اقدار کے تحفظ کے لیے سینہ سپر ہوں اور 'کنجشک فرومایہ' بھی شاہین نما فرعونیت سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

آج عالمی سیاست ایک ایسے ہی نازک مرحلے کی طرف رواں دواں ہے۔

امریکہ کا واحد عالمی قوت ہونا، ظاہربین نگاہوں میں چاہے ایک حقیقت ہو، لیکن اس واحد سوپر پاور کا دوسروں پر غلبہ حاصل کرلینا اور ان کو اپنا تابع مہمل بنا لینے کی کوشش وہ خطرناک کھیل ہے، جس نے عالمی بساط کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ غلبہ اور جہانگیری کے یہی وہ عزائم ہیں، جن کے حصول کے لیے خارجہ سیاست کے ساتھ فوجی حکمت عملی اور معاشی اثراندازی کا ایک عالم گیر جال اور جاسوسی اور تخریب کاری کا ایک ہمہ پہلو نظام پوری دُنیا کے لیے قائم کیا گیا ہے، اور اسے روز بروز زیادہ موثر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دُنیا کے چالیس ممالک میں امریکی فوجیوں کی موجودگی (تقریباً دو لاکھ سپاہی جو

اعلیٰ ترین بحری اور فضائی فوجی ٹکنالوجی اور آلات حرب وضرب سے آراستہ ہیں)' فوجی معاہدات' معاشی زنجیروں کا جال جو ریاستی اور عالمی مالیاتی وتجارتی اداروں کے ذریعے پوری دُنیا کو اپنے دام میں گرفتار کیے ہوئے ہے' استعماری ایجنڈے کو آگے بڑھانے والے غیر سرکاری اداروں (NGO's) کی فوج ظفرموج جو اس عالم گیر استیلا کا ہراول دستہ ہے اور جاسوسی کا نظام جو صرف سی آئی اے ہی نہیں متعدد بلاواسطہ اور بالواسطہ ایجنسیوں کے ذریعے کام کر رہا ہے--- اس نظام کے دست و بازو ہیں۔

مصنوعی مدمقابل

مقابلے کے لیے کبھی اشتراکیت اور روس کا ہوا تھا' تو کبھی بین الاقوامی دہشت گردی اور سرکش ریاستوں (rogue states) کا ڈراؤنا خواب۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سی آئی اے کو جو مینڈیٹ سرد جنگ کے زمانے میں دیا گیا تھا' وہی آج بھی کارفرما ہے۔۱۹۵۴ء میں وہائٹ ہاؤس کی ایک خفیہ رپورٹ میں کہا گیا تھا:

> اس کھیل کے کوئی قواعد نہیں۔ قواعد کے مطابق کھیلنے کے دیرپا امریکی تصورات پر امریکہ کی بقا کی خاطر ازسرنو غور ہونا چاہیے۔ ہمارے دشمن ہمارے خلاف جو طریقے استعمال کرتے ہیں ہمیں ان سے زیادہ موثر' سوچے سمجھے طریقوں کو ہوشیاری سے استعمال کر کے دشمن کو سبوتاژ کرنا' مٹانا اور تباہ کرنا سیکھنا چاہیے۔[۱]

امریکہ کی موجودہ سیاسی قیادت اور چند دوسری مغربی اقوام کے کارفرما عناصر نے: عوامی جمہوریہ چین' شمالی کوریا' اور چند مسلمان ملکوں--- ایران' لیبیا' سوڈان' حتیٰ کہ چند افراد مثلاً اسامہ بن لادن کو امریکہ اور مغربی دُنیا کے لیے 'اصل خطرہ' بنا کر پیش کرنا

۱- Brave New World Order از جیک نیلسن پال میر' ص ۴۳

شروع کیا اور اس نام نہاد خطرے کے مقابلے کے لیے تباہ کن میزائلوں سے لیس فضائی ڈھال' ''محفوظ علاقوں'' (safe zones) اور بچاؤ کے لیے حملوں تک ہر چیز کے لیے نہ صرف ''جواز'' کی فضا بنا رہے ہیں' بلکہ اربوں ڈالر خرچ کر کے ہر قیمت پر یہ سب کچھ کر گزرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

''سپر پاور'' کا اندازِ گفتگو

صدر جمی کارٹر [۱۹۷۷-۸۱ء] کے قومی سلامتی کے مشیر پروفیسر زبگیو بریزنسکی نے اپنی کتاب The Grand Chessboard میں صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ امریکہ کی خارجہ سیاست کا اصل ہدف ہونا ہی یہ چاہیے کہ اکیسویں صدی میں امریکہ دُنیا کی واحد سوپر پاور رہے اور اس کا کوئی مدمقابل اٹھنے نہ پائے---کم از کم پہلی ربع صدی میں تو میدان صرف امریکہ ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ ان کے الفاظ ہیں:

> یورپ اور ایشیا دُنیا کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہاں امریکہ کی برتری برقرار رہنی چاہیے۔ یہ ناگزیر اور لازم ہے کہ یورپ اور ایشیا میں کوئی ایسی طاقت نہ اُبھرے جو امریکہ کو چیلنج کر سکے۔

یہی وہ ذہنیت ہے جو امریکہ کے پالیسی سازوں اور سیاسی قیادت میں ایک قسم کی رعونت پیدا کر رہی ہے اور فطری طور پر اس رعونت سے باقی دُنیا میں مایوسی اور بے زاری کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ صدر کلنٹن کے دورِ حکومت میں امریکی وزیر خارجہ میڈیلین البرائٹ نے کسی تکلف اور تردد کے بغیر امریکہ کی اس ذہنیت اور اس کے عزائم کا ان الفاظ میں اعلان کیا تھا:

> ہمیں طاقت استعمال کرنا پڑتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم امریکہ ہیں۔ ہم نوعِ انسانی کے لیے ایک ناگزیر قوم ہیں۔ ہم بلند ہیں' ہم مستقبل میں دُور تک

دیکھتے ہیں۔[۲]

واحد عالمی قوت ہونے کا زعم باطل ہی وہ چیز ہے، جس نے امریکی قیادت میں اس رعونت اور فرعونیت کو جنم دیا ہے۔ اس کی ایک چشم کشا مثال وہ الفاظ ہیں، جن میں اپنی حیثیت کا اظہار امریکی صدر لنڈن بی جانسن [۱۹۶۳-۶۹ء] نے قبرص کے تنازع کے موقع پر یونان کے سفیر سے کیا۔ یونان امریکہ کا ایک دوست ملک اور نیٹو میں اس کا رفیق کار ہے۔ جب یونان کے سفیر گیرانینوز گیگ نیٹس (Geraninos Gigantes) نے امریکہ کا حکم نہ ماننے کے لیے اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی پارلیمنٹ اور اپنے دستور کے حوالے سے التجا کے لہجے میں بات کی تو صدر امریکہ جانسن طیش میں آ گئے اور انھوں نے گالی دے کر یونانی سفیر سے کہا:

> بھاڑ میں جائے تمھاری پارلیمنٹ اور جہنم رسید ہو تمھارا دستور--- امریکہ ایک ہاتھی ہے اور قبرص ایک چھوٹا سا پسّو۔ اگر یہ پسّو ہاتھی کو تنگ کریں گے تو ہاتھی کی سونڈھ انھیں کچل دے گی۔ مسٹر سفیر! ہم بہت سارے امریکی ڈالر یونان کو دیتے ہیں۔ اگر تمھارے وزیراعظم مجھ سے جمہوریت، پارلیمنٹ اور دستور کی بات کرتے ہیں تو یاد رکھو، وہ ان کی پارلیمنٹ اور ان کا دستور زیادہ دیر باقی نہیں رہیں گے۔[۳]

ذرا مختلف پس منظر میں، لیکن اسی ذہنیت کا مظاہرہ امریکہ کے چیف آف اسٹاف جنرل کولن پاول (اور اب اس کے وزیر خارجہ) نے بار بار کیا ہے، جن دنوں امریکہ نے بین الاقوامی قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے پانامہ پر، جو ایک آزاد ملک ہے، فوج کشی کی،

۲- کالمیر جانسن، (Blowback: The Costs and Consequences of American Empire ص ۲۱۷

۳- بہ حوالہ I Should Have Died از فلپ ڈین، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۳-۱۱۸

اس کے صدر کو اغوا کیا اور سزا دی تو اعتراض کرنے والوں کے جواب میں جنرل پاول نے کہا تھا:

> ہمیں کنکر کو اپنے دروازے سے یہ کہہ کر باہر پھینکنا ہے کہ یہاں سوپر پاور رہتی ہے۔[۴]

پاکستان کے دو چار جوہری بموں پر اپنی برہمی کا اظہار بھی امریکہ اسی ذہنیت سے کرتا رہا ہے۔ پاکستان کی سفیر سیدہ عابدہ حسین سے جو گفتگو جنرل پاول نے کی تھی وہ نوٹ کرنے کے لائق ہے۔ امریکہ سے حال ہی میں شائع ہونے والی جوائس ڈیوس کی کتاب Between Jihad and Salam میں ان کا انٹرویو شامل ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے:

> جنرل پاول نے مجھ سے پوچھا: ''پاکستان، امریکی اعتراضات اور مالی امداد ختم کر دینے کے باوجود اپنے جوہری پروگرام پر اتنا مصر کیوں ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ یہ بم ناقابل استعمال ہیں تو آپ انھیں کیوں رکھنا چاہتی ہیں''۔
>
> میں نے کہا: ''جنرل، آپ کیوں ایٹم بم رکھتے ہیں؟''
>
> جنرل پاول نے کہا: ''ہم کم کر رہے ہیں''۔
>
> میں نے پوچھا: ''کتنے سے کتنے، جنرل؟''
>
> پاول نے جواب دیا: ''چھ ہزار سے دو ہزار''۔
>
> میں نے کہا: ''جنرل، آپ دو ہزار بم رکھیں گے اور چاہتے ہیں کہ ہمارے جو چند برے بھلے زمین میں دفن ہیں ہم ان سے بھی فارغ ہو جائیں۔ آپ تو ہم سے خودکشی کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ ہم ایک جوہری ریاست کے پڑوس میں ہیں۔ کیا اگر کینیڈا اور میکسیکو کے پاس بم ہوں تو آپ اپنے بم ختم کر دیں

۴- Brave New World Order، ص ۸۷۔

گے؟ کیا آپ ایسا کریں گے؟''

جنرل پاول نے میری طرف دیکھا اور کہا: ''دیکھیے سفیر صاحب' میں اخلاقیات کی بات نہیں کر رہا ہوں' میں آپ سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہیں اور آپ پاکستان ہیں''۔

میں نے کہا: ''جنرل' آپ کا شکریہ کہ آپ نے ایمان داری سے بات کی''۔

اپنے اقتدار کے نشے میں بدمست ہونا' دوسروں کو خاطر میں نہ لانا' ہر کسی کو اپنے مقابلے میں حقیر سمجھنا اور خود پسندی' تکبر اور زعم میں مبتلا ہو کر دوسروں کی تضحیک کرنے کا عمل' انسان کے وقار کو بڑھاتا نہیں' کم کرتا ہے۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

نہ اعتدال گوارا' نہ اخلاق قبول

صدر جارج بش نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایک امید افزا بات کی تھی' جسے ساری دُنیا میں سراہا گیا تھا یعنی:

اگر ہم ایک مغرور قوم ہوں گے تو دُنیا کے لوگ ہم سے ناراض ہوں گے' لیکن اگر ہم ایک منکسر المزاج لیکن مضبوط قوم ہوں گے تو وہ ہمیں خوش آمدید کہیں گے۔

لیکن صدارت کے تخت پر براجمان ہوتے ہی ان کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ امریکی براعظم کے ممالک ہوں یا یورپ اور ترقی پذیر ممالک--- پھر وہی حکمرانی کی زبان استعمال کی جارہی ہے۔ تنہا پرواز کا شوق اور دُنیا کو اپنے مفادات اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کے عزائم کا برملا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جن کثیر قومی کارپوریشنوں کی تائید سے وہ برسرِ اقتدار آئے' انھی کے ایجنڈے کو پورا کرنے کو اولیت دی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی

معاہدوں کی یک طرفہ تنسیخ یا ان کی پابندیوں سے اپنے آپ کو بلا جواز آزاد کر لینے کے دعوے کیے جا رہے ہیں۔ ABM (اینٹی بیلسٹک میزائل ٹریٹی) جو ایک بین الاقوامی قانون کے تحت ایک عالمی معاہدہ ہے اور جس کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء سے اب تک دُنیا ایٹمی ہتھیاروں اور میزائل کے خطرات سے بچی رہی ہے اس سے یک طرفہ گلوخلاصی کی راہ اختیار کی جارہی ہے۔ ماحولیات کے حوالے سے عالمی سطح حرارت کے بارے میں کیوٹا معاہدے سے برأت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

اسلحہ کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے نام نہاد 'سرکش ریاستوں' کے ہاتھوں میں ایٹمی ہتھیار آ جانے اور ان کے امریکہ کے خلاف استعمال کو ایک خیالی خطرہ باور کرایا جا رہا ہے۔ اس کے سدباب کے لیے روس' چین اور یورپی ممالک تک کو ناراض کر کے ۱۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ کے صرفے سے ایک ناقابل اعتبار ''میزائلوں کی ڈھال'' (missile sheild) بنانے کا پروگرام اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس طرح دُنیا کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ اصل فیصلہ کرنے والی قوت صرف امریکہ ہے' باقی ممالک کا کام فقط اس کی ہاں میں ہاں ملانا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے ماضی میں بھی امریکہ کے خلاف بے اعتمادی اور بے زاری کے جذبات پیدا کیے ہیں اور آج بھی عالمی رائے عامہ میں جو امریکہ مخالف رجحان بڑھ رہا ہے اس کے پیدا کرنے میں اس کا بڑا دخل ہے۔ یہ چیز امریکی ہیئت مقتدرہ کی ذہنیت کا ایک حصہ بن گئی ہے۔

امریکہ اپنے آپ کو ہر قانون' دستور' معاہدے اور بین الاقوامی کنونشن سے بالا سمجھتا ہے--- قانون صرف دوسروں کے لیے ہے' سوپر پاور کے لیے نہیں۔ جارج آرول نے روس کے آمرانہ نظام پر جو طنزیہ ناول جانوروں کا باڑہ (Animal Farm) لکھا تھا 'اس کا یہ تاریخی جملہ جس طرح روسی کیمونسٹ آمر جوزف اسٹالن [م: ۱۹۵۳ء] اور لیونڈ بریژنیف [م:۱۹۸۱ء] کے نظام پر صادق آتا تھا' اسی طرح وہ آج امریکہ کے طرزِ عمل کا بھی غماز ہے:

All animals are equal, but some animals are more equal

سب جانور برابر ہیں لیکن کچھ جانور زیادہ ہی برابر ہیں!

امریکی ذہنیت' گھر کی گواہی

امریکہ کے ایک سابق اٹارنی جنرل رمزے کلارک نے اس ذہنیت کا پردہ متعدد مثالیں دے کر چاک کیا ہے۔ ان کی کتاب: The Fire This Time کا اصل موضوع: ''خلیج کی جنگ'' اور اس علاقے کے بارے میں امریکی جرائم ہیں (مطبوعہ نیویارک ۱۹۹۴ء)' لیکن اس کتاب میں امریکہ کی وہ ذہنیت کھل کر سامنے آتی ہے جس نے عالمی سطح پر بے زاری کو فروغ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ' امریکہ جب چاہتا ہے اپنی مرضی سے بین الاقوامی قانون کی کھلی کھلی خلاف ورزی کرتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا احتساب کر سکے:

امریکہ نے گریناڈا پر حملہ کیا' دیہاتوں پر بم باری کی اور افریقہ' ایشیا اور وسطی امریکہ کے اقوام متحدہ کے ممبروں کے خلاف فوجی کارروائیوں کی حمایت کی۔ جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل نے احتجاج تو کیے مگر کوئی عملی کارروائی نہ کی۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ء کو امریکہ نے پانامہ پر حملہ کیا۔ سیکڑوں غالباً ہزاروں افراد مارے گئے۔ یہ حملہ کویت پر عراق کے حملے سے آٹھ ماہ سے بھی پہلے ہوا تھا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس کی مذمت کی۔ کوئی عملی اقدام نہ کیا گیا' حالانکہ امریکہ نے ان تمام عالمی قوانین کی خلاف ورزی کی جن کی عراق نے کویت پر حملہ کرتے ہوئے کی تھی' بلکہ مغربی نصف کرّے اور پانامہ نہر کے متعدد معاہدات کی بھی خلاف ورزی کی۔

امریکہ نے اس برس جب فلسطینی نسبتاً مساوی حیثیت میں معاملہ کر سکتے تھے'

اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کانفرنس نہیں ہونے دی۔ پھر اقوام متحدہ سے بے نیاز ہو کر معاہدے کو اچانک بالجبر تھوپنا چاہا۔ یہ بنیادی طور پر غیر منصفانہ مذاکرات امن کے لیے کوئی امید فراہم نہیں کرتے۔

فلسطینی اپنے مذاکرات کار کا انتخاب تک نہیں کر سکتے' کیونکہ اسرائیل ان کے کسی منتخب فرد کو ویٹو کر سکتا ہے۔ مذاکرات کے ہر دن اسرائیلی' فلسطینیوں کی نئی زمین پر قبضہ کرتے ہیں' ان کے مکانات طاقت کے زور پر خالی کراتے ہیں اور ان کے علاقوں میں اپنے مکانات تعمیر کرتے ہیں۔ امریکہ نے جینوا میں حقوق انسانی کمیشن سے اپیل کی کہ فلسطین کے خلاف اسرائیل کی حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کو نظرانداز کر دے۔ [یہ وہی کمیشن ہے جس سے مئی ۲۰۰۱ء میں امریکہ خارج ہو گیا ہے]۔[5]

قانون شکنی کا ذوق

رمزے کلارک نے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ کس طرح امریکہ نے اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ ۲۴ اور دفعہ ۴۳ کو بالائے طاق رکھ کر محض دھونس اور دھاندلی بلکہ کھلی رشوت کے ذریعے قرارداد ۶۷۸ منظور کرائی' اور چارٹر کے واضح احکام (کہ اقوام متحدہ کے تحت مشترک فوج کی کمان اقوام متحدہ کے نمایندے کے پاس ہوگی) کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خود کمان سنبھال لی۔ پھر امریکہ اور برطانیہ نے گٹھ جوڑ کر کے مسلسل من مانیاں کیں اور کر رہے ہیں۔ اس وقت کے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے احتجاج کے باوجود کوئی بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکا۔[6] اس پورے عرصے میں امریکہ نے چارٹر

۵- رمزے کلارک The Fire This Time' نیویارک ۱۹۹۴ء' ص ۱۵۰-۱۵۱

۶- ایضاً' ص ۱۵۵-۱۶۳

کے مطابق سلامتی کونسل کو کبھی رپورٹ تک نہیں دی۔ اس پورے عمل میں صرف اقوام متحدہ کے چارٹر کی نہیں بلکہ خود امریکہ کے قومی دستور کی بھی کھلی خلاف ورزی کی گئی، جس کے تحت کانگرس، جنگ کا اعلان کر سکتی ہے لیکن ایک قرارداد کے ذریعے صدر امریکہ نے اس سے یہ اختیار لے لیا اور پھر کانگرس کو اعتماد میں لیے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔[7]

عین اس دن [۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء] جب امریکی فوجیں عراق پر حملہ کر رہی تھیں ٹیکساس سے امریکی کانگرس کے رکن ہنری گونزالیز نے صدر جارج بش کے خلاف دستور کی اس خلاف ورزی پر تحریک مواخذہ پیش کر دی تھی، مگر جنگ کے جنون میں وہ آگے نہ بڑھ سکی۔

امریکہ اس بات کا بھی مدعی ہے کہ امریکہ کی کانگرس کسی بھی بین الاقوامی قانون، یا معاہدے کو منسوخ کر سکتی ہے یا اس میں ترمیم کر سکتی ہے۔ اس کے قانون کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا لیکن وہ جس قانون یا معاہدے میں جو ترمیم چاہے، تبدیلی یا تحفظات کا اضافہ کر سکتی ہے۔ رمزے کلارک نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> امریکہ کے پالیسی ساز یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ کانگرس کسی بھی بین الاقوامی قانون کو نظرانداز کر سکتی ہے، منسوخ کر سکتی ہے، تبدیل کر سکتی ہے یا اس میں ترمیم کر سکتی ہے۔ یہ عالمی برادری سے ایک طرح کا اعلان آزادی ہے اور ایک تنبیہ ہے کہ وہ کسی ایسے بین الاقوامی ضابطے کا پابند نہیں ہوگا جو کانگرس کو پسند نہیں ہے۔[8]

اس طرح عالمی عدالت کے بارے میں بھی امریکہ کا رویہ خود پسندی اور اپنی بالادستی کا ہے۔ رمزے کلارک نے بتایا ہے:

> جب کہ اقوام متحدہ کے ممبر ممالک، چارٹر کے تحت قائم شدہ عالمی عدالت

۷- ایضاً، ص ۱۵۶-۱۶۱ ۸- ایضاً، ص ۱۶۶

انصاف کے فیصلوں کی پابندی کرتے ہیں' طاقت ور اقوام کے لیے یہ پابندی بیش تر ان کی مرضی کا معاملہ ہوتی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال وہ تھی' جب نکاراگوا کی حکومت نے امریکی جارحیت کے نقصانات کے ازالے کا دعویٰ کیا' امریکہ نے عدالت کے دائرہ اختیار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکہ نے نکاراگوا کو براہِ راست حملوں اور جنگی کارروائیوں کا نشانہ بنایا اور سخت اقتصادی پابندیاں عائد کیں۔ ایک مصنوعی حزب اختلاف کھڑی کرنے اور جمہوری اصول و ضوابط کی تحقیر کرتے ہوئے انتخابات کو 'سرقہ' کرنے پر تقریباً ۴۸ ملین ڈالر خرچ کیے۔[9]

امریکی صدر کے بارے میں رمزے کلارک نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ ہے:

ایسا شاہی صدر جو جمہوری قوانین اور راے عامہ کا پابند نہ ہو' بین الاقوامی قوانین کی جیسی چاہے تعبیر کرے' اعلان جنگ کرنے کے اس کے من مانے فیصلوں پر کوئی قدغن نہ ہو' اور کسی دشمن کو تباہ کرنے کے لیے فوجی طاقت کا من مانا استعمال کرے۔

ان حالات میں عالمی امن اور بین الاقوامی قانون کا حشر کیا ہوگا' اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ رمزے کلارک کے بقول:

امریکہ کے خارجہ پالیسی ساز جس بین الاقوامی قانون پر عمل کرتے ہیں' وہ اصول و ضوابط کا کوئی مربوط مجموعہ نہیں ہے۔ اس میں وہی ہوتا ہے جو ان کے لیے پسندیدہ ہو۔ ایسے اصول جو مکمل طور پر سیاست زدہ ہوں اور امتیازی اقدامات پر مشتمل ہوں--- امریکی حکومت کا موقف ایسی طاقت کے عزم کا عکاس ہے جو کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔[10]

۹- ایضاً' ص ۱۶۶-۱۶۷ ۱۰- ایضاً' ص ۱۶۸

رمزے کلارک نے لیبیا اور عراق کے سربراہان مملکت کو قتل کرنے کے امریکی اقدام کو بین الاقوامی قانون (ہیگ ریگولیشن آرٹیکل ۲۳) اور خود امریکی قانون (صدارتی حکم نامہ ۱۲۳۳۳) کی کھلی اور مجرمانہ خلاف ورزی قرار دیا ہے' کیونکہ یہ دونوں کسی بھی ملک کے سربراہ کے قتل کو' خواہ یہ اقدام عالم جنگ میں کیا گیا ہو' قانونی جرم قرار دیتے ہیں۔[۱۱]

۲

یہ اسی ذہنیت کا مظہر ہے کہ امریکہ نے عالمی فوج داری عدالت کے معاہدے کو ابھی تک قبول نہیں کیا' کیونکہ اس کے تحت کسی بھی ملک کے مجرم پر بین الاقوامی قانون کے تحت مقدمہ بھی چلایا جا سکتا ہے اور انسانیت کے خلاف جرائم پر گرفت ہو سکتی ہے۔ جب کہ امریکہ کا دعویٰ ہے کہ یہ عدالت صرف ان مجرموں پر مقدمہ چلانے کی مجاز ہو گی' جنھیں امریکہ یا اس کی کانگرس مجرم قرار دے۔ نیز یہ بھی ایک امریکی دعویٰ ہے کہ اقوام متحدہ کے تحت کوئی بھی مشترک فوج بنے تو اس کی سربراہی ہمیشہ امریکیوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ امریکہ کی ایک سرکاری دستاویز pp-25 میں جو کلنٹن دور میں جاری کی گئی' صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

> صدر امریکی افواج پر پوری کمانڈ رکھتا ہے اور کبھی اس سے دست بردار نہیں ہوگا۔ ہر صورت حال پیش آنے پر صدر' سلامتی کونسل کے فیصلے کے تحت اقوام متحدہ کی کارروائی کے لیے اقوام متحدہ کے باضابطہ کنٹرول میں امریکی فوج دینے پر غور کرے گا۔ جتنا امریکہ کا فوجی کردار زیادہ ہوگا' اتنا ہی اس کا امکان

۱۱۔ ایضاً' ص ۱۷۱

امکان کم ہوگا کہ امریکہ امریکی افواج پر اقوام متحدہ کی کمان پر رضامند ہو۔ ایسے امن مشن جن میں لڑائی کا امکان بھی ہو' ان میں امریکی افواج کی شرکت بالعموم امریکہ کی کمان اور نگرانی میں ہونا چاہیے۔[12]

یعنی متحدہ فوج ہو یا اقوام متحدہ کی مرتب کردہ مشترکہ فوج' کمان امریکہ کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ جنرل ڈیوٹ ڈیوڈ آئزن ہوور [بعدازاں صدر امریکہ: ۶۱-۱۹۵۳ء] اور جنرل میک آرتھر [م: ۱۹۶۴ء] سے لے کر کوسووا اور بوسنیا امن فورس' تک ہر جگہ امریکہ کا اصرار رہا ہے کہ کمانڈ اس کے پاس ہو اور دوسروں نے مجبوراً امریکہ کی اس ضد کے آگے سرِتسلیم خم کیا ہے۔

من مانی پہ اصرار کیوں؟

اس ذہن' ان عزائم اور ان مطالبات کے ساتھ امریکہ دُنیا میں جمہوریت کا علم بردار' حقوق انسانی کا محافظ' قانون کی مساوات اور پاس داری کا داعی اور انصاف کا پرچارک بنتا ہے--- اور اسٹریٹجی کا ہدف یہ ہے کہ پوری دُنیا کو امریکہ کے وژن اور اقدار کو قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن یہی تو وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر امریکہ اور باقی دُنیا میں مغائرت پیدا ہو رہی ہے اور جو دراصل سامراجیت کی روح ہے۔

امریکہ کی ٹفٹس یونی ورسٹی میں علم سیاسیات کے پروفیسر ٹونی اسمتھ نے ایتھکس اینڈ انٹرنیشنل افیرز کے شمارے (مئی ۲۰۰۱ء) میں اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ نہ امریکہ کی طاقت غیر محدود ہے اور نہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ اپنے نظام اور اقدار کو دوسروں پر مسلط کرے۔ کیونکہ یہ لبرل امپریلزم کی ایک شکل ہے جس کا کوئی جواز نہیں:

دوسرے لوگوں میں امریکی اقدار کی ترویج پر دوسرا اعتراض بھی شدید ہے۔

۱۲- ملاحظہ ہو کارنیگی انسٹی ٹیوٹ کا رسالہ "Ethics & International Affairs" ج ۱۴' ص ۶۰' مئی ۲۰۰۱ء

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو ثقافت' ادارے اور ہیئتیں رائج ہوتی ہیں وہ شمالی امریکہ اور مغربی یورپ میں رائج انسانی حقوق اور لبرل ڈیموکریسی کی راہ میں خود مضبوط رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو امریکی طرز حیات' اقدار اور اداروں کو روبہ عمل لانے کی کوشش میں ناکامی کا اندیشہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ امریکی طاقت محدود ہے' بلکہ اس لیے کہ بڑے پیمانے پر اس کا استعمال بھی ان عقائد اور طریقوں میں اصلاح نہ کر سکے گا جو بنیادی طور پر امریکی طریقہ کار کے مخالف ہیں۔ چین' مسلم دُنیا یا روس کا امریکی مطالبوں کے آگے سپر ڈالنے کے لیے آمادہ ہونے کا کیا امکان ہے۔[۱۳]

معروف امریکی مفکر والٹر لپ مین نے بڑی پتے کی بات کہی ہے:

جب ایک قوم ساری دُنیا کے نظام کو یکساں شکل دینے کی ذمہ داری خود سنبھال لے تو یہ دوسروں کو اپنے خلاف متحد ہونے کی دعوت ہے۔ ایک ایسی دُنیا میں جہاں اس کا امکان ہے کہ جوہری اسلحہ صدی کے اختتام سے پہلے وسیع پیمانے پر تقسیم ہو' یہ امریکی عوام کی قومی سلامتی کے لیے کوئی خوش کن راستہ نہیں ہے۔[۱۴]

رچرڈ بارنیٹ نے اپنی کتاب اس جملے پر ختم کی ہے:

امریکہ اپنی موجودہ عظیم طاقت کو دُنیا میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے جس میں غریب اقوام ترقی کے من پسند راستے اختیار کر سکیں۔ مگر جب تک امریکی یہ خام خیالی نہ چھوڑ دیں کہ دُنیا بھر میں تبدیلی لانا ان کا حق اور فرض ہے' خود امریکیوں کو بھی امن نصیب نہیں ہو سکتا۔[۱۵]

۱۳- ٹونی اسمتھ' ایضاً۔ مئی ۲۰۰۱ء

۱۴- بہ حوالہ رچرڈ بارنیٹ Intervention & Revolutions ۱۹۷۲ء' ص ۳۱۲

۱۵- ایضاً' ص ۳۳۲

جمہوریت کا نام‘ شہنشاہیت پہ اصرار

ہماری نگاہ میں امریکہ پر بے اعتمادی اور اس کی مخالفت کا پہلا اور سب سے اہم سبب دُنیا کے ممالک میں کوئی خرابی یا مرض نہیں‘ امریکہ کا یہ زعم ہے کہ وہ واحد سوپر پاور ہے اور ہمیشہ سوپر پاور ہی رہے گا۔ اس کا حق ہے کہ دُنیا اس کے سامنے جھکے اور اس کی بالادستی قبول کرے۔

دُنیا اسے ایک بڑی طاقت‘ اس کے زمینی حقائق کے مطابق ضرور تسلیم کرے گی‘ مگر اس کے آگے سجدہ ریز ہونے کے لیے کبھی تیار نہ ہوگی۔ وہ اس سے دوستی کا تعلق بہ خوشی رکھے گی‘ مگر غلامی اور چاکری کا مقام کبھی قبول نہیں کرے گی۔ اگر امریکہ تھوڑی سی حقیقت پسندی قبول کر لے اور بالادستی اور شہنشاہی کی حکمت عملی کو ترک کر دے تو اس کی عزت و وقار میں اضافہ ہوگا۔ اگر حقوق انسانی کے کمیشن کے انتخابی نتائج سے سبق سیکھتے ہوئے وہ تکبر اور رعونت کے راستے کو ترک کر دے تو دُنیا اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی ایک بہتر جگہ بن سکتی ہے۔

امریکہ سے دُنیا کی بیزاری کے اسباب کو سمجھنے کے لیے امریکہ کو خود اپنے رویے اور اپنے وعدوں اور عمل کے فرق پر غور کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی چشم کشا کتاب Blowback: The Costs and Consequences of American Empire ۲۰۰۰ء شائع ہوئی ہے (بلـــوبیک سی آئی اے کی اصطلاح ہے‘ جس کا مفہوم امریکی عوام کی لاعلمی میں کیے جانے والے اقدامات کا ردِّعمل ہے۔ اس کا ترجمہ مکافات کیا جا سکتا ہے)۔ اس کے مصنف کالمیر جانسن‘ یونی ورسٹی آف کیلی فورنیا‘ سان ڈیاگو (امریکہ) کے پروفیسر اور جاپان پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ ہیں۔ یہ کتاب امریکہ اور برطانیہ سے بہ یک وقت مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے امریکہ کو اپنے رویے پر غور کرنے کی دعوت دی ہے اور تقریباً وہی بات کہی ہے جو باقی

دُنیا کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کی زبان پر ہے:

مجھے یقین ہے کہ غیر متعلق اسلحے کے سسٹم پر ہمارے وسائل کا غیر معمولی ضیاع' عسکری ''حادثوں'' کا مسلسل جاری رہنا اور امریکی سفارت خانوں اور چوکیوں پر دہشت گرد حملے اکیسویں صدی میں امریکہ کی غیر رسمی سلطنت کے لیے بحران پیدا کرنے والے عناصر ہیں۔ ایسی سلطنت جو دُنیا کے ہر حصے پر فوجی طاقت کے دباؤ اور اپنی شرائط' مگر دوسروں کی قیمت پر امریکی سرمائے اور منڈی کو استعمال کر کے عالمی اقتصادی اتحاد قائم کرنا چاہتی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو ضمیر کی کسی خلش سے بھی آزاد کر لیا ہے' کہ ہم اس دُنیا کے دوسرے لوگوں کو کتنے برے نظر آ رہے ہیں۔ بیش تر امریکی غالباً جانتے ہی نہیں کہ واشنگٹن کس طرح اپنی بالادستی استعمال کرتا ہے' کیونکہ اس سرگری کا کافی حصہ خفیہ طور پر یا دوسرے بہانوں کے پردے میں انجام پاتا ہے۔ بہت سوں کو یہ یقین کرنے میں دقت پیش آئے گی کہ دُنیا میں ہماری حیثیت ایک سلطنت کی سی ہوگئی ہے۔ لیکن جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ملک خود اپنی بنائی ہوئی سلطنت کا اسیر ہو گیا ہے تو ہمارے لیے دُنیا کے بہت سے واقعات کی تشریح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جاپان میں سرکاری رہنمائی اور سرپرستی میں نصف صدی تک ہونے والی ترقی کے بعد سب کچھ غلط کیوں ہو گیا ہے؟ ایک مضبوط چین کے ظہور سے کسی کو کیا نقصان ہے؟ حقوق انسانی' جوہری پھیلاؤ' دہشت گردی اور ماحول کے بارے میں غیر ملکیوں کو امریکی پالیسیاں تضاد اور ژولیدگی کا شکار کیوں نظر آتی ہیں؟[۱۶]

۱۶- کالمیر جانسن Blowback: The Costs & Consequences of American Empire ص ۷' ۸

شاہانہ ''سچ'' کا نتیجہ

کالمیر جانسن نے امریکہ کی پچاس سالہ سیاست کا مکمل دستاویزی نظائر اور حوالوں کے ساتھ پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ وسطی اور جنوبی امریکہ کی ریاستوں سے لے کر ویت نام' چین' جاپان تک ایک ایک دور اور ایک ایک واقعے سے پردہ اٹھایا ہے۔ کس طرح فوج' سی آئی اے' کثیرقومی کمپنیاں اور عالمی مالیاتی ادارے دُنیا کے ہر کونے میں امریکی حکومت کے ایما پر اور اس کے مفاد میں دوسروں کے معاملات میں دراندازیاں کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ کس طرح بین الاقوامی قانون اور ضابطوں کو پامال کیا گیا ہے' پوری پوری قوموں کو تباہ کیا گیا ہے۔ کن کن طریقوں سے ڈکٹیٹروں کی سرپرستی کی گئی ہے' کس طرح کرپشن کے آلہ کار کو استعمال کیا گیا ہے اور مخالفوں کو میدان سے ہٹایا گیا ہے۔ کن ہتھکنڈوں سے جمہوریتوں کا خون کیا گیا ہے اور من پسند فوجی اور سول کاسہ لیسوں کو مسندِ اقتدار پر براجمان کیا گیا ہے۔ یہ سب سیاہ داستانیں اب ان سرکاری دستاویزات سے ثابت ہوتی ہیں' جو رازداری کے قانون کی مدت ختم ہو جانے سے شائع کی جارہی ہیں اور ان میں بھی ۱۳.۵ فی صد دستاویزات ایسی ہیں جو اب بھی قومی سلامتی کے نام پر روک لی گئی ہیں۔ اس ساری تفصیل کو بیان کرنے کے بعد مصنف نے بتایا ہے:

> ان حالات میں انسانی حقوق یا دہشت گردی کے بارے میں بظاہر بہت اچھے نظر آنے والے بیانات کو بھی امریکہ کے 'گندے ہاتھ' ریاکارانہ بنا دیتے ہیں۔ مکافات (blow back) دوسری اقوام پر اثرانداز ہوتا ہے لیکن اس کے گھن لگنے کے اثرات امریکہ پر سیاسی مباحث کو بے قدر کرنے اور شہریوں کو بے وقوف بنانے کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں' اگر وہ شہری اپنے سیاسی لیڈروں کے بیانات کو سنجیدگی سے لیں۔ یہ ناگزیر نتیجہ صرف مکافات کا نہیں

بلکہ خود سلطنت کا ہے۔[17]

کالمیر جانسن نے پوری امریکی قوم کو متنبہ کرتے ہوئے کہا ہے:

اپنی تعریف کی رُو سے دہشت گردی بے گناہوں کو ہدف بناتی ہے تاکہ جو حملوں سے محفوظ بیٹھے ہیں ان کی غلط کاریوں کی طرف توجہ دلائی جاسکے۔ حالیہ عشروں میں جو استعماری مہم جوئیاں ہو رہی ہیں' اس کی فصل اکیسویں صدی کے بے گناہ غیر متوقع تباہیوں کی صورت میں کاٹیں گے۔ اگرچہ بیشتر امریکی بڑی حد تک ناواقف ہیں کہ ان کے نام پر کیا کچھ کیا گیا تھا اور کیا جارہا ہے' وہ اس کی انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کوششوں کی گراں قیمت ادا کریں گے جو ان کی قوم نے عالمی منظر پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کی ہیں۔ اس سے پہلے کہ بے مہار فاتحانہ اقدامات اور پروپیگنڈے سے نقصان قابو سے باہر ہو جائے' ہمیں سرد جنگ کے دوران اور اس کے بعد اپنے عالمی کردار پر نئے مباحث کو اہمیت دینا چاہیے۔[18]

امریکہ کو خود احتسابی کی دعوت دیتے ہوئے کالمیر جانسن نے یاد دلایا ہے:

امریکی افسران اور میڈیا عراق اور شمالی کوریا جیسی سرکش ریاستوں کے بارے میں بہت کچھ کہتے ہیں لیکن ہمیں خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کہیں امریکہ خود تو ایک سرکش سپر پاور نہیں بن گئی ہے۔[19]

مصنف نے لاس اینجلز ٹائمز کے کالم نگار ٹام پلیٹ کا ایک جملہ دہرایا ہے کہ امریکہ ایک ایسی سوپر پاور بن گئی ہے جس کا حال یہ ہے کہ دماغ کی جگہ کروز میزائل بھرے ہیں۔

۱۷- ایضاً' ص ۱۹

۱۸- ایضاً' ص ۳۳ ۱۹- ایضاً' ص ۲۱۶

کالمیر نے امریکہ کے عوام اور قیادت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کے دوران تنبیہ کی ہے:

ہم امریکی گہرا یقین رکھتے ہیں کہ دُنیا میں ہمارا کردار نیک ہے اور ہمارے تمام اقدامات بلاامتیاز دوسروں کی اور ہماری بھلائی کے لیے ہیں۔ جب ہمارے اقدامات کے نتیجے میں تباہی رونما ہوتی ہے تو ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے محرکات بہت اچھے تھے۔ لیکن واقعات بتا رہے ہیں کہ سرد جنگ کے بعد کے عشروں میں امریکہ نے اپنی خارجہ پالیسی کے نفاذ میں سفارت کاری، اقتصادی امداد، بین الاقوامی قانون اور کثیر جہتی اداروں پر انحصار ترک کر دیا۔ اور ساری توجہ زیادہ فوجی طاقت اور مالی ہیرپھیر میں لگا دی ہے۔[۲۰]

ان حالات کے نتیجے میں دُنیا کے مظلوم اور مجبور انسان اور قومیں ہی مصائب کا شکار نہیں، خود امریکہ بھی ایک فوجی اقتصادی عفریت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ معاشرے میں تشدد کے رجحانات جنم لے رہے ہیں، معیشت کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی ہیں اور ملک وقوم بالآخر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ جانسن کالمیر نے لکھا ہے:

بین الاقوامی سیاسیات کے پروفیسر ڈیوڈ لیکو نے لکھا ہے: ''عالمی نظام محض غیرمتوازن اور جارح طاقتوں کے عمل کی وجہ سے جو اپنے پڑوسیوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہیں ٹوٹتا بلکہ اس لیے بھی ٹوٹتا ہے کہ یہ طاقتیں مطابقت پیدا کرنے کے بجائے استحصالی بالادستی قائم کرتی ہیں۔ (Beyond American Hegemony، ص ۱۴۲) میں سمجھتا ہوں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر امریکہ پر یہ بیان ٹھیک ٹھیک منطبق ہو رہا ہے۔ اِس استحصالی بالادستی کی علامات نظر آ رہی ہیں: عوام اور حکومتوں کے درمیان بڑھتی ہوئی اجنبیت، اخلاقی جواز کھو دینے کے باوجود اشرافیہ کا اقتدار سے چپکے

۲۰- ایضاً، ص ۱۷-۲۱۶

رہنا' عسکریت کا اظہار اور فوج کا سوسائٹی سے بُعد جس کی خدمت اس کا فریضہ ہے' خطرناک جبرواستبداد اور ایک اقتصادی بحران جو عالمی ہے۔ تاریخ میں ایسی کم ہی مثالیں ہیں جب بالادست طاقتوں نے اپنے زوال کو عروج سے بدل دیا ہو' یا اقتدار کو پرامن طور پر چھوڑ دیا ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکافات (blowback) سے بالآخر ایک بحران پیدا ہوگا جو اچانک امریکہ کے بالادست اثرات کو ختم کر دے گا یا بے وزن کر دے گا۔[۲۱]

جیو اور جینے دو!

کالمیر جانسن کا خیال ہے کہ اس انجام سے اب بھی بچا جا سکتا ہے' بشرطیکہ امریکہ کی قیادت استحصالی بالادستی کا راستہ ترک کر کے جائز اخلاقی اور سیاسی حدود کی پاس داری کا راستہ اختیار کرے اور ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر عمل کرے۔ موصوف اپنی کتاب اس پیغام پر ختم کرتے ہیں:

> امریکہ کو فوجی طاقت اور اقتصادی دباؤ کے بجائے سفارت کاری کے ذریعے نمونہ پیش کر کے رہنمائی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی بات نہ غیر حقیقت پسندانہ ہے نہ انقلابی۔ سرد جنگ کے بعد کی دُنیا کے لیے' امریکہ کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی بہبود کو اپنی استعماریت کے دعووں پر مقدم رکھے۔ بہت سے امریکی قائدین سمجھتے ہیں کہ اگر بیرون ملک امریکی اڈے بند کر دیے جائیں یا ایک چھوٹے ملک کو اپنی معیشت خود چلانے کی اجازت دی جائے تو دُنیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ اگر امریکہ اپنی دم گھونٹنے والی گرفت ڈھیلی کر دے تو ترقی اور بہتری کے کتنے

۲۱- ایضاً' ص ۲۲۴

چشمے دُنیا میں پھوٹ پڑیں گے۔ انھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ استعماری بالادستی قائم رکھنے کی ان کی کوششیں لامحالہ مکافات کی لہریں پیدا کریں گی۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ کھیل کب ختم ہوگا لیکن اس بارے میں کم ہی شبہ ہے کہ یہ کیسے ختم ہوگا۔

اکیسویں صدی میں عالمی سیاست بیسویں صدی کے آخری نصف کے بعد کے اثرات کے تحت ہوگی یعنی سرد جنگ کے غیر ارادی نتائج اور یہ اہم امریکی فیصلہ کہ وہ سرد جنگ کے بعد کے دور میں بھی اپنا سرد جنگ کا رویہ برقرار رکھے گا۔ امریکہ اپنے آپ کو سرد جنگ کا فاتح قرار دینا پسند کرتا ہے۔ آج سے ایک صدی بعد جب لوگ پچھلی صدی پر نظر ڈالیں گے تو زیادہ امکان ہے کہ کوئی بھی فریق فاتح نظر نہ آئے گا' خصوصاً اگر امریکہ اپنے موجودہ استعماری طریقوں کو اختیار کیے رکھتا ہے۔[۲۲]

امریکہ کی قیادت کو سمجھ لینا چاہیے کہ عالمی بالادستی اور سامراجی استیلا' عالمی برادری اور رفاقت دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر آپ قوت کے نشے میں بدمست رہیں گے' غلبہ اور استیلا کا کھیل کھیلیں گے' رعونت اور غرور کا رویہ اختیار کریں گے' اگر آپ دوسروں کی آزادی' عزت نفس اور مفادات کا خیال نہیں رکھیں گے' اور دوسری اقوام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے اور عسکری اور معاشی شکنجوں میں گرفتار رکھنے کی کوشش کریں گے تو آخرکار اس کا شدید ردِّعمل ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ امن' دوستی' محبت' تعاون سے دُنیا محروم رہے گی بلکہ بے اعتمادی' بےزاری اور بالآخر نفرت اور تصادم کی فصل رونما ہوگی --- اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ تصادم ہمیشہ طاقت ور کی فتح ہی پر منتج نہیں ہوتا۔ ہاتھی اپنی قوت کے گھمنڈ پر چیونٹی کو کچلنے کے درپے رہتا ہے لیکن جب

۲۲- ایضاً' ص ۲۲۹

چیونٹی ہاتھی کی سونڈ کے اندر رسائی پا لیتی ہے تو یہ ننھی سی ہستی (صدر لنڈن بی جانسن کے الفاظ میں: flea) ہاتھی کو بے بس کر دیتی ہے۔ اس طرح بھی انسانوں اور قوموں کی قسمتیں بدل جاتی ہیں: تلک الایام نداولھا بین الناس!

۳

خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ کائنات کے مالک و خالق کو انسان کا جو رویہ سب سے زیادہ ناپسند ہے، وہ غرور، تکبّر اور نخوت ہے۔ یہی وہ مرض ہے جس نے ابلیس کو شیطان بنایا۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں ہر شیطانی کھیل میں انھی صفاتِ بد کا کلیدی کردار رہا ہے۔

معاملہ افراد کا ہو یا قوموں کا، اگر عجز و انکسار اور حقیقت پسندی ترقی کا زینہ ہیں تو غرور و تکبّر بالآخر تصادم اور تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اللہ کی سنت ہے کہ جلد یا بدیر غرور کا سر ضرور نیچا ہوتا ہے--- یہ اور بات ہے کہ: جن میں خیر اور صلاح موجود ہو، وہ چوٹ پڑنے پر اصلاح اور سدھار کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ جن کی سرشت میں بدی غالب ہو اور جن کے مقدر میں ہزیمت اور بالآخر تباہی لکھی ہو وہ ہر انتباہ پر مزید سرکش ہو جاتے ہیں۔ ان کا معاملہ قوم نوح علیہ السلام سے مختلف نہیں ہوتا کہ اللہ کی طرف سے ان کو تنبیہ پر تنبیہ کی جاتی ہے، مگر ہر تنبیہ ان کی سرکشی میں اضافے کا ذریعہ بن جاتی ہے: وَنُخَوِّفُهُمْ لا فَمَا يَزِيدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ○ بنی اسرائیل ۱۷:۶۰۔

امریکہ کے لیے دو انتباہ

مئی ۲۰۰۱ء کے پہلے ہفتے میں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں مغرب اور مشرق کے

سبھی ممالک کی طرف سے امریکہ کو ایسی ہی دو تنبیہات کا مخاطب بنایا گیا۔ یہ عالمی رائے عامہ کے حقیقی رجحان کی مظہر ہیں اور امریکہ کے لیے ہوش میں آجانے کی دعوت کی حیثیت رکھتی ہیں' بشرطیکہ وہ ہوا کے رُخ کو سمجھنے کی کوشش کرے اور تاریخ سے کوئی سبق لینے کو تیار ہو۔

امریکہ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تو دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی سے مبتلا ہے اور اس رجحان میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن افغانستان سے روس کی پسپائی' اشتراکیت کے زوال اور دیوار برلن کے انہدام کے بعد سے اس کا غرور اور غرّہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ ان ۱۲' ۱۳ برسوں میں نئے عالمی نظام کی گھن گرج کچھ زیادہ ہی بلند ہوئی ہے اور امریکی صدی کے آغاز کے دعوے عالمی فضا کو بوجھل کرنے لگے ہیں۔ امریکہ کی قیادت کو یہ زعم ہو گیا کہ اب وہ ناقابل تسخیر ہے' اسے عقلِ کل کا مقام حاصل ہے اور وہ 'شہنشاہ عالم' کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

امریکی صدر جارج بش جونیر اور ان کی ٹیم نے ذمہ داری سنبھالنے کے بعد تنہا پرواز کے اشارے دینا شروع کر دیے اور گلوبلائزیشن پر امریکیت کی چھاپ لگانے میں مصروف ہو گئے۔ امریکی بالادستی کی ننگی جارحیت پر اقوام متحدہ' عالمی اداروں اور دوست ممالک سے مشاورت کا جو پردہ موجود تھا' وہ اس سے بھی نجات پانے میں لگ گئے۔

معاملہ میزائل کے مقابلے کے لیے قومی دفاعی ڈھال کا ہو یا ماحول کے تحفظ (global warming) کا۔ مسئلہ کروڑوں کی تعداد میں بارودی سرنگوں سے درپیش خطرات کا ہو یا ایڈز اور دوسرے مہلک وبائی امراض کے خلاف انسانیت کی مشترک جنگ کا۔ نیوکلیر پالیسی کے مسائل ہوں یا توانائی پالیسی اور اس کے اثرات۔ سابقہ عالمی معاہدات کی پاسداری کا مسئلہ ہو یا نئے معاہدات کے لیے عالمی برادری میں مفاہمت اور اتفاق رائے پیدا کرنے کا' معاملہ تجارتی پابندیوں کا ہو یا دوسرے ممالک کی حدود میں دخل اندازی اور جاسوسی کا' پرانے دوستوں سے وفاداری کی بات ہو یا نئے دوستوں

کی تلاش کی--- سب ہی معاملات میں بش حکومت نے اپنے اقتدار کے پہلے ہی چار مہینوں میں اپنی خود پسندی اور یک طرفہ کارروائی کا ایسا آہنگ اختیار کیا کہ مشرق و مغرب ہر طرف اقوام و ممالک میں اضطراب کی لہریں اٹھنے لگیں۔ احساس کی اسی نئی جہت کا اظہار نیویارک میں اقوام متحدہ کے دو اہم کمیشنوں کے انتخاب کے موقع پر ہوا۔ اس طرح مئی ۲۰۰۱ء کا پہلا ہفتہ تاریخ کی نئی کروٹ کا عنوان بن گیا۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا کمیشن ایک متحرک اور باوقار ادارہ ہے' جو ۱۹۴۷ء میں امریکہ کی تحریک پر سابق صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ [۴۵-۱۹۳۳ء] کی اہلیہ کی قیادت میں قائم ہوا تھا۔ یہ ادارہ نہ صرف حقوق انسانی کا اہم ترین پلیٹ فارم ہے' بلکہ اقوام متحدہ کے ان چند اداروں میں سے ہے جن کا کام صرف قراردادیں پاس کرنا نہیں' بلکہ عملاً شکایات کی تحقیق کرنا اور پالیسی اقدام تجویز کرنا بھی ہے۔ یہ ۵۳ ممالک کے نمایندوں پر مشتمل ہے۔ امریکہ گذشتہ ۵۴ سال سے اس میں کلیدی کردار ادا کرتا رہا ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس پر امریکہ ہی چھایا رہا ہے۔ اسے America used to call shots کہا جاسکتا ہے۔

ایسے ادارے میں بالکل غیر متوقع طور پر نئے انتخاب کے دوران (جس میں ۱۴ ارکان کا نیا انتخاب ہوا۔ جن میں تین عمومی نشستیں بھی تھیں' جو مغربی ممالک کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ انتخاب خفیہ رائے دہی کی بنیاد پر ہوئے) امریکہ کو نصف صدی میں پہلی مرتبہ شکست ہوئی۔ انتخابی ادارہ اقوام متحدہ کی سوشل اینڈ اکنامک کونسل تھی۔ اس مقابلے میں فرانس سب سے زیادہ ووٹ لے کر کامیاب ہوا (۵۴ میں سے ۵۲ ووٹ)' آسٹریا دوسرے نمبر پر (۴۱ ووٹ)' اور سویڈن تیسرے نمبر پر (۳۲ ووٹ)۔ ان کامیاب ممالک کے مقابلے میں امریکہ کو صرف ۲۹ ووٹ ملے اور وہ یہ انتخاب ہار گیا۔ اقوام متحدہ کے ان اداروں میں نصف صدی کے دوران یہ امریکہ کی پہلی شکست ہے' جس نے امریکہ سمیت سب کو متحیر کر دیا۔

۴ مئی ۲۰۰۱ء کی اس چوٹ سے ابھی امریکہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ تین ہی دن کے بعد ایک اور شکست کا زخم لگ گیا۔ اسی طرح اقوام متحدہ کے دوسرے اہم ادارے International Narcotics Control Board (عالمی ادارہ تحدید منشیات) میں بھی امریکہ اپنی نشست سے محروم ہوگیا۔ اقوام عالم کی طرف سے ایسے دو عالمی اداروں سے' جو بظاہر امریکہ کی خارجہ پالیسی کے سب سے اہم ستونوں یعنی 'حقوق انسانی' اور 'منشیات کی روک تھام کے لیے سب سے کلیدی ادارے تھے' اس کا بیک بنی و دوگوش اس طرح رخصت ہو جانا امریکہ کی عالمی ساکھ کے لیے بڑی شرم ناک شکست' اور خود امریکی قیادت کے لیے بڑا چشم کشا انتباہ ہے۔

امریکہ کا ردّعمل

ان واقعات پر امریکہ کی قیادت' پریس اور کارفرما عناصر کا ردعمل وہ آئینہ ہے جس میں بحیثیت سوپر پاور امریکہ کی مختلف تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فطری طور پر سب سے پہلا ردّعمل صدمہ' تعجب' حیرانی اور تحیر کا تھا۔ امریکی قیادت ششدر تھی کہ یہ ناقابل یقین واقعہ کیسے رونما ہوگیا۔ صدمے کے بعد شکوہ و شکایت اور غصہ' بلکہ غیظ وغضب کا اظہار شروع ہوا۔ سب سے زیادہ غم وغصہ اس بات پر تھا کہ خود مغربی ممالک نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا اور جن پہ تکیہ تھا انھی کے ووٹوں سے یومِ شکست دیکھنے کی نوبت آئی!

سویڈن اور آسٹریا پر بہت دباؤ ڈالا گیا' مگر وہ میدان سے نہ ہٹے۔ ۴۳ ممالک نے ووٹ کا وعدہ کیا تھا اس لیے فتح کا یقین تھا' لیکن خفیہ رائے میں صرف ۲۹ ووٹ ملے۔ ستم بالاے ستم یہ کہ اپنے اپنے علاقائی حلقوں سے جو ممالک اس انتخاب میں کامیاب ہوکر کمیشن کے رکن بنے' ان میں سوڈان' بحرین' جنوبی کوریا' چلی' میکسیکو' پاکستان اور یوگنڈا شامل ہیں۔ امریکہ کے ساتھ دوسرے ہارنے والوں میں سعودی

عرب اور ایران بھی شامل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جس کی شکست پر کہرام مچا ہے وہ صرف امریکہ ہے۔

دُنیا بھر کے اخبارات' رسائل اور الیکٹرانک میڈیا میں ایک طوفان سا برپا ہے کہ ایک انہونی بات کیسے حقیقت کا رُوپ اختیار کر گئی اور ایک ہی ہفتے میں امریکہ جیسی سوپر پاور' جسے فرانس کے نمایندے نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے hyper power کا لقب دیا ہے' کس طرح دو سیاسی شکستوں کا نشانہ بن گئی۔ اس شکست کے آئینے میں امریکہ کے پورے سیاسی کردار اور عالمی ردل پر بحث و گفتگو ہو رہی ہے اور تجزیہ نگار اس میں آنے والے دَور کی تصویر تلاش کر رہے ہیں۔ ایک آزاد معاشرے کی یہ خوبی ہے کہ اس میں ایسے اہم معاملات پر کھل کر بحث و گفتگو ہوتی ہے اور محض ایک سرکاری نقطۂ نظر ذہنی افق پر مسلّط نہیں ہو جاتا!

امریکی اور عالمی سیاسی اور صحافتی حلقوں میں ہونے والے مباحث کا تجزیہ کیا جائے تو اس شکست پر چار واضح ردّعمل سامنے آتے ہیں:

ا- **غم و غصہ**: پہلا اور فوری ردّعمل استخفاف اور استہزا کا ہے۔ امریکہ کے کچھ بااثر حلقے' حکومت کے چند ذمہ دار افراد اور ان کے ہم نوا عناصر بظاہر بڑی بے اعتنائی اور یک گونہ رعونت کے ساتھ کہہ رہے ہیں: پھر کیا (so what?) اقوام متحدہ کے ایک یا دو کمیشنوں کی اوقات ہی کیا ہے؟ خود اقوام متحدہ ہی کون سی اہم ہے؟ محض نشستند و گفتند کی ایک محفل' ایک چوپال۔ اگر اس میں امریکہ جیسا اہم ملک نہ بھی آیا تو کون سا آسمان گر جائے گا۔ ان کے خیال میں اس سے اقوام متحدہ ہی بے وقار ہوگی' امریکہ کو تو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔

اقوام متحدہ کی سوشل اینڈ اکنامک کونسل (انتخاب کرنے والے ادارے) میں امریکی نمایندے جیمز کننگم نے کہا: ''بلاشبہ ہم بہت مایوس ہوئے ہیں''۔ صدر امریکہ اور کانگریس کے ارکان کی جانب سے مایوسی کے ساتھ غم و غصّے کا اظہار بھی کیا گیا۔ کانگریس

کے ترجمان نے کہا: ''کانگریس کے خیال میں یہ اقوام متحدہ کے وقار اور اعتماد کو مجروح کرنے والی بات ہے''۔

صدر کی قومی سلامتی کی مشیر کون ڈولیزا رائس کی نگاہ میں: ''یہ سخت توہین آمیز ہی نہیں' بلکہ خود اقوام متحدہ کے مقام کو مجروح کرنے والا اقدام ہے''۔ ڈیفنس سیکرٹری ڈونالڈ رمس فیلڈ نے اسے ایک ''نہایت غیر دانش مندانہ اقدام'' (notably unwise) قرار دیا۔ سرکاری ترجمانوں ہی نے نہیں' بلکہ بڑی تعداد میں اخبارات اور سیاسی تبصرہ نگاروں نے بھی اس پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا ہے کہ: ''امریکہ کو تو کمیشن سے ۵۴ سال کے بعد نکال دیا گیا ہے' مگر چین' کیوبا' لیبیا اور سوڈان ''جیسے'' وہاں موجود ہیں!''

امریکہ کے ایوان نمایندگان کے اکثریتی قائد ڈک آرمی نے اسے ''مضحکہ خیز'' قرار دیا ہے۔ کانگریس بحیثیت مجموعی اس تاثر کا اظہار کر رہی ہے کہ خود اقوام متحدہ کو اب کون ایک سنجیدہ ادارہ سمجھے گا؟ ارکان کانگریس نے اسے ایک ہتک (insult) قرار دیا ہے۔[۲۳]

فلوریڈا سے ایوان نمایندگان کی رکن الیانا راس کا کہنا ہے: ''یہ ایک ایسی مضحکہ خیز بات ہے جو اقوام متحدہ کے نظام کی سالمیت اور جواز کی بنیاد ختم کر دیتی ہے''۔

۲- انتقامی ردّعمل: مایوسی اور غم و غصے کے ساتھ دوسرا ردّعمل انتقامی نوعیت کا ہے۔ اقوام متحدہ اور اتحادی ممالک سے صرف شکایت ہی کا اظہار نہیں کیا جا رہا' بلکہ کہا گیا ہے کہ اقوام متحدہ کو سبق سکھانے کی ضرورت ہے اور اس کا طریقہ اقوام متحدہ کے مالی واجبات کی ادائیگی کو روک دینا ہے۔ پہلے ہی امریکہ' اقوام متحدہ کے ایک ارب ۷۰ کروڑ ڈالر کا نادہندہ ہے۔ کئی برس سے جھگڑا چل رہا تھا بالآخر صدر کلنٹن کے دَور میں بڑے ردّ و کد کے بعد طے ہو گیا تھا: اقوام متحدہ کے کل بجٹ کے ۲۵ فی صد کے بجائے

۲۳- ٹائم' ۲۱ مئی ۲۰۰۱ء

(جو امریکہ کی اصل ذمہ داری اور وعدہ تھا) اسے ۲۲فی صد کر دیا جائے۔ اس طرح امریکہ واجبات کی مد میں ۲ ارب نہیں' صرف ایک ارب ۷۰ کروڑ ڈالر ادا کرے گا' جس میں سے ۵۸ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر اس سال ادا کرنا تھے۔لیکن اس شکست کے بعد امریکی کانگریس نے فوری طور پر انتقامی کارروائی کرتے ہوئے ۲۵ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کی وہ ادائیگی روک دی جو اسی مہینے اقوام متحدہ کو دینا طے تھی۔ کانگریس نے یہ بھی کہا کہ جب تک انسانی حقوق کے کمیشن پر امریکہ کی نشست بحال نہیں ہوتی (جس کا امکان نئے انتخاب کے دوران ہی ہوسکتا ہے) اس وقت تک اقوام متحدہ کو کوئی ادائیگی نہ کی جائے۔ امریکی انتظامیہ نے کانگریس کی بڑی خوشامد کی تھی کہ اس شکست کے باوجود یہ انتقامی کارروائی نہ کی جائے' لیکن کانگریس نے ایک نہ سنی اور اپنے اس غضب ناک ردعمل کا اظہار ضروری سمجھا۔

۳- الزامی ردعمل : تیسرا ردعمل الزامی تھا۔ اس میں امریکہ اور اسرائیل پیش پیش تھے۔ جنھوں نے کہا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ: ''امریکہ حقوق انسانی کے معاملات کو اٹھا رہا تھا اور دوسرے اس پر چیں بجبیں تھے''۔ یہ اشارہ چین اور فرانس کی طرف تھا۔ سرکاری ترجمان اور امریکی اخبارات نے یہی لَے بلند کی اور اس طرح شکست پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وزارت خارجہ نے اعلان کیا کہ یہ سب حقوق انسانی کے بارے میں امریکی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ اخبار فنانشل ٹائمز' لندن لکھتا ہے:

> اس نتیجے کو واشنگٹن اور اقوام متحدہ میں انسانی حقوق' خصوصاً چین اور کیوبا کے بارے میں امریکہ کے سخت موقف کے جواب میں جھڑکی کی حیثیت سے دیکھا جارہا ہے۔[۲۴]

خاتون رکن کابینہ کونڈولیزا رائس کا موقف ہے:

۲۴- فنانشل ٹائمز' ۵ مئی ۲۰۰۱ء

یہ دھچکا اس لیے لگا کہ امریکی قیادت حقوق کے مسئلے پر بعض ممالک کے لیے کچھ زیادہ ہی سخت تھی۔ میری دانست میں یہ ان قوتوں کی طرف سے شدید ردِّعمل تھا جو نہیں چاہتی ہیں کہ ان پر تنقید کی جائے۔ شاید امریکہ انسانی حقوق کے کمیشن میں کچھ زیادہ ہی سرگرم تھا۔[۲۵]

واشنگٹن پوسٹ' نیویارک ٹائمز' انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون کے مقالہ نگار دوسرے ممالک پر برستے رہے کہ وہ حقوق انسانی کے باب میں سمجھوتے کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں' جب کہ امریکہ ڈٹا رہتا ہے اور اسی لیے اسے کمیشن سے نکال دیا گیا ہے۔ فرانس پر تجارتی مفادات کے حصول کی پھبتی کسی گئی۔ چین' کیوبا اور دوسرے ممالک کو حقوق انسانی کے باب میں ''مجرم'' ثابت کرنے کے لیے اپنے سے دلائل کے انبار لگائے گئے۔ اسرائیلی لابی تلملا تلملا کر کہنے لگی: ''چونکہ امریکہ نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور اسرائیل کے خلاف تادیبی کارروائیاں روکنے کے لیے سدِّ سکندری بن گیا ہے' اس لیے اسے سزا دی گئی ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ سویڈن اور آسٹریا اس انتخاب میں امریکہ کے مقابلے میں کامیاب رہے' جو حقوق انسانی کے بارے میں نہایت مضبوط موقف اختیار کرنے والوں میں سے ہیں۔ اگر مسئلہ حقوق انسانی کے بارے میں مضبوط موقف کا ہے تو سویڈن کا ریکارڈ امریکہ کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ لیکن وہ منتخب ہو گیا اور امریکہ رہ گیا!

الزامی ردِّعمل کا ہدف صرف تیسری دُنیا کے ممالک ہی کو نہیں بنایا گیا' بلکہ خود یورپ کے دوست ممالک پر بھی تیر و نشتر کی بارش کی گئی اور ایک اسرائیل نواز کالم نگار ولیم سافائز نے تو یہاں تک کہہ دیا:

کمیونسٹ چین اور کمیونسٹ کیوبا کی قیادت میں' فرانسیسی سفارت کاروں کی

۲۵- فنانشل ٹائمز' ایضاً

حمایت سے، جن کے پیچھے افریقی اور عرب آمر تھے، اقوام متحدہ نے امریکہ کو انسانی حقوق کمیشن سے نکال باہر کیا۔[26]

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی شکست میں فیصلہ کن کردار خود یورپی ممالک کا تھا۔ خود اسی کالم نگار نے اپنے مضمون میں اعتراف کیا: "۱۴ ممالک جنھوں نے امریکہ کو ووٹ دینے کا وعدہ کیا تھا وقت پر دغا دے گئے"۔ اس نے مطالبہ کیا کہ "خفیہ رائے دہی کے سارے آداب کو خیرباد کہہ کر ان ممالک کا پتا چلایا جائے اور انھیں سامنے لایا جائے، خواہ اس کے لیے سی آئی اے کی مدد لینی پڑے یا صحافتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر تفتیشی (investigative) صحافت سے کام لیا جائے!"[27] گویا ایک ہی سانس میں حقوق انسانی کے بارے میں اصول پرستی کے سارے دعوے اور مسلمہ جمہوری آداب کو پارہ پارہ کرنے کی دعوت دے ڈالی گئی۔

۴- خود احتسابی: ردعمل کی ان تین جہتوں کے ساتھ ایک جہت وہ بھی ہے، جس میں اس شکست کو ایک تازیانہ عبرت قرار دیا گیا اور امریکہ کو خود احتسابی کی اور ساری دُنیا کو امریکہ کی پالیسیوں کے بے لاگ جائزے اور تجزیے کی دعوت دی گئی۔ اس شکست کو امریکہ کے بارے میں عالمی رائے عامہ کی بے اطمینانی کا مظہر قرار دیا گیا۔ امریکی سینیٹر جان کیری نے اپنے ۶ مئی کے خطاب میں کہا: "دُنیا میں امریکہ سے بے زاری (anti-Americanism) کی یہ ایک لہر ہے، جو امریکی حکومت میں احساسِ دیانت میں کمی کی غماز ہے۔

ییل یونی ورسٹی میں بین الاقوامی قانون کے پروفیسر ہیرالڈ ہونگ جوکوہ نے اپنے مضمون America Gets a Wake-up Call on Human Rights میں معتدل اور مدلل انداز میں امریکہ کو اپنے احتساب اور جائزے کی دعوت دی:

۲۶- انٹرنیشنل هیرالڈ ٹریبون، ۸ مئی ۲۰۰۱ء

۲۷- ایضاً

> گذشتہ ہفتے دُنیا بھونچکا ہو کر رہ گئی جب پہلی دفعہ یہ ہوا کہ امریکہ کو اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن کے لیے ووٹ حاصل نہ ہو سکے۔ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ دُنیا امریکہ کو سبق سکھانا چاہ رہی ہے۔ لیکن کیا امریکی صحیح سبق سیکھ لیں گے؟ آیئے، سب سے پہلے ہم امریکہ کے دو متوقع ردِّعمل کا جائزہ لیں:
> پہلا یہ کہ یہ ذلت آمیز سفارتی شکست کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ کمیشن ایک بے معنی گفت وشنید کی جگہ ہے۔ دوسرا زیادہ سنگین ردِّعمل یہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ اپنے ذمے واجبات کی ادائیگی روک کر یا اقوام متحدہ کے خلاف دوسرے تعزیری اقدامات کر کے اسے سبق سکھائے--- گذشتہ ہفتے کا ووٹ ایک بیدار کرنے والی آواز ہے کہ حقوق انسانی کے مسئلے پر امریکی قیادت کو جو عالمی احترام حاصل تھا، اس کا دَور ختم ہو گیا ہے۔[۲۸]

اس کے بعد پروفیسر ہیرالڈ نے بہت سے عالمی مسائل کا ذکر کیا ہے، جن کے بارے میں ان کے خیال میں امریکہ نے عالمی برادری کے جذبات کا لحاظ نہیں کیا۔ جن میں خصوصیت سے ایڈز کے مریضوں کی مدد، غریب ممالک کو خوراک کی فراہمی، بین الاقوامی معاہدات کی توثیق، بین الاقوامی فوج داری عدالت کے بارے میں امریکہ کے تحفظات وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر ہیرالڈ نے مشورہ دیا کہ امریکہ، بے اعتنائی (indifference) یا غصہ وانتقام (anger) کا راستہ اختیار نہ کرے، بلکہ دوسرے ممالک سے تعاون اور اعتماد باہمی کا راستہ اختیار کرے۔ موصوف نے اپنے مضمون کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے:

> گذشتہ ہفتے کی شکست کے باوجود دُنیا انسانی حقوق کے میدان میں امریکی قیادت کی خواہاں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکی بھی یہ قیادت فراہم کرنے کا حوصلہ اور وژن رکھتے ہیں؟

۲۸- انٹرنیشنل هیرالڈ ٹریبیون، ۹ مئی ۲۰۰۱ء

فنانشل ٹائمز کا نمائندہ بھی واشنگٹن کے سیاسی اور سفارتی حلقوں کی بحث کا خلاصہ اور پیغام کچھ یوں بیان کرتا ہے:

یہ واقعہ بش انتظامیہ کو بیدار کرنے والی آواز ہے تاکہ وہ آج کی دُنیا کے ساتھ زیادہ متعلق ہو جائے۔[29]

نیویارک ٹائمز کے ایک مضمون نگار لیونارڈ گارمنٹ نے جسے قانون اور سفارت کاری دونوں میدانوں کا تجربہ ہے' لکھا ہے:

ہمیں نہیں معلوم کہ یہ ووٹ کس بڑے عمل کا عکاس ہے۔ کیا یہ صرف محض ایک انتخابی شکست ہے؟ کیا امریکہ کے حلیفوں نے حقوق انسانی پر غیر یقینی موقف کا اظہار کرتے ہوئے روسیوں کے بجائے چینیوں کو خوش کرنا پسند کیا؟ کیا یہ ووٹ عالم گیریت کے خلاف احتجاج تھا یا ایک اجتماعی ناراضا مندی کا اظہار؟ کیا ہم ایک ایسے ردّعمل کا آغاز دیکھ رہے ہیں' جس کے نتیجے میں' چاہے یہ مقصود نہ ہو' امریکہ میں لاتعلقی کی سیاست کو فروغ ملے؟[30]

اقوام متحدہ میں امریکہ کی سابق سفیر جین کرک پیٹرک نے مستقبل کے بارے میں چند اہم سوال اٹھائے:

انسانی حقوق کمیشن پر ووٹ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جمہوری ممالک میں امریکہ کے قابل اعتماد دوست اور حلیف ہیں بھی؟ یہ طے ہے کہ گذشتہ عشرے میں امریکہ اور اس کے تنظیم معاہدہ شمالی اوقیانوس کے حلیفوں کے درمیان فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ یورپی پریس میں ناراضی کا اظہار ان تحریروں کے مستقل سلسلے سے ہوتا ہے جو امریکہ اور امریکی طریقوں پر سخت تنقید کرتے

۲۹- فنانشل ٹائمز' ۵'۶ مئی ۲۰۰۱ء

۳۰-انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون' ۱۶ مئی ۲۰۰۱ء

ہیں۔[31]

نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریے میں اعتراف کیا:

بغاوت کا آغاز ہوتے ہی پتا چلانے اور اسے فرو کرنے میں انتظامیہ کی ناکامی پریشان کن شکست کا ایک پہلو ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات اقوام متحدہ کے لیے امریکہ کے سرپرستانہ رویے کے خلاف بڑھتا ہوا غصہ ہے، جو ماحولیات سے لے کر بارودی سرنگوں تک جیسے مسائل پر عالمی معاہدوں کے بارے میں واشنگٹن کی بے حسّی کی دلیل ہیں۔[32]

ایک اور کالم نگار ڈیوڈ اگنا شیس نے اپنے اضطراب کا اس طرح اظہار کیا:

۹۰ کے عشرے میں امریکہ عالمی معیشت کو اپنی مٹھی میں سمجھنے کا عادی ہو گیا۔ امریکہ کے پاس پیسہ بھی ہے اور نظریات بھی، اور دوسری اقوام کو بس امریکہ کی ہدایات کے مطابق کھیلنا ہے۔ لیکن امریکی بالادستی کے یہ آسان دن اب ختم ہو رہے ہیں۔ خارجہ پالیسی میں بھی یہ جوابی کارروائی کا وقت ہے۔ اس کی ایک واضح اور قابل ذکر مثال امریکہ کو حقوق انسانی کمیشن سے باہر نکالنے کا عمل تھا۔ بعض مبصرین نے کہا کہ یہ ووٹ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ دُنیا کے ممالک میزائل دفاع کے حق میں اور موسموں کی تبدیلی کے کیوٹو معاہدے کے خلاف امریکہ کے یک طرفہ موقف سے تنگ آ گئے ہیں۔ یہ دو واضح حالیہ مثالیں ہیں۔ ... امریکہ کے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ عالم گیریت دوطرفہ راستہ ہے اور جیسا کہ پرانا مقولہ ہے کہ آپ اوپر جاتے ہوئے لوگوں سے اچھا سلوک کیجیے۔ اس لیے کہ واپسی میں بھی ان سے ملاقات ہو سکتی ہے۔[33]

۳۱- ایضاً، ۹ مئی ۲۰۰۱ء

۳۲- ایضاً، ۷ مئی ۲۰۰۱ء

۳۳- ایضاً

فرانس کے سفیر نے اپنی کامیابی کا سہرا اس بات کو قرار دیا کہ ہماری پالیسی کی بنیاد مکالمہ اور باہمی احترام ہے۔ برطانیہ کے سفیر سر جرمی گرین اسٹاک نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: حالیہ ووٹ باقی دُنیا کے ساتھ امریکہ کے تعلقات پر ایک تبصرہ تھا۔[۳۴] چین نے زیادہ ہی کھل کر کہا: اس ووٹ کے ذریعے امریکہ کی اس کوشش کو کہ نام نہاد انسانی حقوق کے مسائل کو اپنی طاقت کی سیاست اور دُنیا پر غلبے کے لیے دباؤ کے آلے کے طور پر استعمال کرے، سختی سے مسترد کر دیا گیا ہے۔

امریکہ کے عالمی کردار کا تقاضا

امریکہ اور دوسرے ممالک کے دانش وروں اور سفارت کاروں کے اس نوعیت کے ردّعمل کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اقوام متحدہ میں امریکہ کی ان شکستوں کو سرسری طور پر نہیں لینا چاہیے۔ خود پسندی اور محض دفاعی انداز میں بات کو ٹالا جا سکتا ہے مگر زمینی حقائق کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

امریکہ کا عالمی کردار صرف امریکہ ہی کے لیے اہم نہیں ہے' یہ آج کی دُنیا کے لوگوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ استخفاف' استہزا' انتقام اور الزام کا ردّعمل قابل فہم ہے لیکن یہ خود امریکہ کے لیے ایک سانحہ ہوگا کہ وہ اپنا دفاع کرنے کا اسیر ہو جائے اور گہرائی میں جا کر عالمی برادری کے جذبات و احساسات کا تجزیہ کرنے سے گریز کرے۔ یہ خودفریبی کا راستہ ہوگا جس کا خمیازہ دوسروں کے ساتھ اسے بھی بھگتنا پڑے گا۔ اقوام متحدہ کے اہم اداروں کے یہ ووٹ صرف ہوا کے رخ ہی کا پتا نہیں دیتے' بلکہ عالمی سطح پر پائی جانے والی خرابیوں اور چیلنجوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔ کمزور توجیہات اور لیپاپوتی سے حالات صرف بگڑ سکتے ہیں' بناؤ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

۳۴- ٹائم' ۲۱ مئی ۲۰۰۱ء

کئی اعتبار سے اس موقع پر باقی دُنیا کے اہل دانش کو آگے بڑھنا اور امریکہ اور روس کی قیادت کو صاف صاف بتانا چاہیے کہ اصل خرابی کیا ہے اور کہاں ہے؟ امریکہ محض امریکی حکومت یا اسٹیبلشمنٹ کا نام نہیں۔ امریکہ ایک اہم عالمی قوت اور ۳۰ کروڑ انسانوں کا ملک ہے، جو مادی وسائل سے مالا مال اور سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ ترین مہارتوں کی آماجگاہ ہے۔

بلاشبہ امریکہ میں اقتدار کی کنجیاں جن کے ہاتھ میں ہیں وہ ایک خاص ذہن کے مالک اور مخصوص مفادات کے محافظ ہیں۔ دُنیا بھر میں لوگوں کی شکایات کا اصل منبع یہی اسٹیبلشمنٹ ہے۔ اس کی گرفت خود امریکہ کی آبادی پر بھی ہے اور جس نے پوری دُنیا میں اپنے مفادات کے لیے تباہی مچا رکھی ہے۔ خود امریکہ کے عوام کی ایک بڑی تعداد بھی مظلوم ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک دن دُنیا کے دوسرے مظلوموں کے ساتھ وہ بھی ہم آواز ہو کر ظلم کے خلاف نہ اٹھ کھڑی ہو۔ آخر ویت نام کی جنگ کے خلاف امریکی قوم کی خاموش اکثریت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اب امریکہ میں خود مسلمانوں کی تعداد روز افزوں ہے اور ۷۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان، قوم کے ضمیر کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ آج میڈیا اتنا طاقت ور ہے کہ دُنیا کے کسی بھی گوشے سے ساری انسانیت کو مخاطب کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں یہ خود امریکہ کے مفاد میں ہے کہ وہ خود پسندی کے خول سے نکلے اور ان اسباب و عوامل کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لے جو امریکہ کو دُنیا کے تمام لوگوں سے کاٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

اسی طرح پورے عالم انسانی کا مفاد بھی اس میں ہے کہ تلخی، صف آرائی اور جنگ جوئی کے بجائے افہام و تفہیم اور مکالمے کا راستہ اختیار کرے اور دلیل اور شہادتوں کے ساتھ ان اسباب کی نشان دہی کرے، جو بگاڑ کا ذریعہ ہیں۔

امریکہ کا استعماری کردار

بلاشبہ امریکہ نے جمہوریت' آزادی اور حقوق انسانی کے لیے آواز بلند کی ہے مگر کیا وجہ ہے کہ عالمی برادری کی اکثریت ان باتوں کو اخلاص' دیانت اور شفافیت کے رنگ و بو سے محروم پاتی ہے۔

امریکہ خود برطانوی اور فرانسیسی استعمار کا دَور دیکھ چکا ہے۔اس نے استعماری شکنجوں کو توڑ کر آزادی حاصل کی تھی اور اس وجہ سے دُنیا کی مظلوم اقوام اسے اپنا ہم سفر سمجھنے لگی تھیں۔ آخر کیوں وہی اقوام اب خود امریکہ کو ایک استعماری قوت سمجھ کر اس سے فاصلہ پیدا کر رہی ہیں۔ امریکہ کبھی قوموں کے حق خود ارادیت کا علم بردار سمجھا جاتا تھا' اب اسے کیوں انسانی حقوق کی پاس داری کے بارے میں اعتماد سے محروم کیا جا رہا ہے؟

بات صرف بارودی سرنگوں (land mines) کے بارے میں سردمہری' ماحولیات کے خطرات کے باب میں تساہل اور بین الاقوامی معاہدات سے گلوخلاصی کی کوشش تک محدود نہیں۔ جن اہل علم نے مخالفت کے اسباب کی تان ان مسائل پر توڑی ہے انھوں نے بہت سہل انگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عالم اسلام اور اس کی سیاسی اور فکری قیادتوں کو اس نازک تاریخی موقع پر کسی مداہنت سے کام نہیں لینا چاہیے اور حالات کا بے لاگ تجزیہ کر کے امریکہ کی قیادت کو اور پوری دُنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو ان اسباب و عوامل کا احساس دلانا چاہیے جو عالمی سیاست میں بگاڑ کا باعث اور انسانی معاشرے میں ظلم و استحصال کا ذریعہ ہیں۔

بنیادی تبدیلی کی ضرورت

بلاشبہ امریکہ آج سیاسی' معاشی اور عسکری اعتبار سے دُنیا کا سب سے طاقت ور ملک ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قوت و سطوت کے باوجود امریکہ' دُنیا کا محبوب اور پسندیدہ ترین ملک نہیں۔ مادی خوش حالی میں اس کا درجہ کتنا ہی بلند کیوں نہ

ہو، لیکن انسانیت کی میزان میں اس کا وزن بڑا ہلکا ہے۔

اچھے انسان دُنیا کے ہر ملک اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی جو امیج امریکہ کا دُنیا میں ہے وہ گندے امریکیوں (The Ugly American) کی تصویر سے قریب تر ہے۔ جمہوریت، آزادی اور حقوق انسانی کے تمام دعوے اپنی جگہ، اور امریکہ کی سرزمین پر ان کے تجربات ۔کے کچھ مثبت پہلوؤں کے اعتراف کے ساتھ، اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دُنیا کے جن جن ممالک پر امریکی اثرات پڑے ہیں یا پڑ رہے ہیں ان کے دامن میں پھول کم اور کانٹے زیادہ ہیں۔

ماضی کی سامراجی قوتیں جس ننگی جارحیت، جبر، غلامی اور لوٹ کھسوٹ کی تھیں، آج وہی کھیل امریکہ خوش نما نظریات اور دل فریب وعدوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ ظلم کی شکلیں بدل گئی ہیں، اس کی حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لیے ضروری ہے کہ حقائق کو بے نقاب کیا جائے اور امریکہ کے عالمی کردار کے اصل خدوخال کو بلاکم و کاست پیش کیا جائے، تاکہ آج کے انسان کے اصل مسائل اور اس کی روح کے حقیقی اضطراب کو سمجھا جا سکے۔

امریکہ کو سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض انتقامی سیاست کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ اس کی اپنی پالیسیوں اور کارکردگی کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ اگر وہ فی الحقیقت دُنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ دوستی اور تعاون کا رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی فکر اور اپنے نظامِ کار میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔

مسئلہ محض بڑے اور چھوٹے اور طاقت ور اور کمزور کا نہیں بلکہ ان اصولوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کی بنیادوں کا ہے جن کے نتیجے میں دُنیا میں حقیقی امن اور انصاف قائم ہو سکے اور دُنیا کے وسائل تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال ہو سکیں۔ کوئی کسی کا محتاج نہ ہو، سب عزت اور وقار سے زندگی گزاریں ع

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس

یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کامیاب اور ناکام نظام' صحت مند اور مریض معاشرہ' صالح اور ظالم تہذیب کو پرکھا جاسکتا ہے۔

بے اعتمادی کیوں؟

امریکہ پر بے اعتمادی اور اس سے بے زاری کی پہلی اور سب سے اہم وجہ امریکہ کا عالمی بالادستی کا عزم اور ہدف ہے۔ نظریات کی دُنیا میں آزاد مسابقت' معیشت میں تجارت اور تعاون' سیاسی معاملات میں اشتراک اور مشترک مقاصد کے لیے معاونت اور مفاہمت دُنیا کے تمام انسانوں کے لیے مفید اور ضروری ہیں۔ لیکن اگر ایک قوم یا ملک محض اپنی قوت کے بل پر دوسروں کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کرے اور محض اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو داؤ پر لگا دے تو یہ عالمی برادری کے لیے سّمِ قاتل اور سامراج کی ایک مکروہ شکل ہے۔

امریکہ آج ایک سامراجی قوت ہے۔ اس کی تمام سیاسی' معاشی' ثقافتی اور عسکری پالیسیاں سامراجی مقاصد کا آلہ کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت' آزادی' انسانی حقوق اور معاشرتی ترقی کے نعرے نہ دلوں کو مسخر کر پاتے ہیں اور نہ قوموں کی زندگی میں کسی خیر اور فلاح کا پیغام لاتے ہیں۔ ایک قوم کی طرف سے دوسروں پر بالادستی کے قیام کی کوشش تو تصادم اور کش مکش ہی کو جنم دے سکتی ہے اور دے رہی ہے۔ کاروبارِ حیات کو بدلے بغیر محض کردار بدلنے سے حالات کیسے بدل سکتے ہیں۔

ہسپانوی' پرتگالی اور ولندیزی سامراج کا دَور ہو یا برطانوی اور فرانسیسی سامراج کا' روسی استعمار ہو یا امریکی استعمار' جرمنی و جاپان بالادستی کے قیام کے لیے برسرِ جنگ ہوں یا اسرائیل اور بھارت ملک گیری میں مصروف--- اصل ایشو ایک ہی ہے: دوسروں کو اپنا محکوم بنانا اور انسانوں پر قوت کے ذریعے حکمرانی اور بالادستی کا قیام۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ آزادی اور حقوق انسانی کے تمام دعووں کے باوجود دُنیا کے

دوسرے ممالک اور اقوام پر اپنے مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے بالادستی قائم کرنے کے لیے سرگرم ہے۔ جب تک یہ صورت حال تبدیل نہیں ہوتی' خوش نما الفاظ اور دل کش وعدوں سے غلامی کی زنجیریں پھولوں کی لڑیاں نہیں بن سکتیں۔

امریکی تہذیب اور سیاست جن تضادات کا شکار رہی ہے' ان پر اس وقت گفتگو پیش نظر نہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع امریکہ کی سرزمین پر یورپی اقوام کا قبضہ' وہاں کی اصل مقامی آبادی (ریڈ انڈین) سے سلوک' افریقہ سے غلاموں کی تجارت اور نسل اور رنگ پر مبنی معاشرے کا قیام نہیں ہے۔ ہمارے زیر بحث ان کی جنگ آزادی' دستور پر مبنی جمہوریت اور آزاد معیشت کا قیام یا' منرو ڈاکٹرائن بھی نہیں ہے۔ ہم بات کا آغاز بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد سے کر رہے ہیں۔

اس وقت امریکہ' دُنیا کے سامنے کچھ اصولوں کے علم بردار اور خصوصیت سے محکوم اقوام کی آزادی اور عالمی برادری کے لیے بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعے آزادی اور امن کے داعی کی حیثیت سے آیا تھا۔ صدر ووڈرو ولسن [۲۱-۱۹۱۳] کے اصول سیاست اور لیگ آف نیشنز کا قیام ایک اچھا آغاز تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے بعد سے جو دَور شروع ہوا وہ شفاف نہیں۔

جمہوریت' آزادی' حقوق انسانی اور اقوام متحدہ کے ذریعے ایک عالمی سلامتی کے نظام کا قیام' اس دَور کے اعلان شدہ مقاصد رہے مگر عملاً سرد جنگ کی سیاست نے دُنیا کو صرف نظریات ہی نہیں' سیاسی اور معاشی مفادات کا اکھاڑہ بنا دیا۔ امریکہ ایک کالونی کی تنگنائے سے نکل کر ایک عالمی طاقت بن گیا اور اس کے ساتھ اس کی سیاست نے بھی وہی سامراجی رنگ و روپ اختیار کر لیے جو ماضی کی استعماری قوتوں کا وطیرہ رہے ہیں۔ بظاہر یہ جنگ اشتراکیت کی ظلمتوں سے دُنیا کو بچانے اور آزادی کی روشنیوں سے روشناس کرانے کے لیے تھی' لیکن اس جمہوری قبا میں چنگیزیت ہی چھپی ہوئی تھی۔ گذشتہ ۶۰ سال کی سیاست جن تضادات' تناقضات اور تباہ کاریوں سے عبارت

ہے اس کی جڑیں سرد جنگ کے اس خمیر میں پیوست ہیں۔ گویا ؎

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

جنگ عظیم کے بعد حکمت عملی

دوسری جنگ کے بعد جو حکمت عملی نئے عالمی نظام کے لیے وضع کی گئی' اس میں ایک طرف اقوام متحدہ کا قیام' انسانی حقوق کے اعلان کا اجرا' عالمی عدالت انصاف کا قیام' نئے عالمی مالیاتی اداروں کا قیام تھا تو دوسری طرف اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جو اصل بااختیار ادارہ تھا' پانچ ملکوں کا ویٹو اور امریکہ اور روس کی عالمی بالادستی کے لیے اپنی اپنی منصوبہ بندی اہم ہے۔ امریکہ کی خارجہ سیاست کی فکری بنیادیں جارج کینان نے مرتب کیں' جس کے تین ستون تھے:

۱- **عالمی قوت کی حیثیت**: امریکہ کو اصل مسئلہ یہ درپیش ہے کہ وہ ایک متحارب دُنیا میں ایک عالمی قوت کی حیثیت سے کس طرح اپنے کو مستحکم کرے۔ کینان نے صاف الفاظ میں کہا کہ حقیقی خارجہ پالیسی کا تعلق سیدھے سیدھے قوت کے حصول و استحکام سے ہے۔ امریکہ کی سلامتی اس میں ہے کہ قوت کے حصول کو مرکزیت دے اور ''حقوق انسانی' معیارِ زندگی کی بلندی اور فروغ جمہوریت کے غیر حقیقی اور غیر واضح تصورات کی بات چھوڑ دے''۔

۲- **معاشی اور سیاسی بالادستی**: معاشی اور سیاسی طاقت میں عدم توازن ایک حقیقت ہے۔ دوسری جنگ کے بعد امریکہ میں دُنیا کی آبادی کا صرف ۶.۳ فی صد تھا' جب کہ دُنیا کی دولت کے ۶۰ فی صد پر اسے قبضہ حاصل تھا۔ جارج کینان کے الفاظ میں: دُنیا کے نئے اُبھرتے ہوئے نظام میں امریکہ کا اصل ہدف تعلّقات کار کا ایک ایسا نظام وضع کرنا ہے جن کے نتیجے میں قوت کا یہ عدم توازن اس طرح برقرار اور محفوظ رکھا جا سکے کہ امریکہ کی قومی سلامتی کے لیے کوئی خطرہ اور رکاوٹ رونما نہ ہو۔

اس کے لیے امریکہ کو ان وسائل تک رسائی حاصل ہونی چاہیے جو اس کے معاشی اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

کینان نے دُنیا کا جو نیا سیاسی نقشہ تجویز کیا تھا اس میں اپنے وسائل کے تحفظ (the protection of our resources) کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بین الاقوامی راستے محفوظ ہوں' تجارت اور فوجی نقل و حمل کی راہیں کھلی رہیں' جن ممالک سے خام مال اور انرجی درکار ہے وہاں ایسی حکومتیں ہوں جو تعاون کریں اور سپلائی لائن برقرار رہنے کی ضمانت حاصل ہو۔ اس سلسلے میں قومی تحریکوں سے خطرہ ہو سکتا ہے جو قومی اور ملکی مفاد کی بات کریں۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ان ملکوں کو اشتراکی عناصر سے محفوظ رکھا جائے اور اگر ایسی حکومتیں ہمارے مفید مطلب ہوں جو چاہے سخت گیر ہوں مگر ہمارے مفادات محفوظ ہوں تو ہمیں ایسی ناخوش گوار صورت حال کو ضمیر کی کس خلش کے بغیر ترجیحاً قبول کرنا چاہیے۔ البتہ نجی سرمایہ کاری' بیرونی سرمائے کی آمد ورفت اور منڈی کی معیشت کو فروغ دینا چاہیے۔[۳۵]

۳- عسکری حصار: اشتراکی ممالک کے گرد ایسا سیاسی اور عسکری حصار تعمیر کر دیا جائے جس کے نتیجے میں اشتراکی انقلاب دوسرے ممالک تک نہ پہنچ سکے۔ یہ کام دفاعی اور معاشی معاہدات کے جال بچھا کر انجام دیا جا سکتا ہے۔ اسے حصار بندی کی حکمت عملی (strategy of containment) کہا جاتا ہے۔ جس کے تحت ناٹو (NATO)' سیٹو (SEATO)' سینٹو (CENTO)' بغداد پیکٹ اور ایسے ہی دوسرے عسکری بلاک تشکیل دیے گئے۔ [ترجمان القرآن' جون- جولائی ۲۰۰۱ء]

۳۵- بحوالہ: Deterring Democracy' از نوم چومسکی' ص ۴۹ اور Brave New World Order از جیک نیلسن' ص ۴۳۔

نئ صلیبی جنگ کا آغاز؟

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء امریکہ کی تاریخ میں ایک سیاہ' المناک اور نا قابل فراموش دن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جس طرح ۷۲ برس پہلے' ۱۹۲۹ء میں امریکہ کی حصص مارکیٹ کے بتاشے کی طرح بیٹھ جانے (The Great Crash) سے اور پھر ۶۰ برس پہلے چالیس کے عشرے میں پرل ہاربر پر اچانک جاپانی حملے سے (جس میں تقریباً ڈھائی ہزار امریکی ہلاک ہوئے تھے) امریکہ کی معیشت' سیاست اور عالمی کردار کی قلب ماہیت ہوئی' بالکل اسی طرح ۱۱ستمبر کے اس سانحے نے امریکہ ہی نہیں پوری مغربی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

سرد جنگ کے بعد امریکہ اور سرمایہ داری کی عالمی اور بزعم خود ''ابدی'' بالادستی کا ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور تاریخ کے اختتام تک کی نوید سنائی جا رہی تھی۔ مگر' وہ سارا قصہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر (WTC) کے دونوں میناروں کے انہدام کے ساتھ ہی زمین بوس ہوتا دکھائی دینے لگا۔ امریکی صدر بش نے اسے ''اکیسویں صدی کی پہلی جنگ'' کہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خطرہ ہے کہ وہ مغربی دنیا اور عالم اسلام کے درمیان نئ صلیبی جنگ کی ابتدا نہ ثابت ہو۔

۱۱۰ منزلہ یہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر ۲۳ سال پہلے ایک ارب ڈالر کی لاگت سے ۱۱۶ ایکڑ

اراضی پر تعمیر ہوا تھا۔ اس مرکز تجارت نے نیویارک کو نیا تشخص دیا تھا۔ جس میں پچاس ہزار لوگ کام کرتے تھے اور جس کا سالانہ کرایہ اب تین ارب ڈالر سے متجاوز تھا۔ وہ اس صدی کے لیے امریکہ کی معاشی اور مالیاتی قوت کا نشان اور عالمی سرمایہ داری کی شان و شوکت کی علامت ہی نہیں اس کا مالیاتی دارالحکومت بن گیا تھا۔ اسی طرح واشنگٹن میں وزارت دفاع (پینٹاگون) کی عمارت ایک قلعہ بند شہر کا منظر پیش کرتی تھی' اس میں ۲۴ ہزار افراد کام کرتے تھے اور یہ امریکہ کی عالمی عسکری قوت کا مظہر تھی--- یہ دونوں عمارتیں ایک گھنٹے کے دورانیے میں تین ہائی جیک شدہ امریکی ہوائی جہازوں کی زد میں آ کر تہ و بالا ہوگئیں۔

ان دو عمارتوں کی تباہی اور ہزاروں افراد کی ہلاکت ہی کچھ کم سانحہ نہ تھے کہ اس کی زد آج کی واحد سوپر پاور' جو صرف اپنے دفاع پر پوری دنیا کے مجموعی دفاعی اخراجات کا ۳۶ فی صد خرچ کر رہی تھی' اس کے وقار اور ساکھ پر کچھ اس انداز میں پڑی کہ اس کے ناقابل تسخیر (invincible) ہونے کا طلسم پادر ہوا ہو گیا۔ کچھ وقت کے لیے امریکہ کا پورا نظام دفاع و حکمرانی ''ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم'' کی تصویر بن گیا۔

یہ عالمی قوت جو اب شیر کی طرح دھاڑ رہی ہے' حادثے کے بعد ۲۴ گھنٹے تک عملاً کسی سربراہ مملکت کے بغیر تھی۔ صدر' نائب صدر اور کانگریس کا اسپیکر سب کبھی ہوا کے دوش پر دنیا کے خطرات سے تحفظ کے متلاشی تھے' کبھی زیرزمین پناہ گاہوں میں عافیت کے طالب تھے۔ اس حادثے کے بعد امریکہ کی قیادت جن کیفیات سے گزری اور اس کے چہروں اور اعلانات پر جو رنگ دیکھا گیا' اسے صرف: حیرت و صدمہ (shock)' استخفاف (humiliation)' غم و غصہ (anger)' طیش و غضب ناکی (wrath and fury) اور پھر انتقام (retaliation and revenge) اور جنون کی کیفیات و واردات کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

تشویشناک رویے

اس حادثہ فاجعہ کے بعد امریکہ بلکہ پوری مغربی دنیا پر ایک ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ غیر یقینی کے سائے منڈلاتے رہے اور اس جذباتی فضا میں ''کچھ کر گزرنے'' کے آثار خطرے کی گھنٹی بجاتے رہے۔ بندر کی بلا طویلے کے سر کے مصداق عرب اور مسلم دنیا کو ہدف بنایا جا رہا ہے' اسامہ بن لادن پر سارا نزلہ گر رہا ہے اور افغانستان پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ ہاتھی' مچھر پر حملہ آور ہونے کے لیے نکلا اور سارا ملبہ فرد واحد پر گرا کر اپنی ناکامیوں اور نفرت اور بے اعتمادی کے اصل اسباب و محرکات سے توجہ ہٹانے کی ناروا کوشش شروع کی گئی۔

یہ بڑی تشویش ناک صورت حال ہے کہ ٹھنڈے دل و دماغ سے حق و انصاف کے اصولوں کی روشنی میں حالات کا جائزہ اور تجزیہ نہ ہونے کے برابر ہے (چند کمزور آوازوں کے سوا)۔ جن کے ہاتھوں میں قوت ہے اور جن پر عالمی قیادت کا بار ہے وہ ایک زخمی درندے کی طرح آپے سے باہر ہو گئے اور جس پر بھی شبہ ہوا اسے نیست و نابود کرنے کے عزائم کا اظہار شروع کر دیا۔ صدر بش نے کہا: ''یہ دہشت گردی نہیں اعلانِ جنگ ہے'' لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس جنگ میں فریق ثانی کون ہے' مقابلہ کس قوت سے ہے اور یہ جنگ کس کس سرزمین پر ہوگی؟ پرل ہاربر کے موقع پر حملہ آور بھی معلوم تھا اور اس کا ٹھکانہ بھی۔ آج نہ یہ ثابت ہے کہ کس نے اس دہشت گردی (terrorism) کا ارتکاب کیا اور نہ یہ پتہ ہے کہ خودکش حملے میں جاں بحق ہونے والوں کی پشت پر دراصل کون ہے اور وہ کہاں ہے؟

بات کو مزید اشتعال انگیز بنانے کے لیے اس پورے عمل کو خود نفس تہذیب کے خلاف جنگ (war on civilization) کا نام دیا گیا۔ اس طرح دنیا کو دو حصوں میں بانٹنے کی مذموم کوشش کی گئی۔ گویا مغربی دنیا ہی مہذب دنیا ہے اور باقی سب وحشت کے دور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کہا جا رہا ہے: ''صرف دہشت گردوں ہی کا قلع قمع نہ کیا جائے گا

بلکہ ان ریاستوں کو بھی نابود کر دیا جائے گا' جہاں ان کو پناہ حاصل ہے"۔[1]

امریکی نائب صدر ڈک چینی اور وزیر دفاع رمس فیلڈ نے تو دو اور دو چار کی طرح کہہ دیا ہے: "ہمارا ہدف ان ریاستوں ہی کو نیست و نابود کر دینا ہے جو دہشت گردی کو فروغ دیتی ہیں"۔ دانش ور' اہل قلم اور میڈیا پر تبصرہ کرنے والوں کی ایک فوج ہے جو انتقام اور ریاستی تشدد کا کھلم کھلا پرچار کر رہی ہے۔ اسی تسلسل میں سابق امریکی وزیر خارجہ لارنس ایگل برگر فرماتے ہیں: "اس طرح کے لوگوں سے نبٹنے کی ابتدا کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے: آپ کو ان میں سے کچھ کو ہلاک کر دینا ہوگا خواہ وہ اس معاملے میں فوری طور پر براہ راست متعلق نہ ہوں"۔

امریکی خارجہ پالیسی کے گرو اور ویت نام' کمبوڈیا' چلی اور نہ معلوم کتنے ممالک میں لاکھوں انسانوں کی نسل کشی (genocide) کے ذمہ دار ڈاکٹر ہنری کسنجر کا ارشاد ہے:

> اگرچہ اس کے بارے یقینی بات نہیں کہی جا سکتی کہ اس اقدام کے پیچھے فی الحقیقت بن لادن کا ہاتھ تھا یا نہیں' مگر فوری تادیبی اقدام ضروری ہے اور وہ بھی ناکافی ہے۔ اصل ہدف اس پورے نظام (network) اور ان ممالک کے خلاف کارروائی ہے جہاں اس نظام کے کچھ بھی کل پرزے پائے جاتے ہیں: حکومت کو ایک منظم ردِّعمل کی ذمہ داری لینا چاہیے۔ امید کرنا چاہیے کہ یہ اسی طرح اختتام کو پہنچے جس طرح پرل ہاربر کا حملہ اختتام کو پہنچا تھا' یعنی اس نظام کی تباہی جو اس کا ذمہ دار ہے۔[2]

۱- وہ یہ بات دانستہ طور پر بھول جاتے ہیں کہ آج تک خود امریکہ میں آئرش ری پبلک آرمی (IRA) کے دہشت گردوں کو پناہ حاصل تھی اور کیوبا سے لے کر لاطینی امریکہ کے دسیوں ممالک اور عراق' لیبیا اور ایران وغیرہ میں دہشت گردی کرنے والے کتنے ہی مسلح گروہوں کے لیے امریکہ نہ صرف گوشۂ راحت و عافیت تھا بلکہ سی آئی اے اور مخصوص لابیاں کھلے بندوں ان کی تربیت اور ان کو مسلح کرنے کا انتظام کرتی رہی ہیں۔

۲- واشنگٹن پوسٹ' ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء

کسنجر نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر دوسرے ممالک اس میں امریکہ کا ساتھ نہ دیں تو امریکہ کو یہ اقدام تن تنہا ہی کر ڈالنا چاہیے اور کسی اتفاق رائے (consensus) کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بڑے دانش ور اور ذمہ دار حضرات کا انداز بیان ہے۔

عمومی سطح پر جو انداز اختیار کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ صرف ان تین مثالوں سے کیا جا سکتا ہے:

۱- رچ لوری رقم طراز ہے: ''اگر ہم دمشق یا تہران یا جو کچھ بھی ہو' اس کا ایک حصہ ملیا میٹ کر دیں تو یہ بھی حل کا ایک جزو ہے''۔[۳]

۲- نیویارک پوسٹ میں اسٹیو ڈیلوری لکھتے ہیں: ''۲۱ ویں صدی کے اس پرل ہاربر کا جواب اتنا ہی سادہ ہونا چاہیے جتنا کہ تیز--- بلا تاخیر حرامیوں کو قتل کر دو۔ ان کی آنکھوں کے درمیان گولی مار دو' ان کو ریزہ ریزہ کر دو' ضرورت پڑے تو زہر دے دو۔ اور وہ شہر اور وہ ملک جو ان کیڑے مکوڑوں کی سرپرستی کرتے ہیں ان پر بم باری کر دو''۔[۴]

۳- ایک خاتون این کملٹر تو یہاں تک ہدایت دی ہے: ''یہ اس کا وقت نہیں ہے کہ اس خاص دہشت گردی کے حملے میں براہ راست ملوث افراد کا پتہ چلایا جائے۔ ہمیں ان ممالک پر حملہ کر دینا چاہیے۔ ان کے لیڈروں کو قتل کر دینا چاہیے۔ ہم ہٹلر اور اس کے اعلیٰ افسروں کا پتہ چلانے اور سزا دینے کے بارے میں رسمی ضوابط کے پابند نہیں تھے۔ جس طرح ہم نے جرمن شہروں پر کارپٹ بم باری کی اور ہم نے شہریوں کو ہلاک کیا۔ وہ جنگ تھی اور یہ بھی جنگ ہے''۔[۵]

اس فضا کا عام طور پر مسلمان اور خاص طور پر عرب' ہدف ہیں۔ صدر بش نے اس

۳- ایضاً' ۱۳ ستمبر ۲۰۰۱ء (اس صحافی نے اپریل ۲۰۰۲ء میں اپنے ایک مضمون میں یہ مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ خانہ کعبہ پر ایٹم بم گرا دیا جائے۔ مرتب)

۴- نیویارک پوسٹ' ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء

۵- نیویارک ڈیلی نیوز' ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء

''مہم'' کو سر کرنے کے لیے ''صلیبی جنگ'' کا لفظ استعمال کر کے جلتی پر تیل ڈالنے کی خدمت انجام دی۔ اسلام کو ایک دہشت پسند مذہب اور مسلمانوں کو دہشت پسند گروہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان دنوں میں امریکہ' آسٹریلیا' جرمنی اور برطانیہ میں ایسے بیسیوں واقعات رونما ہوئے 'جن میں مساجد' مدارس' مسلمان مراکز' گھرانے' حتیٰ کہ راہ چلتی باپردہ خواتین نشانہ بنی ہیں۔ واقعے کے بعد پہلے دس دنوں میں صرف امریکہ میں ۳۰۰ انتقامی کارروائیاں ریکارڈ ہوئیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ مسلمان تو ایک طرف رہے' بے چارے سکھ بھی محض اپنی وضع قطع کے باعث مارے جا رہے ہیں--- کیا یہی وہ تہذیب اور اعلیٰ نظام زندگی ہے جس کے دہشت گردی سے معرض خطر میں ہونے کا واویلا ہے!

اسلامی تحریکوں کا موقف

امریکہ اور اہل مغرب کا رویہ خواہ کیسا بھی ہو اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے وہ کوئی بھی زبان استعمال کریں' بحیثیت مسلمان اور اُمت مسلمہ ہمارا رویہ حق' انصاف اور اعتدال پر مبنی ہونا چاہیے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے ہمیں دلیل کی زبان اور حق پرستی کا مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ قرآن کا ہمارے لیے یہی حکم ہے کہ جب بھی انسانوں کے درمیان کلام کریں انصاف کے مطابق کریں:

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ط (النساء ۴:۵۸)

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا ط اِعْدِلُوا قف هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ز (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف

سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

انسانی جان کا تحفظ اور احترام' اسلام کی بنیادی تعلیم ہے اور اس احترام آدمیت میں مسلمان اور غیر مسلم' مرد اور عورت' دوست اور دشمن میں کوئی تمیز نہیں۔ سب کی جان برابر ہے اور بلاحق کسی کی بھی جان لینا اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ' ہم نے تمام بنی آدم کو محترم و مکرم بنایا ہے' محض مسلمانوں یا اہل کتاب کو نہیں۔ اسی طرح:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)
قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا ۢبِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدہ ۵:۳۲)
جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

جس دین کی یہ تعلیم ہو' وہ دہشت گردی کے ذریعے بے گناہ انسانوں کی مظلومانہ موت کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مسلمانوں ہی نے نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں' ان کی دینی تحریکوں اور تمام ہی مسلمان حکومتوں نے ۱۱ ستمبر کی دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں ہزاروں انسانوں کی موت پر خون کے آنسو بہائے۔ اس غم کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ اس کی برملا مذمت کی ہے اور اصل مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیا ہے۔ ہماری نگاہ میں یہ محض امریکہ کا نقصان نہیں' پوری انسانیت کا نقصان ہے اور یہ غم تنہا کسی ایک قوم کے لوگوں کا غم نہیں پوری انسانی برادری کا غم ہے۔ اس نقصان اور اس غم کو ہمارے لیے جس چیز نے اور بھی اپنائیت کا روپ دے دیا ہے' وہ یہ حقیقت بھی ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہونے والے ۵ ہزار کے لگ بھگ افراد

کا تعلق ۶۳ ملکوں سے ہے۔ جن میں سب مذاہب کے ماننے والے شامل ہیں۔ ان مقتولین میں ایک ہزار سے زائد مسلمان تھے یعنی ہر پانچ میں ایک مسلمان تھا۔

دنیا کی اسلامی تحریکوں[۶] کے سو سے زیادہ قائدین اور عالم اسلام کے چوٹی کے علما اور مفکرین نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں ۱۲ ستمبر ۲۰۰۱ء ہی کو اس قتل ناحق کی مذمت کی۔ پھر ۱۸ ستمبر کو ایک اور بیان کے ذریعے اسلام اور اُمت مسلمہ کے موقف کو دوٹوک انداز میں بیان کیا۔ انھوں نے جہاں قتل ناحق کی مذمت کی وہیں انتقام اور جوابی قتل ناحق کے خلاف بھی متنبہ کیا اور کمال حکمت اور پوری جرأت سے عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی کی بات کی۔

اسلامی تحریکوں کا یہ بیان پوری اُمت مسلمہ کے جذبات کا ترجمان ہے:

- ہم نیویارک اور واشنگٹن میں بزدلانہ دہشت گرد حملوں کی پرزور مذمت کر چکے ہیں جن کا نشانہ بننے والے' تمام ممالک سے اور دنیا کے بڑے مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔
- اسلام انسانی جان کے تقدس کا علم بردار ہے۔ قرآن کے مطابق ایک بے گناہ کو ہلاک کرنا ساری انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان اس جارحیت کے نتیجے میں جانی نقصان پر غم زدہ ہیں کہ یہ امریکہ اور پوری دنیا کا مشترکہ نقصان ہے۔

۶- یہ اسلامی تحریکات' مسلمانوں کی روایتی فرقہ وارانہ تقسیم سے بالاتر' ایسی تنظیموں پر مشتمل ہیں' جو احیائے اسلام' دعوت اسلامی اور اسلامی تعلیمات کے مطابق تزکیہ نفس کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ تشدد یا خفیہ کاری کے بجائے کھلے عام اشاعت اسلام پر یقین رکھتی ہیں اور سیاسی تبدیلی کے لیے جمہوری طریقوں پر عامل ہیں۔ اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی حکمت عملی سے قریب تر جماعتوں کو اسلامی تحریکات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مرتب

- ہم یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام حصوں میں دہشت گردی کا نشانہ بننے والے ایسی ہی ہمدردی اور تشویش کے مستحق ہیں۔ جو لوگ انسانوں کی مساوات کے علم بردار ہیں' انھیں دنیا کے تمام حصوں میں دہشت گردی کی مذمت کرنا چاہیے اور اس کے خلاف لڑنا چاہیے۔
- ہم اس اصول کے حامی اور علم بردار ہیں کہ انسانوں کے خلاف دہشت گردی کے جو بھی ذمہ دار ہیں--- افراد' گروپ یا حکومتیں' ان کو کٹہرے میں لانا چاہیے اور کسی ہمدردی یا امتیاز کے بغیر اس جرم کی سزا دینا چاہیے۔
- ہم سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مشتبہ افراد کو کسی غیر جانب دار عدالتی طریقے سے ان کا جرم ثابت کیے بغیر' یک طرفہ طور پر سزا دینے کی کوشش بھی دہشت گردی ہی قرار پائے گی' جس کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور نہ گوارا کیا جاسکتا ہے۔
- عدل وانصاف اور فطری اور بین الاقوامی قانون کے اصولوں کا یہ کم سے کم تقاضا ہے کہ جرم کا غیر جانب دارانہ بنیادوں پر تعین اور واضح ثبوت ہو۔ اس لیے ہم دنیا کی تمام حکومتوں سے' خصوصاً امریکہ کی حکومت سے' اپیل کرتے ہیں کہ وہ صرف شبہے کی بنیاد پر طاقت کا یک طرفہ من مانا استعمال نہ کریں' اور مدعی' وکیل' جج اور جلاد سب کچھ خود ہی بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہم' اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور تمام عرب' مسلمان اور یورپی ممالک کے لیڈروں سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ دنیا کو بے جا خوں ریزی اور تشدد میں اضافے سے بچائیں جس سے اقوام عالم اور ریاستوں میں مزید جھگڑے اور تنازعات پیدا ہوں گے۔
- دہشت گردی کا مقابلہ صرف ایسے ہی ذرائع سے کیا جاسکتا ہے جو منصفانہ اور عادلانہ ہوں' اور دنیا میں امن وسکون کا باعث بننے والے ہوں۔ ہمیں ایسے اقدامات میں فریق یا خاموش تماشائی نہیں بننا چاہیے جن سے انتقام' رعونت اور

بین الاقوامی دیوالیہ پن کی بو آتی ہو۔

○ آیئے' سب لوگ انصاف کے لیے کھڑے ہو جائیں اور دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے کارپردازوں کو قانون کے مطابق سزا دینے کے لیے اجتماعی کوشش کریں' اور دنیا میں دہشت گردی کی جڑ میں پائی جانے والی ناانصافیوں' استحصالوں اور بالادستی کی پالیسیوں کو ختم کرنے کے لیے کوشش کریں!

یہ ہے اُمت مسلمہ کا اصولی اور حقیقی موقف۔ تمام مسلمان حکومتوں اور تنظیموں کا فرض ہے کہ اس نازک لمحے میں حکمت' دیانت اور جرأت کے ساتھ اپنے اس موقف پر ڈٹ جائیں' محض قوت' دھونس اور جبر کے آگے ہتھیار نہ ڈالیں' اور نہ پروپیگنڈے کی یورش سے مغلوب ہوں اور نہ کسی ایسے جوابی ردّعمل کی راہ اختیار کریں' جو حق وصواب سے دُور ہو۔

امریکی نظام کی ناکامی

جو سوال اس وقت سب سے اہم ہے وہ یہ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور اس کے اصل ذمہ دار کون ہیں؟ بات محض شبہ اور انتقام کی نہیں' بے لاگ جستجو' تحقیق و تفتیش' نقد و احتساب اور حقیقت کی کھوج کی ہے۔ بدقسمتی سے اس سے توجہ ہٹائی جا رہی ہے اور سارے معاملات ایک ہیجانی انداز میں نمٹانے کی خطرناک غلطی کی جا رہی ہے۔ تعجب ہے کہ کوئی نہیں جو ہمت اور جرأت سے کہے کہ بادشاہ کو پہلے اپنے جسم پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ کہیں وہ لباس سے عاری تو نہیں؟

یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کون تھے اور ان کے اصل مقاصد اور ان کے پشتی بان کون تھے؟ مگر اس سے پہلے جواب طلب سوال تو یہ ہے کہ امریکہ کے اپنے نظام حکومت اور خصوصیت سے اس کے قومی سلامتی' جاسوسی اور پولیس کے نظاموں کی ناکامی اور اس ناکامی کے ذمہ داروں کے احتساب سے کلی اغماض کیوں برتا

جا رہا ہے؟ ایک ریل کا بھی حادثہ ہوتا ہے تو فوری اسباب کی تحقیق و تفتیش سے پہلے ادارے کے ذمہ داروں کا محاسبہ ہوتا ہے اور ان کو جواب دہی کے کٹہرے میں کھڑا کیا جاتا ہے۔

امریکہ کا جاسوسی کا نظام دنیا کا عظیم ترین اور مہنگا ترین نظام ہے:

صرف سی آئی اے (CIA) کا سالانہ بجٹ ۳۰ ارب ڈالر ہے اور دنیا میں اس کے ایک لاکھ ہمہ وقتی کارکن ہیں۔ ایف بی آئی (FBI) داخلی سلامتی کی ذمہ دار ہے' اس کا سالانہ بجٹ ۳ ارب ڈالر ہے۔ اس کے امریکہ میں ۵۵ مراکز اور ۲۷ ہزار ۸ سو کارکن ہیں۔ اس کے نظام کار میں کل بجٹ کا پانچواں حصہ صرف معلومات جمع کرنے کے لیے مختص ہے اور یہ نگرانی (surveillance) کی جدید ترین ٹکنالوجی استعمال کر رہے ہیں ـــــ ان کے علاوہ ایک ادارہ National Reconnaissance Office ہے جو جاسوسی سیارچوں (Spy Satellites) کی مدد سے زندگی کے ہر پہلو کی ہمہ وقتی نگرانی کرتا ہے اور اس کا سالانہ بجٹ ۶ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر ہے۔ ایک اور ادارہ نیشنل سیکورٹی اتھارٹی (NSA) ہے جس میں ۲۱ ہزار افراد کام کرتے ہیں اور اس میں معلومات جمع کرنے کا دنیا کا اعلیٰ ترین انتظام ہے۔ اس کے کارکن دنیا کی ہر اہم زبان کے ماہر ہیں۔ ان کے علاوہ خفیہ معلومات حاصل کرنے والی نو مزید ایجنسیاں ہیں جو فوج' وزارت خزانہ' وزارت مواصلات اور وزارت بجلی و پانی کے تحت کام کرتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا بجٹ ایک ارب ڈالر سالانہ ہے۔ ان سب کے علاوہ ایک نیشنل امیجری اینڈ میپنگ ایجنسی ہے جس کا سالانہ بجٹ ایک ارب ۲۰ کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔ اس ایجنسی کا کام صرف یہ ہے کہ امریکہ کی زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے نقشے محفوظ کرے۔ اس طرح صرف انٹیلی جنس اور نگرانی کے ادارے سالانہ ۵۰ ارب ڈالر کے بجٹ سے قومی سلامتی اور حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے علاوہ

معلومات حاصل کرنے کی Non-Intelligence ایجنسیوں کا سالانہ بجٹ ۲۷ ارب ڈالر ہے۔ گویا صرف جاسوسی اور دوسری معلومات کے حصول کے لیے امریکہ سالانہ ۷۷ ارب ڈالر تک خرچ کر رہا ہے۔[7]

اس کے باوجود اس پورے نظام کو ایک ایسے مربوط اور کثیر جہتی منصوبے کی کوئی سن گن تک نہیں لگی جس میں بقول امریکہ ''۱۹ خودکش ہائی جیکر شامل تھے جنھوں نے دو مختلف ہوائی اڈوں سے کارروائی کا آغاز کیا''۔ جس میں ان کے علاوہ کم از کم ۳۰ مزید افراد کے شامل ہونے کا اندازہ ہے' جو کئی مہینے سے اس اقدام کی منصوبہ بندی کر رہے تھے' بڑے شہروں میں رہ رہے تھے' کینیڈا اور جرمنی کے سفر کر رہے تھے۔ جو مبینہ طور پر کلبوں میں شراب نوشی اور رقص و سرود کی محفلوں میں شریک تھے' جم خانوں میں تن سازی کر رہے تھے اور ہوائی پرواز کے اداروں کے باقاعدہ ممبر کی حیثیت سے ہوا پیائی کی مشقیں کر رہے تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنی خطیر رقم خرچ کر کے اور اتنے جدید اور ترقی یافتہ نظام کی موجودگی میں امریکہ کی قیادت کو ایسی سازشوں اور خوف ناک منصوبوں کی ہوا بھی نہیں لگتی تو پھر اس نظام کا احتساب نہ کرنا کس طرح قابل فہم ہو سکتا ہے۔ نہ سی آئی اے کے سربراہ نے استعفا دیا ہے' نہ ایف بی آئی کے سربراہ کو معطل کیا گیا ہے' نہ اٹارنی جنرل جو اس پورے نظام کا سربراہ ہے اس پر کوئی آنچ آئی ہے۔ بلکہ اٹارنی جنرل صاحب نے پوری دیدہ دلیری سے فرمایا ہے: ''اب سوال انصاف کا نہیں' جوابی کارروائی کا ہے!'' اصل ناکامی امریکہ کے اپنے نظام کی ہے--- محض اسامہ بن لادن اور افغانستان پر ملبہ گرانے سے امریکہ کے اپنے نظام کی ناکامی پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

یہ ناکامی اور بھی شرمناک ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں' کہ اس سے قبل دہشت

۷- ہفت روزہ گارڈین' ۲۰ تا ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء' ص ۵

گردی کے امکانات اور خطرات کے بارے میں بحث و گفتگو کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ مثال کے طور پر:

- فروری ۱۹۹۳ء میں اسی ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم کا دھماکا ہو چکا تھا جس میں چھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔
- اپریل ۱۹۹۵ء میں اوکلاہاما کا واقعہ ہوا تھا جو ایک امریکی دہشت گرد ٹم میکوی (Tim McVeigh) کا ''کارنامہ'' تھا [یہ دہشت گرد ویت نام میں لڑنے والا سفید فام سابق امریکی فوجی تھا] اس حادثے میں ۱۶۸ افراد ہلاک ہوئے تھے۔
- المیۂ ستمبر سے دو ماہ پہلے ٹم میکوی کو جان بخشی کی ملکی اور عالمی اپیلوں کے باوجود پھانسی دی گئی تھی اور اس گروہ کی طرف سے انتقامی کارروائی کا خطرہ موجود تھا۔
- اگست ۱۹۹۸ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں ہونے والی دہشت گردی میں ۲۲۴ افراد ہلاک ہوئے تھے اور اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔
- اکتوبر ۲۰۰۰ء میں امریکی بحری جہاز یو ایس ایس کول کا واقعہ ہوا' جس میں ۱۷ افراد ہلاک ہوئے تھے اور اس کا مقدمہ بھی زیرِ سماعت تھا۔
- اسی سال مارچ میں امریکی سینٹ کے انٹیلی جنس کمیشن نے متوقع دہشت گردی سے متنبہ کیا تھا اور یہ رپورٹ حال ہی میں شائع ہو چکی تھی۔
- حال ہی میں سی آئی اے نے ان دو افراد کے بارے میں تصویر شائع کر کے متوجہ کیا تھا' جن کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ ۱۱ ستمبر کی ہائی جیکنگ میں شریک تھے۔
- ۷ ستمبر کو ایک اور وارننگ موصول ہوئی تھی---

ان سب کی موجودگی میں تمام خفیہ اور برسرِزمین ایجنسیوں کی ناکامی اصل لمحہ فکریہ ہے--- لیکن اس کا کوئی ذکر نہ امریکی صدر کے بیانات میں ہے اور نہ میڈیا کی لفظی جنگ میں۔

اسامہ' ملزم یا مجرم؟

سارا زور ایک فرد اسامہ بن لادن پر لگا دیا گیا' جو دس سال سے جلاوطنی اور خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ جس کے پاس نہ ٹیلی فون ہے اور نہ باہر کی دنیا سے رابطے کا کوئی اور ذریعہ ہے۔ وہ ایک ایسے ملک میں ہے جس کی برسوں سے شدید ترین نگرانی ہو رہی ہے' جس کے پاس نہ جدید ٹکنالوجی ہے اور نہ سفارتی یا ابلاغی سہولتیں' جس کے پاس کوئی عالمی میڈیا تو کیا انگریزی میں دنیا تک اپنی بات پہنچانے کی سہولت تک میسر نہیں۔ جس کے خلاف برسوں سے پابندیاں لگی ہوئی ہیں' مواصلات کا نظام غیر موثر ہے اور جس کے بنک بیرونی دنیا سے کوئی مالی معاملہ نہیں کر سکتے۔ پھر بھی تمام دنیا کو یہی یقین دلایا گیا کہ وہ افغانستان کے ایک غار سے یہ سب تماشے کر رہا ہے۔

اسامہ کی دولت کا بھی بڑا شور ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جن ۳۰ کروڑ ڈالر کا ذکر کیا جاتا ہے (اگر درست بھی ہو تو خود امریکہ کے صرف جاسوسی کرنے کے لیے ۵۰ سے ۷۷ ارب ڈالر اور دفاعی بجٹ کے ۳۵۰ ارب ڈالر کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتے ہیں) ان کی بھی حقیقت یہ ہے کہ ۱۲ سال پہلے اسامہ بن لادن کو اپنے والد کی میراث میں ۳۰۰ کروڑ ڈالر نہیں' ۸ کروڑ ڈالر ملے تھے۔ ان میں سے جو کچھ اس کے پاس تھے' انھیں ۱۹۹۶ء میں سعودی شہریت ختم ہونے پر ساری دنیا میں منجمد کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ نہ کوئی سرمایہ کاری کر سکتا ہے' نہ کسی بنک میں حساب رکھ سکتا ہے اور نہ اس کے لیے کسی کاروبار میں عملاً شرکت ممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر چند کروڑ ڈالر اس کے پاس تھے بھی' تو ان سے کیا کچھ اور کب تک کیا جا سکتا ہے۔ اکانومسٹ' لندن نے اپنے ادارتی مضامین میں اعتراف کیا ہے کہ "بن لادن کی دولت کی بات میں بڑا مبالغہ ہے"۔[8] بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بن لادن اور اس کے رفقا سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہیں:

۸- اکانومسٹ' ۲۲ ستمبر ۲۰۰۱ء' ص ۱۷

مشرقی افریقہ کے بم بازوں کے مقدمے میں ایک حالیہ گواہی سے بہرحال ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ بن لادن کے سابق رفقا نے بتایا ہے کہ وہ سرمائے کی کمی کا شکار ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے آدمی پریشانی کا شکار ہیں اور ان کے درمیان مسلسل جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے ایک سابق اکاؤنٹنٹ کو' جو امریکہ کا سب سے بڑا گواہ ہے' جب قرض دینے سے انکار کیا گیا تو وہ القاعدہ سے باہر آ گیا۔[9]

اگر مالی وسائل کے بارے میں حقائق یہ ہیں تو پھر اسامہ کے خلاف ساری مہم سخن سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ خود امریکی عدالت میں سفارت خانوں پر حملے کا جو مقدمہ چل رہا ہے' اس میں اسامہ کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں ہوسکی۔ اکانومسٹ اپنے اسی مضمون میں اعتراف کرتا ہے:

بہرحال سرکاری وکیل یہ ثابت نہیں کر سکے کہ مسٹر بن لادن نے حملوں کا حکم دیا۔[10]

حملے کس نے کیے؟

اگر اسامہ بن لادن اور افغانستان کے لیے اس نوعیت کی منظم' ہمہ جہتی اور اعلیٰ منصوبہ بندی والی کارروائی ممکن نہیں اور نہ اس کی توقع کسی اور عرب تنظیم سے کی جاسکتی ہے (اور بن لادن کے سوا کسی دوسرے گروہ کی طرف امریکی اور مغربی میڈیا اور حکومتیں کوئی اشارہ تک نہیں دے رہیں) تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ہولناک کارروائی کا مرتکب کون ہوسکتا ہے۔ ہم صرف تاریخی شواہد اور حالیہ قرائن کی بنیاد پر چند مفروضوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۹- اکانومسٹ' ۱۵ستمبر ۲۰۰۱ء' ص ۱۹   ۱۰- ایضاً

پہلا امکان یہ ہے کہ یہ کارروائی کسی منظم امریکی گروہ کی طرف سے ہوئی جو معاشرہ کا باغی اور نظامِ حکمرانی سے برگشتہ ہو۔ حالیہ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئی ہیں جو ان خدشات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ ملک میں جرائم کی تو کبھی کمی نہیں تھی لیکن پچھلے دنوں اسکول کے بچوں کو منظم انداز میں ہلاک کرنے کے کئی واقعات رونما ہوئے جن میں کیلی فورنیا میں ایک ہی ہلّے میں اسکول کے ۱۲ طلبہ کی ہلاکت کی یادیں تازہ ہیں۔ ٹم میکوی نے اوکلاھاما میں ۱۶۸ افراد کو ہلاک کیا اور اس سے زیادہ کو ہلاک کرنے کی خواہش کا عدالت میں اظہار کیا۔ یہ واقعہ ٹم میکوی کو پھانسی دینے کے دو ماہ کے اندر واقع ہوا ہے اور یہ دہشت گردی بھی ٹم میکوی کے گروہ کا کارنامہ ہوسکتا ہے۔ ایک اور امریکی دہشت پرست گروہ صدر بش کی ریاست ٹکساس کا Jaco نامی منظم گروہ ہے، جس نے ایک پورے قصبے کو آگ لگا کر تباہ کیا۔ ڈیوڈ کوریش اور اس کے پیروکار بھی ایک باغی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف سے تخریب کاری کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوچنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ اس کارروائی کا فائدہ کس کو ہوسکتا ہے۔ خود امریکہ میں ایسے عناصر ہیں جو ریاست کے اداروں پر اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور جو آزادی اظہار و عمل پر مختلف قسم کی پابندیوں کے خواہاں ہیں۔ وہ ایسی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جمہوری آزادیوں کو لگام دی جا سکے اور ان غالب اور مفاد پرست طبقات کی گرفت ملک پر مضبوط ہو سکے۔ وہ ادارے بھی ہیں جو مزید سرکاری وسائل کے طلب گار ہیں جن میں سیکورٹی ایجنسیاں بھی ہیں۔ امریکہ کی اسلحہ سازی کی صنعت اور عسکری صنعتی لابی کا بھی ایک کردار ہوسکتا ہے۔

اس خدشے کو ان معلومات سے بھی تقویت ملتی ہے جو حادثے سے قبل اسٹاک ایکسچینج کی غیر معمولی سرگرمی کے بارے میں چونکا دینے والے اعداد و شمار سے حاصل ہوئی ہیں۔ لندن روزنامہ انڈی پنڈنٹ کے تجارتی نمایندہ نے لکھا: ۶ ستمبر کو (واضح رہے کہ ۸ اور ۹ ستمبر کو ہفتہ اور اتوار کی چھٹی تھی) امریکہ کی ان دونوں ہوائی کمپنیوں کے حصص کی

فروخت میں غیر معمولی سرگرمی نظر آئی جن کے جہاز اس حادثے میں استعمال ہوئے ہیں اور جن کے حصص کی قیمت حادثے کے بعد ایک دم گر گئی ہے۔ اس وقت تو اسے نظر انداز کر دیا گیا' مگر اب یہ سوال اٹھ رہا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ایک دن میں یونائیٹڈ ایر لائن کے دو ہزار معاہدے ہوئے' جو اس سے پیش تر یومیہ کاروبار کے اوسط سے ۲۸۵ گنا زیادہ تھے۔ اس دن ایک حصہ کی قیمت ۳۰ ڈالر تھی جو حادثے کے بعد گر کر ۱۸ ڈالر رہ گئی۔ اسی طرح امریکن ایر لائن کے حصص کی فروخت حادثے سے قبل دو تین دن میں اوسط سے ۶۰ گنا زیادہ تھی۔ پھر ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں کام کرنے والی دو اہم بین الاقوامی مالیاتی کمپنیوں یعنی مورگن اسٹینلے اور مارش اینڈ میک لینن کے حصص ان دنوں اوسط کے مقابلے میں ۲۵ گنا اور ۱۰۰ گنا زیادہ فروخت ہوئے۔ سرمایہ کاری کے رجحانات کا ایک ماہر جون ناجارین (Jon Nagarian) ان غیر معمولی سودوں پر اپنے استعجاب کا اظہار یوں کرتا ہے:

> جب ہم اتنے غیر معمولی سودے دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔[11]

صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض عناصر کو علم تھا کہ کچھ ہونے والا ہے اور انھوں نے اس سے کروڑوں ڈالر کمائے۔

لیکن اس ہولناک واقعے سے سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل کو ہوا۔ جس نے اسے فلسطینیوں کو امریکہ کے غم و غصے کا نشانہ بنانے' اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے اور نام نہاد امن کے عمل کو سبوتاژ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ حادثے کے آدھے گھنٹے کے اندر ہنری کسنجر نے اسامہ بن لادن کا نام لیا اور پورے نیٹ ورک کو ختم کرنے کی بات کی۔ اسرائیل کے وزیراعظم شیرون نے حادثے کے فوراً بعد کہا کہ: ''عرفات' ہمارا لادن ہے'' اور عرفات سے

۱۱- دی انڈی پنڈنٹ' ۲۰ ستمبر ۲۰۰۱ء

اپنی طے شدہ ملاقات منسوخ کر دی۔ روزنامہ دی انڈی پنڈنٹ کا نمائندہ یروشلم سے لکھتا ہے:

> اسرائیل' امریکہ کے اس المیے کو فلسطینیوں سے اپنے تنازعے میں سیاسی فائدے حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شیرون اور ان کے ساتھی' عرفات کا اسامہ بن لادن سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ امریکہ میں ان حملوں نے فلسطینیوں کو تنہا کر دیا ہے اور مغرب میں ان کے لیے جو بچی کھچی ہمدردی تھی' اسے بہالے گئے ہیں۔[12]

یہ بھی ایک معنی خیز پہلو ہے کہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں جن ۴۶ ممالک کے لوگوں کی ہلاکت کی خبر دی ہے' ان میں اسرائیل کا کوئی ایک بھی شہری شامل نہیں ہے۔ نیویارک میں بہت زیادہ یہودیوں کی رہائش ہے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ۴ ہزار سے زیادہ یہودی کام کرتے تھے' مگر مرنے والوں کے بارے میں جو معلومات اب تک شائع ہوئی ہیں' ان میں یہودیوں کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک اطلاع ۵'۶ اسرائیلیوں کی گرفتاری اور تفتیش کی شائع ہوئی تھی مگر اسے فوراً دبا دیا گیا۔ کینیڈا سے سٹرن انٹل (Stern Intel) نے خبر دی ہے کہ امریکہ کے فوجی جاسوسی ذرائع کے مطابق اس میں اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کا ہاتھ ہے۔ ایران کے رہبر خامنائی نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ:

> اس کا ثبوت موجود ہے کہ امریکہ کے بڑے شہروں میں حالیہ حملوں میں صیہونی ملوث تھے۔[13]

اگر اسرائیل اور صیہونی تحریک کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو موساد کے کردار کے

۱۲- ایضاً' ۱۶ ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۳- تہران ٹائمز' ۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ء

خدشے کو تقویت ملتی ہے۔دوسری عالمی جنگ کے دوران صیہونی دہشت گردوں نے خود یہودی تارکین وطن سے بھرے ہوئے ایک جہاز کو اس لیے ڈبو دیا تھا کہ برطانوی حکومت نے ان غیر قانونی یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی ۔ اس طرح انھوں نے عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے خونی ڈراما رچایا۔ بیت المقدس میں پرنس ایڈورڈ ہوٹل کی تباہی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ سے قبل خود امریکہ کی نیوی کے ایک جہاز ''یو ایس ایس لبرٹی'' کو اسرائیل نے میزائل مار کر ڈبو دیا تھا' کیونکہ اس نے مصر پر اسرائیل کے اچانک حملے کی تیاریوں کو مانیٹر کر لیا تھا۔ اس پس منظر میں اور ان سیاسی فوائد کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جو اسرائیل حاصل کر رہا ہے اور عربوں کو پوری مغربی دنیا میں نفرت اور انتقام کا نشانہ بنوا رہا ہے۔ یہ شبہ کافی تقویت حاصل کر لیتا ہے کہ اس حادثے کے پیچھے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی کا ہاتھ ہے جو اس نوعیت کے آپریشن کی صلاحیت اور مہارت رکھتی ہے۔[۱۴]

ایسا ہی ڈراما روس میں چیچنیا کے خلاف کارروائی سے پہلے ماسکو اور ولگا ڈونسک میں (۱۳ ستمبر ۱۹۹۹ء) میں دو آٹھ منزلہ عمارتوں میں بم کے دھماکوں کی شکل میں کیا گیا تھا۔ جن میں ۳۰۰ افراد کی ہلاکت واقع ہوئی اور جسے بنیاد بنا کر روس نے چیچنیا پر نئی فوج کشی کی تھی۔

انڈی پنڈنٹ کا مضمون نگار پیٹرک کوک برن' نیو یارک اور واشنگٹن کی حالیہ دہشت گردی کے پس منظر میں ماسکو سے اس واقعے کے بارے میں وہاں کی رائے عامہ کے حالیہ احساس کو یوں بیان کرتا ہے:

دس میں سے صرف ایک کو یقین تھا کہ یہ چیچن کا کام ہے۔صرف آغاز میں ہمارا

14- Caroline F. Keeble *The Agent: The Truth Behind The Anti-Muslim, Campaign in America*. Springfield, 1999, pp 120

یہ خیال رہا کہ یہ چیچن نے کیا ہے۔ اب ہم سمجھتے ہیں کہ کریملن کے لوگوں نے اقتدار میں رہنے کے لیے یہ کیا۔

یہ ہیں میکاولی سیاست کے طریق واردات۔ نیویارک اور واشنگٹن میں جو کچھ ہوا اس راز کا پردہ بھی ایک دن ضرور ہٹے گا' لیکن آثار تو اب بھی نظر آ رہے ہیں کہ ''کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں!''

جن افراد پر ہوائی جہازوں کو اغوا کرنے کا الزام ہے ان کے بارے میں جو متضاد باتیں سامنے آ رہی ہیں وہ سارے معاملے کو مخدوش بنا دیتی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ القاعدہ کے مجاہد تھے اور ساتھ ہی ان کی شراب نوشی' رقص و سرود اور گرل فرینڈز کے ساتھ رنگ رلیوں کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں--- ایک طرف جہاد اور حوروں کی باتیں ہیں اور دوسری طرف یہ طرز زندگی' ان میں کیا مطابقت ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سخن سازی کے ذمہ داروں کو اسلامی آداب جہاد اور شہادت کی الف بے سے بھی واقفیت نہیں۔ جن انیس افراد کے نام سامنے لائے گئے ہیں ان میں کم از کم ایک عیسائی بھی ہے۔ کیا وہ عیسائی بھی جہاد اور شہادت کا طلب گار تھا۔ ان میں سے کم از کم پانچ افراد کے بارے میں تو یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ وہ زندہ ہیں' سعودی عرب اور مراکش میں موجود ہیں اور ان کا کوئی تعلق ہوائی جہازوں کے اغوا سے نہیں۔ بلکہ ان میں سے تین نے تو کہا ہے کہ وہ امریکہ کے ابلاغ عامہ کے اداروں کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ کریں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو نام دیے گئے ہیں' وہ جھوٹے ہیں اور اصل مجرموں کا کسی کو پتہ نہیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اوکلاہاما کے حادثے کے موقع پر بھی عربوں ہی پر الزام دھرا گیا تھا اور ان کے خلاف ملک گیر مہم شروع ہو گئی تھی۔ وہ تو اتفاقاً ٹم میکوی گرفت میں آ گیا اور معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ایک امریکی دہشت گرد کا کیا دھرا تھا۔ مقدمے کے دوران یہ حقائق بھی سامنے آئے کہ اس کے گروہ میں ۵۰۰ تک افراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن گروہ اتنا منظم ہے کہ ٹم میکوی کے ساتھ جو دو افراد گرفتار ہوئے تھے ان پر بھی ٹم میکوی نے کوئی حرف

نہ آنے دیا اور تمام قرائن و شواہد (circumstantial evidence) کے باوجود ان کو بری کر دیا گیا۔

عدالت کے سامنے ٹم میکوی کے بیانات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس نے اس دہشت گردی کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اسے حق بجانب قرار دیا اور صاف الفاظ میں کہا: ''میں امریکہ کو متنبہ کرنا چاہتا تھا اور زیادہ سے زیادہ افراد کو ہلاک کرنا میرا مقصد تھا''۔ اس نے آخری وقت تک معافی نہیں مانگی بلکہ اپنی موت کے وقت جو نظم پڑھی اس میں اپنے کارنامے پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے۔ ٹم میکوی تنہا نہیں' اس کے اپنے گروہ میں سیکڑوں افراد ہیں اور اس جیسے دسیوں دہشت پرست گروپ امریکہ میں سرگرم عمل ہیں۔

۱۱ ستمبر کی تباہی جس منظم انداز میں' جس اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ' اور جتنے باہمی ربط و ارتباط (coordination) کے ساتھ کی گئی وہ کسی بیرونی گروہ کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ جب اس میں امریکہ کے بہت ہی تربیت یافتہ' باصلاحیت' well-connected اور پورے نظام کے راز آشنا شریک ہوں۔ انھوں نے عربوں کے ناموں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور حکومت اور ذرائع ابلاغ' اسامہ اور افغانستان کو قربانی کے بکرے کے طور پر استعمال کر کے اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے اور اصل مجرموں تک رسائی سے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مجرمانہ فعل' عالم اسلام کے خلاف کھلی جارحیت کے مترادف ہے۔

ایک اصولی مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی ملزم پر جرم ثابت ہونے سے پہلے محض شبہہ کی بنا پر کوئی کارروائی صریح ظلم اور فتنہ و فساد کی جڑ ثابت ہوتی ہے۔ آج امریکہ نے طاقت کے نشے میں مست ہو کر محض شبہہ کی بنیاد پر افراد ہی نہیں اقوام اور ملک کو تباہ کرنے' انھیں پتھر کے دور کی طرف لوٹانے' اور نیست و نابود کرنے کی بات کی ہے اور قانون کی حکمرانی' عالمی انصاف اور ہوش و خرد کی بات کرنے والوں کو سب و شتم کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ فطرت کے خلاف اور انسانیت کے لیے قطعاً ناقابل قبول ہے۔

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرا
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

دہشت گردی کے اسباب

امریکہ اور مغربی ممالک کی قیادت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جسے وہ دہشت گردی کہہ رہے ہیں: اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس نوعیت کے مسائل و معاملات سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے؟

دہشت گردی کا جو پہلو ناقابل دفاع اور لائق مذمت و مزاحمت ہے، وہ سیاسی اور مبنی برحق مقاصد کے حصول کے لیے ایسے طریقے اور راستے اختیار کرنا ہے جس کے نتیجے میں معصوم انسانوں کی جانیں ضائع ہوں۔ یہ ناقابل معافی جرم ہے اور اس سے لوگوں کو باز رکھنا انسانیت کی خدمت اور خود ان نادان انسانوں سے خیرخواہی ہے جو جان بوجھ کر یا محض حالات کی رَو میں ایسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر معاملات کی اصلاح کے جائز اور معقول راستے بند کر دیے جائیں، اگر محض قوت اور ہٹ دھرمی، مفاد پرستی، تعصب، غرور، مادی اور عسکری برتری اور علاقائی یا عالمی بالادستی کے مذموم مقاصد کے لیے دوسرے انسانوں کو ان کے حق سے محروم رکھا جائے اور اصلاح احوال کے امکانات کو معدوم کر دیا جائے گا تو اس کا فطری ردعمل رونما ہوتا ہے، جو صحیح کے ساتھ غلط راستے بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے تاریخ کا سبق یہ ہے کہ ظلم اور ناانصافی کی موجودگی میں اور ان کی سرپرستی کے ساتھ اور ان اسباب سے صرف نظر کر کے جو افراد، گروہوں اور اقوام کو تشدد پر مبنی جدوجہد کی راہ پر ڈالتے ہیں، اس سے حالات کی اصلاح ممکن نہیں۔

امریکہ اور عالمی سرمایہ داری کے خلاف جو نفرت اور بے زاری ہے وہ عالمی حقائق ہیں اور محض عسکری اقدامات سے دہشت گردی کا خاتمہ ناممکن ہے۔ برطانوی ممبر پارلیمنٹ

جارج گیلرے نے پارلیمنٹ میں اپنے خطاب میں صحیح کہا تھا: ''اگر آپ ایک بن لادن کو ماردیں گے تو ایک ہزار بن لادن پیدا ہو جائیں گے''۔

اصل مسئلہ ان اسباب کی کھوج اور ان کی اصلاح ہے جن کے نتیجے میں دنیا کے بیش تر علاقوں میں بشمول امریکہ اور یورپ بغاوت اور بے چینی کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور مظلوم انسان اپنی جان پر کھیل جانے کے لیے مجبور ہو رہے ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ بموں' میزائلوں اور انسانی بستیوں پر آگ برسانے سے نہیں لڑی جا سکتی۔ یہ جنگ تو اسی نوعیت کی جنگ ہے جو غربت' افلاس' بیماری اور جہالت جیسے فتنوں کے خلاف لڑی جاتی ہے۔ یہ غصہ اور طاقت سے نہیں' حکمت اور تدبیر سے لڑی جا سکتی ہے۔ انسانی مسائل کی گرہ کشائی کا راستہ ترک کر کے محض عسکری قوت سے جب بھی انسانوں کو دبانے کی کوشش ہوئی ہے وہ ناکام رہی ہے۔ تشدد کو بڑھانے اور ظلم میں اضافہ کرنے کا اس سے زیادہ موثر کوئی اور طریقہ نہیں کہ انتقام کی آگ میں جل کر عوامی تحریکوں کو قوت سے کچلنے کی کوشش کی جائے۔

عالمی استعمار نے دو سو سال یہ جنگ لڑی اور بالآخر آزادی کی تحریکات سے معاملہ کرنا پڑا اور کل کے دہشت گرد آج کے سیاسی قائد اور حکمران بن گئے۔ امریکہ اس کا تجربہ ویت نام' چلی اور کمبوڈیا میں کر چکا ہے۔ روس نے افغانستان میں یہی کھیل کھیلا اور پھر بھی سبق نہ سیکھا اور آج چیچنیا میں پھر اسی حماقت اور ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ برطانیہ نے ساری دنیا میں شکست کھانے کے بعد بالآخر شمالی آئرلینڈ میں بیس سال کی عسکری جنگ کے بعد اسی شین فین سے معاملات طے کیے جس کا نام لینا اور جس کی قیادت کی آواز اور تصویر بھی ریڈیو اور ٹی وی پر ممنوع تھی۔

اسرائیل' فلسطین میں یہی کھیل کھیل رہا ہے اور بھارت' جموں و کشمیر اور سولہ دوسرے علاقوں میں سیاسی مسائل کے عسکری حل کی ناکام کوشش میں گرفتار ہے۔ مسئلے کے حل کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں کہ ٹھنڈے دل سے امن و آشتی کو تہ و بالا کرنے والے عناصر اور اسباب پر غور ہو اور دہشت گردی کی طرف لے جانے والے عوامل سے نجات پائی جائے۔

خود احتسابی کی ضرورت

مغرب میں بھی جن لوگوں کی نگاہ زندگی کے حقائق اور تاریخ کے دیے ہوئے سبق پر ہے وہ بھی یہی بات کہہ رہے ہیں۔ روزنامہ انڈی پنڈنٹ کے مشہور سیاسی تبصرہ نگار رابرٹ فسک (Robert Fisk) نے اس سانحے پر شرق اوسط کے المیے کے تناظر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے' وہ امریکی قیادت ہی نہیں' دنیا کے سب حکمرانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے:

اب بات یہاں تک آ گئی ہے کہ شرق اوسط کی مکمل جدید تاریخ' سلطنت عثمانیہ کا زوال' اعلان بالفور' لارنس آف عریبیہ کی دروغ گوئی' عرب بغاوت' ریاست اسرائیل کا قیام' عربوں اور اسرائیل کے درمیان چار جنگیں اور عربوں کی سرزمین پر اسرائیل کے وحشیانہ قبضے کے ۳۴ سال...... سب کچھ چند گھنٹوں میں مٹ گیا۔ جب پسے ہوئے اور ذلیل کیے گئے لوگوں کی نمایندگی کا دعویٰ کرنے والوں نے ایسی مرعوب کن بے رحمی اور چالاکی سے پلٹ کر حملہ کیا جو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو یقینی تباہی سے دوچار ہوں۔ کیا یہ مناسب اور اخلاقی رویہ ہوگا کہ اس کے بارے میں اس قدر جلدی میں لکھ دیا جائے خصوصاً جب کہ کوئی ثبوت نہیں' گواہی میں معمولی سی بات موجود نہیں' اور بربریت کا آخری واقعہ جو اوکلاہاما میں ہوا تھا وہ اپنے ہی گھر کے پروردہ امریکیوں کا کیا دھرا تھا؟ میرا خدشہ ہے کہ ایسا (اب بھی) ہے۔ امریکہ حالت جنگ میں ہے اور اگر میں فاش غلطی نہیں کر رہا تو شرق اوسط میں کئی ہزار لوگ مزید مارے جائیں گے اور شاید امریکہ میں بھی۔ ہم میں سے کچھ لوگ ''آنے والی امکانی تباہ کاری'' سے خبردار کرتے رہے لیکن ہم نے اس ڈراؤنے خواب کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ کیا۔

یہ جمہوریت اور دہشت گردی کی جنگ نہیں ہے جس کا یقین آیندہ دنوں میں دنیا کو دلایا جائے گا۔ یہ ان امریکی میزائلوں کے بارے میں بھی ہے' جو فلسطینیوں

کے گھروں پر گرتے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں بھی ہے جب امریکی ہیلی کاپٹروں نے ۱۹۹۶ء میں لبنانی ایمبولینس پر میزائلوں سے حملہ کیا تھا اور اس کے چند دن بعد 'قانا' نامی گاؤں میں امریکہ نے گولے داغے تھے' امریکہ کے اتحادی' اسرائیل کی پروردہ لبنانی ملیشیا نے مہاجر بستیوں میں قتل و غارت' لوٹ مار اور عصمت دری کا بازار گرم کیا تھا۔ کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ میں جو کچھ ہوا ہے وہ ناقابل بیان شر ہے۔ ۲۰ ہزار یا ۳۵ ہزار معصوم لوگوں کی ہلاکت کے سانحے پر فلسطینیوں کا اظہار مسرت صرف اُن کی مایوسی کا مظہر نہیں ہے بلکہ سیاسی عدم بلوغ کا بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے دشمن اسرائیل پر اسی قسم کے الزامات عائد کرتے رہتے ہیں یعنی غیر متناسب کارروائی۔

ہمیں متنبہ کر دیا گیا تھا: زوردار تقریروں' امریکہ کے قلب پر حملے کرنے کے عہد' اور ''امریکی سانپ'' کا سر کچلنے کے اعلان کے بارے میں۔ ہم انھیں خالی خولی دھمکیاں سمجھتے رہے۔ قدامت پسند' غیر ترقی یافتہ' غیر جمہوری اور بدعنوان حکمرانوں کے گروہ اور چھوٹی سی اشتعال انگیز تنظیمیں اسی طرح کے بے بنیاد دعوے کس طرح پورے کر سکتے ہیں! اب ہم جان چکے ہیں۔ گذشتہ روز کی تباہی و بربادی کے چند گھنٹوں کے بعد' میں امریکہ اور اُس کے اتحادیوں پر ہونے والے اُن بڑے اور غیر معمولی حملوں کا سوچنے لگا' جو گذشتہ روز کے واقعے کے بعد بہت ہی ہیچ اور معمولی محسوس ہونے لگے ہیں۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو خودکش بم بازوں نے ۲۴۱ امریکی ملازمین اور ۱۰۰ فرانسیسی چھاتہ برداروں کو ہلاک کر دیا تھا' اُس وقت تک ایسے حملوں کی کوئی نظیر موجود نہ تھی۔ بحریہ پر حملے اور فرانسیسیوں کی تباہی کے درمیان سات سیکنڈ کا وقفہ ہوا تھا۔ اس کے بعد سعودی عرب میں قائم امریکی اڈوا ،، حملے ہوئے تھے اور پچھلے برس عدن میں امریکی بحری جہاز کو ڈبونے کی کوشش تقریباً کامیاب ہوگئی تھی۔ ہم شرق اوسط کے نئے ہتھیار: مایوس

لیکن جان پر کھیل جانے والے خودکش بم باز کو پہچاننے میں بالکل ناکام رہے، جس کی برابری امریکی یا دوسرے یورپی نہیں کرسکتے۔ (انڈی پنڈنٹ)

رابرٹ فسک اپنے استدلال کو اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں:

اب لازمی اور فطری طور پر، بالکل غیر اخلاقی طرز اختیار کرتے ہوئے گذشتہ ایام کی تاریخی غلطیوں، ناانصافیوں اور خون ریزیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، جو کل کے اس المیے کی پشت پر ہیں۔ ہمیں بتایا جائے گا کہ یہ بے مغز "دہشت گردی" ہے۔ اسے "بے مغز" قرار دینا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھنے کے قابل نہیں ہیں کہ تین عظیم مذاہب [اسلام، مسیحیت، یہودیت] کی سرزمین میں امریکہ سے کس قدر نفرت کی جاتی ہے تو پھر بلا مبالغہ ہمیں بے مغز کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک عرب سے معلوم کریں کہ وہ ۲۰، ۳۰ ہزار معصوم افراد کی موت کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ عرب مرد یا عورت، مہذب اور باشعور شہریوں کی طرح اسے ایک ناقابل برداشت جرم قرار دے گا لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ آخر ہم نے یہ الفاظ اُس وقت کیوں استعمال نہیں کیے جب پابندیوں کے باعث عراق میں ۵ لاکھ بچے ہلاک ہوگئے۔ جب لبنان میں، ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے ۱۷ ہزار ۵ سو شہری حملہ کر کے ہلاک کر دیے۔ ہم نے شرق اوسط میں ایک قوم کو یہ حق کیوں دیا کہ وہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کو نظرانداز کر دے اور اُن تمام ممالک پر پابندیاں عائد کر دے جنھوں نے انھیں نظرانداز کیا۔

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ گذشتہ ستمبر [۲۰۰۰ء] میں مشرق وسطیٰ میں جو شعلے بھڑک اُٹھے اُس کی کیا وجوہ تھیں۔ عرب علاقوں پر اسرائیل کا تسلط، فلسطینیوں کی علاقہ بدری، اسرائیل کے ٹارچر، ریاستی سرپرستی میں کرائے گئے قتل، ان سب معاملات کو چھپانا ہی چاہیے کیونکہ کوئی واقعہ بھی گذشتہ دن کی اجتماعی تباہ کاری کے لیے وجہ

ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ رویہ کہ ''اسرائیل پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا''---- ہم یقین کر سکتے ہیں کہ تاریخ کی میزان میں ہمارا کردار' کٹہرے میں خودکش بم بازوں کے شانہ بشانہ ہی ہوگا۔ اپنے وعدوں سے ہمارا انحراف' یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی' اس المیے پر منتج ہوئی۔ اسرائیل کے جنگی اخراجات اتنے طویل عرصے سے امریکہ کی جانب سے ادا ہو رہے ہیں کہ وہ اسے مفت ہی سمجھتا ہے۔ یہ اقدام غیر معمولی حوصلہ مندی اور دانش کا مظہر ہوگا کہ امریکہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر دنیا میں اپنے کردار پر' عربوں کی تکالیف پر امریکی حکومت کی بے حسی' اور اپنے موجودہ صدر کی بے عملی پر غور کرے۔

بے شک امریکہ یہ چاہتا ہے کہ وہ ''عالمی دہشت گردی'' کے خلاف جوابی کارروائی کرے' انھیں کون الزام دے سکتا ہے؟ ''دہشت گردی'' کے اشتعال انگیز اور کبھی کبھار نسل پرستی والے لفظ کے استعمال پر کون ہے جو امریکہ پر انگلی اٹھا سکتا ہے۔ ایسے لوگ مل جائیں گے جو ہر اُس تجویز کو فوراً رد کر دیں گے' جس میں عالم گیر پیمانے پر ہونے والی اس دہشت گردی کے عمل کی حقیقی تاریخی وجوہ تلاش کرنے پر زور دیا گیا ہو۔ لیکن اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم ایسے زبردست بحران کا شکار ہو جائیں گے جو ہم نے ہٹلر کی موت اور جاپان کی شکست کے بعد نہیں دیکھا۔ کوریا اور ویت نام کی اہمیت تو اب مقابلتاً کچھ بھی نہیں رہی۔

آٹھ سال قبل' میں نے ٹیلی وژن پر ایک سلسلے وار پروگرام میں یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد مغرب سے نفرت کیوں کرتی ہے۔ گذشتہ رات' مجھے وہ مسلمان یاد آئے جن کے حالات ریکارڈ کیے گئے تھے۔ جن کے گھر امریکہ کے بنائے ہوئے بموں اور ہتھیاروں سے تباہ ہو گئے تھے' وہ کہہ رہے تھے کہ خدا کے سوا کوئی ہماری مدد کو نہ آئے گا۔ مذہب'

ٹکنالوجی کے مدمقابل ہے۔ خودکش بم باز' جوہری طاقت سے نبرد آزما ہے۔

روزنامہ واشنگٹن پوسٹ میں ایک امریکی تجزیہ نویس پروفیسر رابرٹ جی کیویان (Robert G. Kavian) نے بھی بڑے واشگاف انداز میں خود احتسابی کی دعوت دی۔ یہ تبصرہ جسے ہفت روزہ گارڈین نے شائع کیا' سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے:

ہمارے سیاسی رہنماؤں میں سے کسی نے بھی ان اہم سوالات سے بحث نہیں کی ہے جو ہماری نئی حیثیت سے اٹھے ہیں۔ ملک اپنی خوش حالی میں مگن اور مطمئن ہے۔ باہر کی دنیا سے یا کہیں اور سے' ناخوش گوار خبروں کو ہم نظرانداز کرتے رہے۔ مگر ہماری طاقت کی حد اور حیثیت کیا ہے؟ اس کا ادراک ہمیں ۱۱ ستمبر کو ہوا' اگرچہ خاصی تکلیف اٹھا کر--- ہم دنیا کی رہنما عالمی طاقت ہیں لیکن ہم بہت کم دنیا کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جب ہم کرتے ہیں تو یہ عسکری صورت حال میں ہوتا ہے' جیسے خلیج کی جنگ یا کوسووا میں کیا گیا۔ حالیہ تاریخ میں کون سا سنگین مسئلہ ہے جو امریکہ کی پہل کاری کی وجہ سے حل ہوا ہو۔ دنیا کے مفلس ترین لوگوں کی مدد کے لیے ہم دوسرے صنعتی ملکوں کے مقابلے میں فی کس بہت کم دیتے ہیں۔ بہت سے ایسے مسائل' جن پر دوسرے سمجھتے ہیں کہ اجتماعی اقدام ضروری ہے' ہم الگ کھڑے ہوتے ہیں' مثلاً بارودی سرنگوں پر پابندی اور جوہری تجربات کی آزمایش سے لے کر ماحول میں گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج تک۔

--- بڑی طاقتوں کو' جس معاشرتی ماحول میں وہ کام کرتی ہیں اس کی بھی فکر کرنا چاہیے۔ ایک دشمن معاشرتی ماحول' ایک باوسائل دشمن کی طرح کسی بڑی طاقت کے نیچے سے موثر انداز سے زمین سرکا سکتا ہے۔ امریکیوں کو نوٹس لینا چاہیے کہ ان کے لیے ماحول بگڑ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں احساس ہے کہ غربت سے پیدا ہونے والی بیماریاں جو تقریباً ختم ہوگئی تھیں' مثلاً تپ دق' خود ہمارے اپنے

ملک میں انتقامی انداز میں ایک دفعہ پھر حملہ آور ہو رہی ہیں۔ ایڈز کی وبا بھی ایک مصیبت کی علامت ہے۔ ہم اس سے بھی واقف ہیں کہ دنیا کے محروم لوگ مال دار ممالک میں دولت کمانے کے لیے غیر قانونی داخلے کے لیے کیا کچھ خطرات مول لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ منشیات کی تجارت کو روکنے کے لیے ہم نے جو بھی رکاوٹیں عائد کیں' انھیں عبور کر لیا گیا۔

نئے عالمی نظام کا ایک پہلو فاصلے کا ختم ہونا ہے۔ اب زمین پر کوئی بھی جگہ دُور نہیں رہ گئی ہے۔ عالمی گاؤں میں غریب جانتے ہیں کہ وہ کتنے غریب ہیں' اور امیر کتنے بہتر حال میں ہیں۔ وسائل رکھنے والے غریب اپنی حیثیت کو خاموشی سے قبول نہیں کرتے بلکہ اسے تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ان مقاصد کے حصول کے لیے امریکہ میں گھس آئے ہیں' جیسا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ آور لوگ۔ یقیناً یہ ایک مختلف زمرے سے تعلق رکھتے ہیں: ایسے مظلوم جو اپنے پر ظلم کو ہضم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔[15]

یہ دو طویل اقتباس خود مغربی دنیا کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کی فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔

حقائق کو تسلیم کرنا ہوگا

امریکی اور یورپی قیادت جب تک مندرجہ ذیل حقائق کو تسلیم نہیں کرتی' فساد اور تباہی سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں:

۱- وہشت گردی صرف ایک علامت اور مظہر ہے' جب تک اس کے اسباب تک رسائی نہ حاصل کی جائے اور ان عوامل کا سدباب نہ کیا جائے جو اس کی طرف لے

۱۵- ہفت روزہ گارڈین' ۲۰-۲۶ ستمبر' ص ۳۰

جانے والے ہیں' حالات درست نہیں ہو سکتے۔

۲- دہشت گردی محض ایک جگہ اور ایک واقعے سے عبارت نہیں۔ ظلم جہاں بھی ہو' انسانیت کے لیے ایک خطرہ ہے۔ محض نیویارک اور واشنگٹن ہی میں مظلوموں کا خون نہیں بہا' یہ خون ساری دنیا میں بہہ رہا ہے' اور اس باب میں انسانوں کے درمیان تمیز و تفریق (discrimination) خود دہشت گردی کے فروغ کا ایک سبب ہے۔

۳- دہشت گردی اپنی ہر شکل میں قابل مذمت ہے۔ خواہ اس کے مرتکب افراد ہوں' یا گروہ اور حکومتیں۔

۴- بڑی طاقتوں اور حکمرانوں کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ وہ دہشت گردی کا شکار نہیں' اس کے اصل مرتکب ہیں۔ جب تک وہ اپنا رویہ اور پالیسی تبدیل نہیں کرتے حالات کی اصلاح ممکن نہیں۔

۵- تشدد کا جواب تشدد نہیں اور نہ دلیل کی جگہ جذباتی لفاظی (rhetoric) لے سکتی ہے۔ اصلاح کا راستہ مشکل بھی ہے اور جاں گسل بھی۔ مگر اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

۶- حالات کی اصلاح کے لیے سب کو تیار ہونا چاہیے' وہ بھی جو اصحاب اقتدار ہیں اور قوت و سطوت کے مالک ہیں اور وہ بھی جو مظلوم' مجبور اور محکوم ہیں مگر اپنے حق کے حاصل کرنے کے لیے سینہ سپر ہیں۔

لیکن اصلاح کا دارومدار حکمران عناصر اور بڑی طاقتوں پر زیادہ ہے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ ؂

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے ☆

☆ ترجمان القرآن' اکتوبر ۲۰۰۱ء

افغانستان پر امریکی حملہ

عالمی قانون اور یو این چارٹر کی خلاف ورزی

اگر ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون میں دہشت گردی کے سبب اکیسویں صدی کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا' تو ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء افغانستان جیسے غریب' تباہ حال اور مظلوم ملک پر امریکہ اور برطانیہ کی جارحانہ فوج کشی کے باعث ایک سیاہ تر دن بن گیا۔

المیہ اور مفادات

۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد دنیا کی ہمدردیاں امریکہ اور ان معصوم انسانوں کے ساتھ تھیں جو دہشت گردی کا نشانہ بنے تھے اور افغانستان کی طالبان حکومت سمیت دنیا بھر کے مسلمان' اہل امریکہ کے اس غم میں شریک ہوئے اور دہشت گردی کی مذمت بھی کی۔ غم و اندوہ کے ان لمحات میں' امریکی قیادت اور اس کی عسکری اور مالیاتی دراندازیوں کے ستائے ہوئے مشرق و مغرب اور پس ماندہ و ترقی یافتہ سب ہی ممالک کے عوام' اپنے رستے ہوئے زخموں کی کسک کو بھی بھول گئے۔ لیکن امریکہ کی قیادت پر رعونت' انتقام اور مخصوص مفادات کا غلبہ رہا۔ اس نے بے لاگ' منصفانہ اور قانون کے نظام کے تحت ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور

پنٹاگون کی تباہی کے ذمہ داروں کے تعین اور اس دہشت گردی کے محرکات اور اسباب کے معروضی جائزے کے بجائے اس حکمت عملی کے تحت جس کی کھچڑی برسوں سے پکائی جا رہی تھی' افغانستان کے عوام کو کھلی جارحیت کا نشانہ بنایا۔ محض طاقت کے بل پر اپنی بالادستی قائم رکھنے اور وسط ایشیا کے وسائل سے مالا مال علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ریاستی دہشت گردی کے بدترین اور ظالمانہ منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

فسطائیت کا راستہ

اس کے لیے دوسرے ممالک کو ترغیب اور ترہیب' رشوت اور دھونس اور دھمکی کے ہتھکنڈے استعمال کر کے ایک نام نہاد ''عالمی اتحاد'' (World Coalition) کا ڈھونگ رچایا۔ برطانیہ تو پہلے دن ہی سے امریکہ کی جھولی میں گر گیا تھا۔ یہ ملک جسے کئی صدیوں تک ایک عالمی طاقت کی حیثیت حاصل رہی' اب امریکہ کا باج گزار بن چکا ہے۔ امریکی صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر اس عالمی دھونس کے سرخیل ہیں۔ نیٹو (NATO) کے ۱۸ ممالک کو بھی خواہی نہ خواہی اس آپریشن میں شامل کر کے نیٹو کی دفعہ ۵ کو بھی متحرک کر دیا گیا کہ نیٹو کے کسی ایک ملک پر حملہ تمام ملکوں پر حملہ تصور کیا جائے گا بلالحاظ اس کے کہ بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی میں اسے متعین کیا جائے کہ ''جنگ'' اور حملے کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات کو مبینہ ملزموں کی طرف سے ''اعلان جنگ'' قرار دے کر ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا طبل بجا دیا گیا۔ باقی دنیا پر سیاسی دباؤ اور بلیک میل کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔

یہ فسطائی فلسفہ بڑی ڈھٹائی سے پیش کیا گیا کہ: ''دنیا دو کیمپوں میں منقسم ہے۔ ایک مہذب دنیا اور دوسری دہشت پسند اقوام۔ اور دنیا کی تمام اقوام کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ (option) نہیں کہ وہ یا امریکہ کے ساتھ ہوں یا اس کے مخالف--- یا اتحادی ہوں اور یا دہشت پسندوں کی حلیف شمار کی جائیں''۔ جس طرح سرد جنگ کے زمانے میں

دنیا کو سرخ اور سفید میں تقسیم کیا گیا تھا' اسی طرح اب دنیا کو سفید اور سیاہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ کمزور ملکوں پر بندوق تان کر ان سے پوچھا گیا کہ ''کس کے ساتھ ہو؟''

اگرچہ دہشت گردی کی کوئی متفق علیہ تعریف موجود نہیں ہے (جیسا کہ خود اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۱۱ ستمبر کے بعد کے اجلاس کی بحث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی تعریف پر متفق نہیں ہو سکی)۔ اس کی بڑی وجہ قوت کے جائز اور ناجائز استعمال اور متعلقہ اقدام کے پیچھے کارفرما محرکات اور مقاصد کا اختلاف اور ان کا معتبر اور غیر معتبر ہونا ہے۔ مگر کم از کم اس حصے کے بارے میں سب متفق ہیں کہ دہشت گردی (terrorism) کی روح سیاسی مقاصد کے لیے تشدد یا قوت کے استعمال کی دھمکی ہے:

دہشت گردی کا مطلب خصوصاً سیاسی مقاصد کی خاطر پُرتشدد اور دھمکی آمیز طریقے اختیار کرنا ہے۔ (آکسفورڈ ریفرنس ڈکشنری)

امریکہ نے اس اتحاد میں کمزور ممالک کی ایک خاص تعداد کو جس طرح شامل کیا ہے۔ اس تعریف کی روشنی میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ بذات خود دہشت گردی کی ایک قبیح مثال ہے۔ پاکستان سمیت بہت سے ممالک اس دھمکی کا نشانہ بنے ہیں اور جرأت اور بہادری کے بہت سے دعوے دار' صدر بش کی ایک ہی بھبکی پر سرنگوں ہو گئے' بقول غالب ؎

دھمکی سے مر گیا' جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ' طلب گارِ مرد تھا

امریکہ اور صدر پاکستان کا موقف

افغانستان پر امریکہ کی جارحانہ فوج کشی ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہے جس کا ۱۱ ستمبر کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اقدام سیاسی اخلاقیات' بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کے چارٹر کی کھلی کھلی خلاف ورزی ہے۔ یہ طاقت کی حکمرانی اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کی سیاست کی ایک مکروہ مثال ہے۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک نئے سامراجی دَور کی تمہید ہے۔

بہ ظاہر دعویٰ یہ کیا گیا کہ:

۱- ۱۱ستمبر کی دہشت گردی کا ذمہ دار اسامہ اور ان کی تنظیم القاعدہ ہے۔

۲- افغانستان کی طالبان حکومت نے ان کو اور ان کے گروہ کو پناہ دی ہوئی ہے۔
اس لیے طالبان ان کو بے چون و چرا امریکہ کے حوالے کر دیں ورنہ امریکہ طالبان کو طاقت کے بل پر تباہ و برباد کر دے گا۔

۳- دہشت گردی کے ان مراکز کو ختم کر کے عالمی سطح پر دہشت گردی کے خلاف طویل جنگ ہو گی۔

۴- یہ امریکہ ہی نہیں پوری ''مہذب دنیا'' کے اہداف ہیں اور ان کے حصول کے لیے ان کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی تائید حاصل ہے۔

۵- یہ دہشت گردی اور دہشت گردی کی پشت پناہی کرنے والے ممالک کے خلاف جنگ ہے' اسلام یا مسلمانوں کے خلاف نہیں' بلکہ افغانستان کے عوام کے بھی خلاف جنگ نہیں ہے۔

پاکستان کے فوجی حکمران جنرل مشرف نے ۱۹ستمبر (۲۰۰۱ء) کی تقریر میں اور اس کے بعد اپنے بیانات اور انٹرویوز میں امریکہ کا ساتھ دینے کے ذاتی فیصلے کے دفاع میں جو باتیں کہی ہیں' ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

- فیصلے میں حق کی بالادستی ہونی چاہیے۔
- ملک کے مفاد کو اولیت حاصل ہو' یعنی اس کی سالمیت' معاشی ترقی اور عزت و وقار کی بلندی۔
- پاکستان دنیا میں تنہا نہ ہو' بلکہ عالمی برادری کے ساتھ رہے۔
- اسلام کے عین مطابق ہونی چاہیے۔

یہ تقریر ۱۹ستمبر کو ہوئی' لیکن صدر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ تو

۱۵ ستمبر ہی کو کر لیا تھا۔ صدر بش نے ۱۳ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ''اکیسویں صدی کی پہلی جنگ'' کا اعلان کیا' ۱۴ ستمبر کو امریکی سینٹ نے دہشت گردی کے خلاف ہر ممکن اقدام کا اختیار بش صاحب کو دیا۔ ان کے پہلے ہی ٹیلی فون پر صدر مشرف نے امریکہ کی تائید اور اس جنگ میں امریکی جنگ باز قیادت کے حلیف بننے کے ''جرأت مندانہ'' اور ''دانش مندانہ'' فیصلے کا اعلان کر دیا۔ فیصلہ ایک فردِ واحد کا تھا جس کی بہ ظاہر تائید ان کی اپنی نامزد کردہ کابینہ' سلامتی کونسل اور کور کمانڈروں نے کیا (اسے بھول جایئے کہ خود فوج میں اس کے ساتھ کیا اکھاڑ پچھاڑ کرنا پڑی اور اس کی کیا کیا داستانیں ملکی ہی نہیں ساری دنیا کی اخبارات میں شائع ہوئی ہیں)۔ پھر صدر صاحب کے بقول انھوں نے: ''قومی زندگی کے مختلف رہنماؤں سے مشورہ کیا اور اس طرح ان کے اس فیصلے کو اکثریت کی تائید حاصل ہوگئی''۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ دلیل و برہان کی کسوٹی پر ان تمام دعووں اور خود امریکہ کے اہداف کا جائزہ لیا جائے اور حقائق اور صرف حقائق کی روشنی میں صحیح قومی اور ملی موقف کا تعین کیا جائے۔ ہمیں جنرل مشرف صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ قومی اُمور کا فیصلہ جذبات کی رَو میں بہہ کر نہیں کرنا چاہیے بلکہ عقل و دانش' حکمت دین اور ملک و ملّت کے مفاد کو ہر چیز پر بالادستی ہونی چاہیے۔ البتہ ہم اس میں یہ اضافہ کریں گے کہ بیرونی دباؤ اور خود اپنے سابقہ تجربات کو بھی فیصلہ کن مقام حاصل ہونا چاہیے۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ مومن فراست سے کام لیتا ہے اور ایک ہی سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔

تفتیش سے گریز کیوں؟

۱۱ ستمبر کے واقعات سے امریکہ کی اَنا پر جو بھی چوٹ پڑی ہو لیکن دنیا کے ۸۰ سے زیادہ ممالک کے ۶ ہزار سے زائد بے قصور انسانوں کی اس پیمانے پر ہلاکت ہمارے نزدیک ایک غیر معمولی واقعہ ہی نہیں' بلکہ انسانیت کے خلاف بھی ایک جرم ہے۔

جس طرح یہ اقدام امریکہ کے دستور اور بین الاقوامی قانون اور معاہدات کے تحت

جرم ہے اسی طرح خود اسلامی قانون کے تحت بھی ایک جرم ہے۔ عالم اسلام کی تمام حکومتوں، تحریکوں اور علمائے کرام نے اس کی شدید مذمت کی۔ طالبان حکومت نے بھی اس کی اسی وقت مذمت کی اور خود اسامہ بن لادن نے اس سے لاتعلقی کا برملا اظہار کیا۔

اس کے باوجود اس حادثہ فاجعہ کے آدھ گھنٹے کے اندر امریکی ٹیلی ویژن سی این این نے اسامہ بن لادن کو ملوث کرنے کی کوشش کی اور ایک گھنٹے کے بعد اسرائیل کے سابق وزیراعظم باراک نے لندن میں بی بی سی کے ایک پروگرام میں ایک لکھی ہوئی تقریر میں اسامہ بن لادن اور عربوں کو ذمہ دار ٹھیرا دیا۔ اس کے بعد سے کسی تحقیق، سائنسی تفتیش، قومی انکوائری یا عدالتی کمیشن اور اس کی عدالتی کارروائی کے بغیر اُوپر سے نیچے تک سب نے ایک ہی راگ الاپنا شروع کر دیا کہ: ''اس اقدام کی ذمہ داری اسامہ بن لادن اور القاعدہ پر ہے اور افغانستان کی طالبان حکومت انھیں فی الفور غیر مشروط طور پر امریکہ کے حوالے کر دے''۔

اس ایک دعوے کے سوا، تحقیق و تفتیش کا کوئی دوسرا اقدام سامنے نہیں آیا حالانکہ امریکی صدر جان ایف کینیڈی [۶۳-۱۹۶۱ء] کی ہلاکت، اوکلاہاما کی تباہی، اور اسکول تک میں بچوں کے ہلاک کیے جانے کے واقعات کی باقاعدہ تفتیش ہوئی، کئی کئی کمیشن بنے، کھلی عدالتی کارروائی ہوئی، سینٹ اور کانگرس کی کمیٹیوں نے اپنی اپنی تحقیقات کر کے ان کے نتائج پیش کیے۔ لیکن ایک اتنے بڑے، تباہ کن اور عالمی معیشت و سیاست کو متاثر کرنے والے واقعے کے اصل حقائق، اسباب و محرکات اور نتائج پر پردہ ڈالا گیا اور سارا نزلہ اسامہ بن لادن پر گرا دیا گیا جو اس سے اپنی برأت کا اظہار کر چکا ہے۔

اسامہ بن لادن اور اس کے رفقا پر دو مقدمے امریکی عدالتوں میں چل رہے تھے۔ ۵ سال سے اس کے خلاف وہ امریکی سراغ رساں ایجنسیاں سرگرم عمل ہیں جن پر ۵۰ ارب ڈالر سالانہ سے زیادہ سرکاری خزانے سے خرچ کیا جا رہا ہے۔ یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ ۱۱

ستمبر کے واقعے کی تیاری کم از کم دو سال سے ہو رہی تھی اور جہاز اغوا کرنے والوں (جو اب دنیا میں نہیں) کے علاوہ کم از کم ۵۰ مزید افراد اس میں شریک ہونے چاہییں، مگر ان کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں۔

حادثے کے بعد جن ۷۰۰ افراد کو حراست میں لیا گیا' ان سے بھی کوئی قابل ذکر بات حاصل نہیں ہوئی۔ جس مہارت' نظم و ضبط' اور ملک کے مختلف شہروں میں باہمی رابطے کے ذریعے یہ کام ہوا' وہ کسی باہر کے ادارے کے لیے کیسے ممکن ہے؟ خصوصیت سے ایسے ادارے کے لیے جو پندرہ ہزار کلومیٹر دور ہو' جس کے لوگوں کی نقل و حرکت پر مسلسل نظر ہو' اور جس کی جڑیں اس ملک کے حساس اداروں میں نہ ہوں جہاں سے یہ کام ہوا ہے۔

انتھراکس کا الزام؟

جراثیم پھیلانے والے پاؤڈر سے پیدا شدہ بیماری انتھراکس (Anthrax) کے معاملے میں بھی یہی ہوا کہ اسے پہلے اسامہ بن لادن کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی اور اب خود برطانوی حکومت کے وزارتی دفتر سے حاصل کردہ ۱۶۰ صفحات کی ایک رپورٹ Deliberate Release of Chemical and Biological Agents سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ القاعدہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح امریکی حکومت میں داخلی سلامتی کے نئے ڈائرکٹر تھامس اتیج کا کہنا ہے:

الیف بی آئی نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ خطوط کہاں سے ڈاک میں ڈالے گئے تھے۔ چونکہ انتھراکس کے لفافے ڈالنے کی کارروائی ۱۱ ستمبر کے قریب تھی' اس لیے شروع میں حکام نے یہ سمجھا کہ ان کا انتہاپسند مسلم بنیاد پرستوں غالباً اسامہ بن لادن اور اُن کی القاعدہ تنظیم سے تعلق جوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن گذشتہ چند دنوں

میں رائے تبدیل ہو چکی ہے۔ تفتیش کار اس کے زیادہ قائل ہوتے جا رہے ہیں کہ کوئی ایک فرد یا گروہ جو امریکہ میں رہایش پذیر ہے' سفید پوڈر کا ذمہ دار ہے جس نے ایک برطانوی ایڈیٹر کی جان لے لی اور امریکی میڈیا کی سیاست اور معیشت کی سرگرمیوں کو جامد کر دیا۔[1]

دہشت گردوں کی شناخت؟

سوال یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعے کی تحقیق کیوں نہیں کی گئی؟ جتنے بھی امکانات ہیں ان سب کا جائزہ کیوں نہیں لیا گیا؟ سارا ملبہ صرف ایک شخص پر کیوں گرا دیا گیا؟ حالانکہ جو بھی شواہد سامنے آ چکے ہیں انھوں نے اصل واقعے کو اور بھی پُراسرار بنا دیا ہے۔ اسامہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس نہ وہ مہارت اور ٹکنالوجی تھی' نہ ملک میں ان کے اثرات اور ایسے اصحاب و اعوان تھے جو یہ کام انجام دے سکیں۔ خود امریکہ سے کوئی واضح رابطے (linkages) سامنے نہیں آئے اور تازہ ترین رپورٹوں کی روشنی میں خود یورپ کے رابطے بھی غیر ثابت شدہ ہیں۔ برطانیہ کے بارے میں تو ۲۳ اکتوبر کے گارڈین نے واضح الفاظ میں رپورٹ دی کہ اس ملک میں القاعدہ کا کوئی باضابطہ حلقہ یا گروہ موجود ہی نہیں۔

پھر جو سوالات مبینہ اغوا کنندگان کے بارے میں سامنے آئے ہیں اور جس طرح ان کی شناخت کو خود سعودی عرب کے سرکاری حلقوں نے چیلنج کیا ہے' نیز ان کے طرز بود و باش اور عیاشیوں اور بدکاریوں کے بارے میں جو شہادتیں سامنے آئی ہیں' وہ القاعدہ سے ان کے تعلق کے لیے کوئی جواز فراہم نہیں کرتیں۔ اسی طرح ایک نہیں کئی ماہرین نے جو سب امریکی ہیں' انھوں نے چیلنج کیا ہے کہ چھوٹے سویلین جہازوں پر تربیت لینے والے شوقیہ پائلٹ ۷۵۷ جہازوں کو ہوا میں اڑتے ہوئے اصل ہوابازوں کو مار کر یا ہٹا کر

۱- دی انڈی پنڈنٹ' ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء

قابو نہیں کر سکتے اور نہ اتنے ٹھیک نشانے سے' نیویارک جیسے شہر میں اتنے چھوٹے' متعین اور ہزاروں فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں گھری ہوئی بلڈنگ سے ٹکرا سکتے ہیں۔ وہ انجینیر جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تعمیر میں شریک تھے' ان کے بیانات انٹرنیٹ پر آئے ہیں کہ صرف جہاز سے ٹکراؤ اور جہاز کے تیل کی آگ سے ان عمارتوں کی تباہی ممکن نہیں۔

اس پورے معاملے کے پیچھے کچھ اور ہے جس کی پردہ کشائی کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی۔ تمام متعلقہ ہوائی اڈوں کے واچ ٹاور سے اغوا شدہ جہازوں کی مانیٹرنگ اور پائلٹ سے کی جانے والی گفتگو بھی ایک معمّا ہے۔ بیش تر معلومات غائب ہیں۔ چار میں سے صرف ایک جہاز کا بلیک باکس ملا ہے' باقی کے بلیک بکس غائب ہیں۔ ۶ ہزار افراد کے مرنے کی اطلاع ہے مگر لاشیں صرف ۶۰ کے قریب نکلی ہیں۔ بلڈنگ جس طرح تباہ ہوئی ہے یعنی اوپر سے نیچے اور ادھر ادھر نہیں گری' یہ بھی ایک معمّا بنا ہوا ہے مگر ان معاملات کی کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کی جا رہی اور محض مفروضوں پر اسامہ بن لادن کو ملزم ٹھیرا دیا گیا۔ صدر بش پوری رعونت سے کہتے ہیں: ''ہمیں کسی تفتیش' کسی عدالتی عمل' کسی شہادت اور مقدمہ چلانے کی ضرورت نہیں۔ اسامہ مجرم ہے۔ ہم جانتے ہیں وہ guilty ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرو ورنہ ہم تم کو تہس نہس کر دیں گے''۔

اسامہ: ثبوت کی حقیقت

برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر نے جو ''شواہد نامہ'' (evidence) برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا ہے' وہ مضحکہ خیز ہے۔ ۲۳صفحات کی اس رپورٹ میں جو ۷۰ نکات پر مشتمل ہے پہلے ہی پیراگراف میں اعتراف ہے:

> یہ دستاویز اسامہ بن لادن کے خلاف مقدمے کو کسی قانونی عدالت میں پیش کرنے کے لائق بناتی نظر نہیں آتی۔

معروف تجزیہ نگار رابرٹ فسک نے اسی تناظر میں لکھا ہے:

امریکیوں کو اسے شرق اوسط میں منوانے میں سخت دقت پیش آ رہی ہے۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ برطانوی حکومت کی دستاویز' جس میں ۱۱ ستمبر کی ہلاکتوں کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر ''ثابت'' کی گئی ہے' عرب دنیا کو مغرب کی دہشت گردی کے خلاف جنگ پر مجتمع کر سکے۔ مذکورہ دستاویز میں ۷۰ میں سے صرف ۹ نکات عالمی تجارتی مرکز اور پنٹاگون پر حملوں سے متعلق ہیں اور اس میں بھی ''قیاس'' پر انحصار کیا گیا ہے نہ کہ شواہد پر۔[۲]

روزنامہ گارڈین ان شواہد کے بارے میں بجا طور پر سوال اٹھایا ہے:

۱۱ ستمبر کی دہشت گردی کے بارے میں اسامہ بن لادن کے باقاعدہ مقدمے کا سامنا کرنے کا بعید از امکان واقعہ اگر پیش آ بھی جائے تو اُس کے خلاف جو مقدمہ برطانوی حکومت نے گذشتہ دنوں شائع کیا ہے' قانونی نقطہ نظر سے اس میں کوئی جان نہیں ہے۔ بش حکومت کے اس اعلان پر کہ وہ بن لادن کے خلاف 'شواہد' پیش کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر بلیر کا مقدمہ دو لفظوں پر ختم ہو جاتا ہے: ''صرف مجھ پر اعتماد کرو''۔[۳]

اور لطف کی بات یہ ہے کہ اب بش حکومت اپنے دعوے سے اعلانیہ پھر گئی ہے۔ اب اس کا موقف ہے کہ کسی شہادت یا ثبوت کی ضرورت نہیں' حالانکہ خود امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے وعدہ کیا تھا: ''شہادتیں عوام کو دکھائیں گے''۔ اخبارات صاف لکھ رہے ہیں کہ کوئی شہادت موجود ہی نہیں' دکھائیں گے کیا؟

انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون نے نیویارک ٹائمز کا اداریہ نقل کیا ہے' کہ گواہی تو موجود نہیں مگر پھر بھی یہ کیس قابل یقین ہے' عنوان ہے: "A Believable Case"

۲- دی انڈی پنڈنٹ' ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء

۳- گارڈین' ۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء

لیکن اداریے میں جن حقائق کو تسلیم کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

یہ رپورٹ کوئی ۱۰۰ فی صد یقینی ثبوت فراہم نہیں کرتی۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا کوئی ایسا ریکارڈ موجود نہیں ہے، جس میں بن لادن نے حکم دیا ہو کہ امریکی جہاز اغوا کر لیے جائیں...... مسٹر بلیر نے ساری دنیا کو دعوت دی: ''میری بات پر یقین کر لیں اور خفیہ اداروں سے حاصل کردہ رپورٹیں قابل اعتماد ہیں''...... یہ برطانوی رپورٹ امریکی برطانوی خفیہ ایجنسیوں کے فراہم کردہ شواہد، مسٹر بن لادن کے پبلک اعلانات اور القاعدہ کے ارکان کے خلاف ماضی کی عدالتی کارروائیوں سے مرتب کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ استغاثہ دائر کرنے کے لیے قانونی تقاضے پورے کیے جائیں۔[۴]

امریکی ہفت روزہ ٹائم کا مضمون نگار The Case Against Evidence کے عنوان سے ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے بین السطور میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ ''فی الحقیقت کوئی ثبوت موجود نہیں'':

برطانیہ کے انڈی پنڈنٹ کے مدیر اس امر کی فیصلہ کن شہادت کے منتظر ہیں کہ اسامہ بن لادن، نیویارک اور واشنگٹن پر ہولناک حملوں کے ذمہ دار ہیں۔ آبزرور لکھتا ہے: ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے معمولی سا شبہہ، جسے کوئی وزن دیا جا سکتا ہے، اسامہ بن لادن کی طرف اشارہ کر رہا ہے لیکن پھر فوراً ہی یہ لکھا ہے کہ ''شبہہ اور ثبوت کی ذمہ داری بہت مشکل مسئلے ہیں''۔ ایڈورڈ سعید نے [فرانسیسی اخبار] لی مانڈے میں لکھا ہے: ''آج کے دن تک کوئی ثبوت موجود نہیں ہے''۔ واشنگٹن میں جرمنی کے سفیر نے گذشتہ ہفتے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ اپنے اتحادیوں کے سامنے بن لادن کے خلاف ثبوت پیش کرے۔ انھوں نے

۴- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون، ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

کہا: ''تھوڑے سے ثبوت کی فراہمی بھی بہت زیادہ مفید ہوگی''۔[۵]

جو ''حقائق اور شواہد'' برطانیہ کے وزیراعظم نے امریکہ کی سی آئی اے اور برطانیہ کی ایم آئی ۵ کی چار ہفتے کی تحقیق کے بعد پیش کیے ہیں اس کو گارڈین کے کالم نگار جارج مون بیوٹ اور انڈی پنڈنٹ کے سینئر مضمون نگار رابرٹ فسک نے تار تار کر دیا ہے۔

جارج مون بیوٹ تو یہاں تک لکھتا ہے:

> میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خفیہ ایجنسیوں کے کارندوں نے بن لادن کے خلاف پہلے ایک تھیوری جوڑ جاڑ کر بنائی اور پھر اِدھر اُدھر سے ان حقائق کو تلاش کیا جو اس میں مددگار ہونے کے لیے مطلوب ہیں--- میرا خیال ہے کہ بن لادن کے خلاف کچھ شبہہ پیدا کرنے والے نئے ثبوت طلب کرنے کا خاصا جواز ہے۔

مون بیوٹ نے صدر جارج بش کے عزائم کو صاف لفظوں میں یوں بے نقاب کیا ہے:

> صدر بش نے عظیم الشان موت کا دستہ تیار کر کے [افغانستان] روانہ کیا ہے تاکہ وہ ماورائے عدالت سزائے موت نافذ کر دے۔

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف دیکھیے' کیا منظر نامہ ہے؟

جنرل مشرف صاحب ایک فرد یا ایک جماعت نہیں' ایک پوری قوم کے سفاکانہ قتل میں نہ صرف شریک ہو گئے۔ بلکہ یہ سرٹیفکیٹ بھی عنایت فرما دیا کہ وہی نام نہاد ثبوت جنھیں ساری دنیا کے غیر جانب دار قانون دان اور سیاسی مفکر اور مبصر رد کر رہے ہیں اور ثبوت کی جگہ محض شبہات قرار دے رہے ہیں' بقول مشرف صاحب: ''وہ اسامہ بن لادن ہی نہیں طالبان کا جرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں''۔ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون اپنے اداریے میں جنرل مشرف صاحب کے اس طرزِ عمل پر تعجب بھری خوشی کا اظہار کیے بغیر

۵- ٹائم' ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

نہیں رہ سکا' جو ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے:

مسلم دنیا کے لیے یہ مسئلہ خصوصی طور پر بہت حساس ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان کی پرزور' کھلے عام توثیق بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جمعرات کو مشرف حکومت برطانیہ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئی اور اعلان کیا کہ جو ثبوت واشنگٹن نے دکھائے ہیں وہ کسی عدالت میں بن لادن کے خلاف مقدمہ چلانے کے جواز کے لیے کافی ہیں۔[۶]

۱۰ اکتوبر کو اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں قطر کے امیر شیخ محمد الثانی تو بڑے ادب اور عجز سے کہتے ہیں کہ: ''اسامہ بن لادن کے ۱۱ ستمبر سے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے مزید ٹھوس ثبوت (concrete evidence) کی ضرورت ہے''۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے فوجی صدر محترم فرماتے ہیں کہ بس یہی ''ثبوت'' ایک قوم کو سولی پر چڑھانے کے لیے کافی ہیں۔ اکانومسٹ کا یہ تبصرہ پاکستان کی قیادت کے لیے تازیانے سے کم نہیں:

اب تک ۱۹ مردہ ہائی جیکروں سے ملنے والے سراغوں پر ۵۴۰ تفتیشی انٹرویو کیے گئے ہیں' ۳۸۷---۴ ہزار ۴ سو عدالتی سمن جاری ہوئے ہیں اور ۵۰۰ سے زیادہ افراد کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اور یہ وہ ہے جو امریکہ کی حدود کے اندر ہوا ہے۔ دیگر ۲۵ ملکوں میں مزید ۱۵۰ افراد گرفتار کیے گئے ہیں' تاہم ہائی جیکروں اور اسامہ بن لادن کے درمیان کوئی ٹھوس رابطہ ابھی عوام کے سامنے آنا باقی ہے۔[۷]

اب تک کی ساری گواہیوں اور قرائنی شہادتوں کا نتیجہ اکانومسٹ یہ بتاتا ہے:

ان میں سے کوئی چیز بھی اسامہ بن لادن کو یقینی طور پر سب سے بڑا ولن نہیں

۶- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون' ۸ اکتوبر ۲۰۰۱ء

۷- اکانومسٹ' ۶ اکتوبر ۲۰۰۱ء' ص ۵۲

بنا سکتی۔ ابھی تک کسی نے بھی کسی بات کا اعتراف نہیں کیا ہے۔

بھارت تو اسامہ بن لادن اور طالبان کے خلاف پیش پیش ہے۔ اس کے اخبارات اور رسائل بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں اور امریکی ایف بی آئی کی چالیس ہزار تفتیشی سراغوں اور ایف بی آئی کے چار ہزار ایجنٹوں کی دن رات کی سرتوڑ کوشش کے باوجود کچھ زیادہ معلوم نہیں ہو سکا ہے' still does not reveal much:

اسامہ کے ملوث ہونے کے بارے میں الزامات تو بہ کثرت ہیں' لیکن شواہد ناقابل ذکر حد تک موجود نہیں۔[۸]

اسی اشکال کا اظہار بھارت کے مجلّے فرنٹ لائن کے مضمون نگار نے کیا ہے۔ بلکہ پروین سوامی نے لی مانڈے کے حوالے سے مشہور فرانسیسی محقق اور افغانستان کے اُمور پر چوٹی کے ماہر اور کئی کتابوں کے مصنف کی یہ رائے نقل کی ہے:

اسامہ بن لادن ساری دنیا کی انقلابی اسلامی تحریکوں کا شہ دماغ نہیں ہے۔ اس کو ایسے جنگجوؤں کو ٹریننگ دینے والا سمجھنا چاہیے جو بعد میں خود اپنے عمل کا میدان منتخب کرتے ہیں۔[۹]

اور یہی تجزیہ ہے مشہور مصری سیاسی مبصر اور سابق وزیر محمد ہیکل کا' جو روزنامہ گارڈین میں اسٹیفن موس نے انٹرویو کی شکل میں شائع کیا ہے:

اس نے یہ سوال بھی کیا کہ آیا اسامہ بن لادن اور اس کا القاعدہ نیٹ ورک ۱۱ ستمبر کے حملوں کے واحد ذمہ دار قرار دیے جا سکتے ہیں' جب کہ جو کچھ ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ کسی بھی طرح اطمینان بخش نہیں۔ "بن لادن اس پائے کی کارروائی کے لیے صلاحیت نہیں رکھتا۔ جب میں صدر بش کو القاعدہ کے بارے

۸- اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی' ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۱ء

۹- فرنٹ لائن' ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء' ص ۱۸

میں یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ جیسے یہ نازی جرمنی جیسی طاقت ہے' یا سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی ہے تو مجھے ہنسی آتی ہے' اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔ بن لادن کئی برس سے زیرنگرانی ہے۔ اس کی ہر ٹیلی فون کال مانیٹر کی جاتی ہے۔ القاعدہ کے نیٹ ورک میں امریکی' پاکستانی' سعودی اور مصری خفیہ ایجنسیاں گھسی ہوئی ہیں۔ جس کارروائی میں اس درجے کے نظم اور باریک بینی کی ضرورت ہو' وہ اس کو راز نہیں رکھ سکتے تھے''۔ ہیکل ان باتوں کو بہت کم وزن دیتا ہے کہ منصوبہ بندی میں زیادہ مرکزی کردار بن لادن کے نائب مصری اسلامی جہاد کے قائد ایمن الزہراوی نے انجام دیا ہو۔ ''وہ خطرناک آدمی ہے اور مصر کے صدر انوار سادات کے قتل [اکتوبر ۱۹۸۱ء] میں شریک تھا' لیکن وہ کوئی بڑا سوچنے والا یا منصوبہ ساز نہیں ہے۔ سادات کے قتل میں بھی اس نے مرکزی کردار ادا نہیں کیا۔ اس منصوبے میں بھی سطحی منصوبہ بندی کی گئی تھی اور یہ صرف خوش قسمتی کی وجہ سے کامیاب ہوا تھا۔ الجزیرہ سیٹلائٹ سے ان کے انٹرویو سے ظاہر ہوتا ہے کہ بن لادن اور الزہراوی صرف اپنے وجدان پر انحصار کرتے ہیں''۔ ہیکل کو یقین ہے کہ ۱۱ ستمبر کے سانحے کے بارے میں ابھی تک کئی وضاحتیں سامنے نہیں آئی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت کچھ بھی ہو اب تک جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ جلد بازی اور غیرمعمولی سہل پسندی کا مظہر ہیں اور غیر فیصلہ کن ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ امریکی انتظامیہ کو امریکی عوام کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فوراً ہی کوئی دشمن مطلوب تھا جس کو ہدف بنایا جا سکتا۔ مگر میری خواہش ہے کہ وہ واقعی کچھ حقیقی ثبوت لاتے۔ مسٹر بلیر نے پارلیمنٹ میں جو کچھ کہا میں نے اسے بڑے غور سے پڑھا ہے۔ انھوں نے ایسی فضا بنائی جس سے یہ محسوس ہو کہ وہ کوئی ثبوت پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں ہے' کوئی

نہیں۔ یہ سب اخذ کردہ نتائج ہیں۔ کولن پاول نے سب سے زیادہ ذہانت داری کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کہا کہ: اگر ثبوت نہیں تو کوئی بات نہیں۔ بن لادن نے دوسرے بہت سے ایسے جرائم کیے ہیں جن کی وجہ سے اس کے خلاف کارروائی کرنا ضروری ہے---لیکن یہ اس چینی ضرب المثل کی طرح ہے: ''اپنی بیوی کو ہر روز مارو' اگر تم وجہ نہیں جانتے' وہ تو جانتی ہی ہوگی''۔ آپ اس طرح نہیں کر سکتے ہیں[۱۰]

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے پاس کوئی حقیقی شہادت موجود ہی نہیں ہے۔ جو کچھ شہادت کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے وہ صرف شبہات کا مجموعہ ہے اور اس کی جو مجموعی تصویر اُبھرتی ہے وہ پراگندہ' خام' تشنہ' مفروضوں پر مبنی' غیر مربوط' تضادات سے پُر' ناقابل اعتماد اور ثبوت سے محروم ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ''ہم ساری معلومات ظاہر نہیں کر سکتے'' لیکن یہ اصول انصاف' بنیادی حقوق اور نظام عدل کے خلاف ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ مخدوش اور ناقابل چیلنج معلومات کی بنیاد پر' دفاع اور جرح و تعدیل کے حق کے بغیر کسی بھی شخص یا گروہ کو ملزم ہی نہیں مجرم قرار دے اور پھر خود ہی اسے سزا سنا کر اس سزا پر عمل بھی کر ڈالے۔ صرف یہی نہیں' بلکہ یہ ظالمانہ دعویٰ بھی کرے کہ: ''جو ممالک بھی اس کی نگاہ میں اس کے مطلوبہ افراد کو پناہ دیں گے۔ وہ ملک بھی گردن زدنی ہیں اور ان کے عوام بھی وسیع تباہی (mass destruction) کے ہتھیاروں کا نشانہ بنائے جائیں گے''۔

سچی بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جو کچھ معلومات باہر لائی گئی ہیں اس کے علاوہ کوئی پیش کیے جانے کے لائق معلومات یا شہادتیں ہیں ہی نہیں۔ محض اپنی اَنا اور جذبہ انتقام کی تسکین' اپنے سلامتی اور خفیہ معلومات کے نظام کی ناکامی اور اپنے عوام کے جذبات کو غلط رخ پر ڈالنے کے لیے کشت و خون کا یہ بازار گرم کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعے کچھ

۱۰- گارڈین' ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۱ء' ص ۲

دوسرے مقاصد ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ ورنہ معقول راستہ صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اگر اسامہ بن لادن اور ان کے القاعدہ کے بارے میں کوئی مسکت معلومات اور شواہد تھے تو فوری طور پر ایک پارلیمانی یا عدالتی کمیشن بنایا جاتا۔ جو آزاد تحقیق و تفتیش اور کھلی سماعت کے ذریعے کیس کا جائزہ لیتا۔ اگر کوئی ٹھوس شہادت سامنے آتی تو عدالتی عمل کے ذریعے ملزموں کو امریکہ کی کسی اعلیٰ عدالت میں مقدمے کے لیے تحویل ملزمان کے معروف بین الاقوامی ضابطے کے تحت حاصل کیا جاتا یا متعلقہ حکومتوں کے ذریعے کسی عالمی عدالت اور غیر جانب دار عدالتی کمیشن کے سامنے مقدمہ چلایا جاتا۔

طالبان نے بار بار شواہد پیش کرنے کا مطالبہ کیا اور یہاں تک کہا کہ: ''ہم غیر جانب دار مسلمان ممالک کی اعلیٰ عدالت یا اعلیٰ عدالتی کمیشن کے آگے اسامہ کو پیش کرنے کو تیار ہیں''۔ لیکن صدر بش کی ہٹ دھرمی، رعونت اور سامراجی عزائم نے انھیں کسی معقول راستے کی طرف آنے ہی نہیں دیا، بلکہ ان کا ایک ہی جواب تھا:

> جب میں کہتا ہوں: کوئی مذاکرات نہیں، میرا مطلب یہی ہوتا ہے: کوئی مذاکرات نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ مجرم ہے۔ اسے حوالے کر دو۔ جرم یا بے گناہی پر گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔[۱۱]

حالانکہ خود برطانوی پارلیمنٹ کے سینیر ارکان میں ٹیم ڈی لیبل (جو پارلیمنٹ کے سب سے معمر ممبر ہیں اور دارالعوام کے فادر کہلاتے ہیں) کہہ رہے ہیں:

> ۱۱ ستمبر کو نیو یارک میں دہشت گرد حملوں کا برطانیہ میں ٹھیک وہی ردّعمل ہوا جو اسامہ بن لادن چاہتا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف اینگلو امریکی پیش قدمی ساری دنیا میں برطانوی امریکی شہریوں پر حملوں کی صورت میں منتج ہو سکتی ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اقوام متحدہ کو سامنے لایا جائے اور اسے

۱۱- دی انڈی پنڈنٹ، ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء، ص ۱

ایک طرف نہ رکھا جائے۔ اب بھی کوشش ہونا چاہیے کہ طالبان کو پیش کش کی جائے کہ اسامہ بن لادن کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام کسی عدالت میں پیش کر دیں جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے جج ہوں۔[۱۲]

بھارتی رسالے فرنٹ لائن نے بھی ادارتی کالموں میں اسے امریکہ کی غیر منصفانہ جنگ (American's Unjust War) قرار دیتے ہوئے لکھا:

اس خوف ناک جرم کا صحیح ردِّعمل یہ ہو سکتا تھا کہ ارتکاب جرم کرنے والوں کو سخت انصاف کے حوالے کرنے لیے ہر طرح کی کوشش کی جاتی۔ دنیا کو قائل کرنے کے لیے سب ثبوت تلاش کیے جاتے' قانون کی حکمرانی کے تحت اور قانونی عدالتوں کے ذریعے سامنے لائے جاتے' پھر اقوام متحدہ کے اجتماعی ادارے کے ذریعے کارروائی کی جاتی۔ مگر اس طرح کے منصفانہ ردِّعمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا۔ امریکہ جو کچھ ہے' جو کچھ وہ کرنے کا عادی ہے' واحد سوپر طاقت ہونے کا اسے جو نشہ ہے اور اس کی وجہ سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا۔[۱۳]

دسیوں اخبارات و رسائل اور ان کے سیاسی مبصر اس رائے کا اظہار کر رہے ہیں لیکن صدر بش' وزیر اعظم بلیر اور ان کے شریک کار افغانستان پر آگ اور خون کی بارش برسانے کے علاوہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ایک ایسے ملک کو جس میں نہ سڑکیں ہیں اور نہ ریلوے لائن' جہاں بجلی' پانی اور خوراک کی سہولتیں بھی میسر نہیں' جن کی کوئی فضائیہ نہیں' ان پر اپنی فضائی برتری قائم کر کے فتح کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ محدود و متعین نشانوں پر حملے (targetted bombing) کے نام پر شہر اور دیہات ہی نہیں' مساجد

۱۲- دی نیوز انٹرنیشنل' ۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء

۱۳- فرنٹ لائن' ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء' ص ۱۸

مدرسے' شفاخانے اور یو این او اور ریڈکراس کے ڈپو تباہ کر دیے گئے۔ بمباری سے ہزاروں بے بس انسان شہید کر دیے گئے لیکن آتش انتقام ہے کہ سرد ہونے کا نام نہیں لے رہی۔

پاکستان کے جرنیل صدر اس خون ریزی میں برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے کہ جس حملے کو وہ مختصر اور بہ ہدف (short and targetted) کہہ رہے تھے اور جس کی ضمانتوں کے وہ مدعی تھے اس کا پول پہلے ہی دن کھل گیا جب بش صاحب نے غضب ناک ہو کر کہا: ''صدر مشرف کو کس نے یہ ضمانت دی ہے؟ ہم جب تک چاہیں گے حملے کریں گے جو سردی' گرمی بلکہ کئی برسوں تک بھی پھیل سکتے ہیں''۔ اس شاہی اعلان کے بعد ہمارے سپہ سالار صدر صاحب دبک کر بیٹھ گئے اور بش صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

مغرب کا دوہرا معیار اور افغانستان

دنیا کے ہر آزاد ملک کا حق ہے کہ اپنے کسی شہری کو یا جسے پناہ دے اسے مناسب عدالتی کارروائی کے بغیر کسی دوسرے ملک کے حوالے نہ کرے۔ اگر کوئی مجرم کسی دوسرے ملک کو مطلوب ہے تو اس کا ایک ہی جائز طریقہ ہے کہ اخلاق' بین الاقوامی قانون اور ضابطے کے مطابق باقاعدہ عدالتی عمل کے ذریعے اسے طلب کیا جائے۔ اس صورت میں بھی جس ملک کے شہری کو طلب کیا جا رہا ہے' اس کی عدالت فراہم کردہ شہادتوں کی بنیاد پر اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہی اسے منتقل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔

برطانیہ جو اس مہم میں امریکہ کا شریک ہے خود اپنے قانون اور روایات کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ چلی کے سابق سربراہ جنرل پنوشے برطانیہ علاج کے لیے آئے تھے کہ اسپین نے ان کو انسانیت کے خلاف جرائم کی پاداش میں حوالے کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ دو بار مقدمہ اعلیٰ عدالتوں سے گزر کر ہاؤس آف لارڈز (دارالامراء) میں گیا اور بالآخر لارڈز نے طے کیا کہ ان کو چلی واپس بھیج دیا جائے' اسپین کے حوالے نہ کیا جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بن لادن کے لیے تو برطانیہ نے بھی امریکہ کے ساتھ اپنی فوج بھیج دی اور پہلے ہی دن سے ہوائی حملوں میں شریک ہوگیا۔ جب کہ اپنے ملک میں آج بھی یہ کیفیت ہے کہ حقوق انسانی کے یورپین کنونشن کے تقاضوں کے پیش نظر ۱۱ ستمبر ہی کے ایک ملزم کو جو جہاز کے اغوا کے سلسلے میں مطلوب ہے' اس لیے حوالے نہیں کر رہا کہ امریکہ میں موت کی سزا ہے۔ پھر یورپی قانون کا تقاضا ہے کہ جس ملک میں موت کی سزا ہو وہاں کسی ملزم کو تحویل میں نہ دیا جائے۔ یورپ کے ایک نمایندے کا کہنا ہے کہ:

> ہم اس لڑائی میں مکمل طور پر امریکہ کے ساتھ ہیں لیکن ہم سزاے موت کے مخالف ہیں اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔[۱۴]

یورپ کے ممالک ''مہذب'' ہیں اس لیے ان کو حق ہے کہ اپنے قانون کی بالادستی قائم رکھیں مگر افغانستان' پاکستان اور دوسرے مشرقی ممالک ''غیر مہذب'' ہیں' ان کے ملکی قانون' مذہب اور روایات کی کوئی حقیقت نہیں۔ امریکہ کو حق ہے کہ پاکستان ہو یا فلپائن اپنے مطلوبہ افراد کو زور و زبردستی کے ذریعے حاصل کر لیں' بلکہ پانامہ کے صدر کو ۲۵ ہزار فوج بھیج کر اغوا کر لے اور پھر اپنے ملک میں مقدمہ چلائے مگر دوسرے ممالک کسی امریکی پر اپنے ملک میں کسی جرم کی پاداش میں بھی مقدمہ نہ چلا سکیں۔

اگر اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت قائم ہونے والی عدالت کے ہر فیصلے کے احترام کو چارٹر کے ذریعے ارکان ممالک پر لازم کیا جائے تو امریکہ جب چاہے یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دے کہ: ''ہم اس معاملے میں کورٹ کے دائرہ اختیار کو تسلیم نہیں کرتے'' جیسا کہ ۱۹۹۶ میں امریکہ نے نکاراگوا میں امریکی فوجی مداخلت کے سلسلے میں عدالت کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ کھلی بین الاقوامی غنڈا گردی ہے۔ اسے کسی مہذب ملک کا طریقہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۴- سنڈے ٹیلی گراف' ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء

افغانستان اپنے اقتدار اعلیٰ (ساورنٹی) کے اس حق کے لیے سینہ سپر ہوا ہے کہ جس شخص کو اس نے پناہ دی ہے اسے کسی واضح ثبوت اور عدالتی عمل کے بغیر محض امریکہ کے مطالبے پر امریکہ کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

افغانستان کے خلاف امریکہ کی یہ جنگ ایک جارحانہ کارروائی ہے' جس میں صرف طاقت کے بل پر وہ اقوام متحدہ کے چارٹر' جنیوا کنونشن اور بین الاقوامی ضابطے اور اخلاقی اقدار کو پامال کرتا رہا۔ اس میں کوئی دو آراء نہیں کہ امریکہ' بن لادن اور القاعدہ کے خلاف کوئی قابل قبول اور معتبر شہادت پیش نہیں کر سکا۔ صرف دھونس اور تشدد کے ذریعے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی

امریکہ نے افغانستان پر جو فوج کشی کی' وہ صریح طور پر ریاستی دہشت گردی اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور عالمی قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

قانون کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی دوسرے فرد یا ریاست کو کسی اور کے جرم کی پاداش میں سزا نہیں دی جا سکتی' خواہ وہ جرم ثابت بھی ہو چکا ہو۔ جرم میں اعانت (abetment) اور کسی کو پناہ دینا دو بالکل مختلف اُمور ہیں' خصوصیت سے جب کہ جرم ثابت بھی نہ ہوا ہو اور نہ کوئی فیصلہ کن شہادت موجود ہو۔ محض ایک ایسے شخص کا کسی ملک میں ہونا جو کسی دوسرے ملک کو مطلوب ہے' کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ ایک دوسرے ملک پر حملہ آور ہو جائے۔ انٹرنیشنل لا کمیشن نے اس سلسلے میں واضح قوانین وضع کیے ہوئے ہیں جو دنیا کے تمام ممالک بشمول امریکہ اور برطانیہ قبول کر چکے ہیں۔ اس قانون کی دفعہ ۱۱ کہتی ہے:

> ایک فرد یا گروہ کا ایسا طرز عمل' جو کسی ریاست کی جانب سے نہ ہو' بین الاقوامی قانون کے تحت ریاست کا اقدام نہیں سمجھا جائے گا۔

اسی طرح' اس کی دفعہ ۱۴ میں کہا گیا ہے:

> کسی ایسی باغی تحریک کے کسی حصے کا عمل' جو کسی ریاست کی حدود میں' یا اس کے زیر انتظام کسی دوسرے خطے میں ہو' بین الاقوامی قانون کے تحت ریاست پر الزام نہیں سمجھا جائے گا۔

ہم نے نکاراگوا کی حکومت کے امریکہ کے خلاف جس مقدمے کا ذکر اُوپر کیا ہے' اس میں چند اقدامات کے بارے میں امریکہ کو موردِ الزام اور ذمہ دار قرار دیا گیا تھا مگر کچھ دوسرے معاملات میں عدالت نے امریکہ کو ذمہ دار نہیں ٹھیرایا تھا اور وہ اسی اصول کے تحت تھا۔ اس فیصلے میں کہا گیا ہے:

> عدالت کی رائے ہے کہ امریکہ نے نکاراگوا کی کنٹرا (Contra) افواج میں ایک ہدایت نامہ تیار کر کے تقسیم کر کے ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی ہے' جو انسان دوستی کے عمومی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن عدالت کوئی ایسی بنیاد نہیں پاتی کہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان اقدامات کو امریکہ کے اقدامات قرار دے سکے۔

ان اصولوں کی روشنی میں صاف ظاہر ہے' کہ اگر افغانستان میں مقیم کسی فرد نے کوئی ایسا اقدام کیا ہے یا کوئی ایسا اقدام اس سے منسوب کیا جا رہا ہے جو انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے تب بھی اس کی ذمہ داری افغانستان کی حکومت پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ واضح رہے کہ بین الاقوامی قانون کے ان اصولوں کو اس لیے مرتب کیا گیا ہے کہ کوئی بھی حکومت' خصوصیت سے جن کے پاس طاقت ہے' ایسے اقدامات کا سہارا لے کر افراد کے جرائم کے لیے ریاست کو طاقت کے من مانے استعمال (arbitrary use) کا نشانہ نہ بنا ڈالیں۔ اس راستے کو روکنے کے لیے یہ قوانین بنائے گئے ہیں' لیکن امریکہ نے ان کو صریحاً نظر انداز کر دیا ہے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے تقاضے

اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد ہی ریاستوں کی طرف سے یک طرفہ اور من مانی فوجی کارروائیوں کو روکنا تھا۔ چارٹر کی دفعہ ۵۱ میں خود حفاظتی (self defence) کا حق دیا گیا ہے لیکن اسے کسی بھی دلیل کے ذریعے دوسرے ممالک پر فوج کشی کے حق میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اقوام متحدہ کا چارٹر حسب ذیل بنیادوں پر قائم ہے:

۱- آنے والی نسلوں کو جنگ کی لعنت سے تحفظ دینے کے لیے۔

۲- مرد و زن اور بڑی یا چھوٹی اقوام کے مساوی حقوق۔

۳- بین الاقوامی قانون کے تحت معاہدات کے تفویض کردہ فرائض کا احترام (مقدمہ)۔

چارٹر کی دفعہ ۲۰ کی شق ۱' ۳' اور ۴ بہت واضح ہیں:

۱- ممبر ممالک کی خود مختار مساوات کا حصول (۲۰۱)

۲- تمام ممبران اپنے بین الاقوامی تنازعے پر امن ذرائع سے اس طرح طے کریں گے کہ بین الاقوامی امن اور سلامتی کو خطرہ نہ ہو۔ (۲۰۳)

۳- تمام ممبران بین الاقوامی تعلقات میں کسی بھی ریاست کی جغرافیائی وحدت یا سیاسی آزادی کے خلاف طاقت کے استعمال' یا اس کی دھمکی سے' یا کسی بھی ایسے طریقے کو اختیار کرنے سے احتراز کریں گے جو اقوام متحدہ کے چارٹر کے مقاصد کے مطابق نہ ہو۔

پھر دفعہ ۳۳ میں یہ ضابطہ بہت صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

> کسی تنازعے کے فریق جس کے جاری رہنے سے عالمی امن و استحکام کے برقرار رہنے کو خطرہ ہو' حل تلاش کرنے کے لیے سب سے پہلے مذاکرات' مصالحت' ثالثی' عدالتی تصفیے' علاقائی تنظیموں سے اپیل' یہ سب یا اپنی پسند کے دوسرے پرامن ذرائع کا راستہ اختیار کریں گے۔

نیز دفعہ ۳۶ کے تحت یہ سلامتی کونسل کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ دفعہ ۳۳ کے تحت جو معاملہ بھی اس کے سامنے آئے' اس میں تنازع کے حل کے لیے ضروری اقدامات تجویز کرے۔ دفعہ ۳۷ کے تحت اگر ممبر ملک مذاکرات اور دوسرے پرامن ذرائع سے تنازع طے نہ کر سکیں تو ان کے لیے ضروری ہوگا کہ سلامتی کونسل کی طرف رجوع کریں' جو دفعہ ۳۶ کے تحت ضروری کارروائی کرے گی۔

کسی ایک ملک کے خلاف کوئی دوسرا ملک ازخود کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔ دفعہ ۳۳' دفعہ ۳۶ اور دفعہ ۳۷ کے تحت اقدامات کی ناکامی کی صورت میں سلامتی کونسل دفعہ ۴۱ کے تحت معاشی پابندیاں اور دفعہ ۴۲ کے تحت فوجی کارروائی کا فیصلہ کر سکتی ہے' مگر ایسی فوجی کارروائی کوئی ملک خود نہیں کر سکتا اور نہ اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے کسی اتحاد (کولیشن) کے ذریعے کر سکتا ہے بلکہ یہ اقدام اقوام متحدہ کے ممبر ممالک کی فوجوں کے ذریعے دفعہ ۴۶ اور ۴۷ کے تحت اقوام متحدہ کی ملٹری اسٹاف کمیٹی کے تحت ہی ہو سکتے ہیں اور یہ کمیٹی سلامتی کونسل کے مشورے اور اجازت سے کوئی اقدام کر سکتی ہے۔

یہ ضابطہ کار اقوام متحدہ کے چارٹر میں مرقوم ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے اس کی ہر ایک دفعہ کی کھلی خلاف ورزی کی ہے اور اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ امریکہ نے دفعہ ۵۱ کا سہارا لیا ہے لیکن اس کا جواز صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جب کسی ملک پر کسی متعین ملک کی فوجوں نے عملاً حملہ (armed attack) کر دیا ہو اور اس صورت میں بھی جو ملک اپنے دفاع کے اس حق کو استعمال کرے' اس کا فرض ہے کہ فوری طور پر اس کی اطلاع سلامتی کونسل کو دے۔ پھر وہ سلامتی کونسل کے اس حق میں کوئی مداخلت کرنے کا مجاز نہیں ہوگا جو امن کی بحالی کے لیے سلامتی کونسل کرے۔ چارٹر کی دفعہ ۹۴ کے تحت یہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا فرض ہے کہ اگر کوئی ملک چارٹر کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کا ازخود نوٹس لے اور سلامتی کونسل میں معاملے کو پیش کرے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قانون کی روشنی میں امریکہ اور برطانیہ کا رویہ

مبنی برحق نہیں بلکہ صریحاً جارحانہ' ظالمانہ' یک طرفہ' من مانا اور امن عالم کے لیے تباہ کن ہے۔ پاکستان کی حکومت نے اس بین الاقوامی دہشت گردی کے لیے اپنی زمینی اور اپنے فضائی راستے فراہم کر کے جرم میں شرکت اور شر و فساد میں تعاون کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس معاملے میں امریکہ کے جرائم متعین طور پر یہ ہیں:

۱- کسی حتمی ثبوت اور شہادت کے بغیر اور کسی مبنی برانصاف عدالتی عمل کے بغیر ایک فرد' ایک گروہ اور ایک ملک کو مجرم قرار دیا۔ اس کے خلاف رائے عامہ تیار اور ملکوں کا فوجی اتحاد قائم کیا۔

۲- بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی عدالتوں کے واضح فیصلوں کے علی الرغم' اس ملک' اس جماعت اور ان گروہوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جن کا قانون کے تحت کسی جرم میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اگر ان ممالک میں کچھ لوگ ایسے پناہ گزین تھے جن کا جرم عدالتی طریقے سے ثابت ہو تب قانون کے مطابق ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ تو ہوسکتا ہے مگر کسی فوجی اقدام یا اغوا کی کوشش کا کوئی قانونی جواز نہیں اور جن افراد کا جرم ثابت نہ ہوا ہو ان کے بارے میں تو مطالبے کا بھی کسی کو اختیار نہیں۔

۳- اگر کوئی تنازع فی الحقیقت تھا بھی اور کوئی دوسرا ملک ایک جائز مطالبے کو پورا کرنے میں مزاحم ہو تو مذاکرات (negotiations) کا راستہ اختیار کرنا اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعہ ۳۳ کے تحت لازمی ہے۔ امریکی صدر نے مذاکرات سے انکار کیا اور معاملات کے تصفیے کے پرامن راستے کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا اور اس طرح چارٹر کی خلاف ورزی کی اور عالمی امن کو تہ و بالا کیا۔

۴- فوجی کارروائی کے سلسلے میں بھی چارٹر میں طے کردہ راستے کو اختیار نہیں کیا گیا۔ سلامتی کونسل نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جس میں بن لادن یا افغانستان کو مجرم قرار دیا گیا ہو یا ان کے خلاف کسی کارروائی کا کوئی فیصلہ کیا گیا ہو۔ ۲۸ ستمبر

۲۰۰۱ء کو جو قرارداد سلامتی کونسل نے منظور کی ہے اس میں اول تو دہشت گردی کی کوئی تعریف نہیں کی گئی اور نہ اس کا مخاطب کوئی ایک ملک ہے۔ اس میں تمام ممبر ممالک سے ۷ نکات کا مطالبہ کیا گیا ہے جن میں دہشت گردی کے مالیاتی وسائل کی روک تھام' دہشت گرد تنظیموں کے اثاثوں کی ضبطی' کسی فرد یا تنظیم کو دہشت گردوں کی مالی اعانت سے روکنا' ایسی تنظیموں میں نئے حامیوں کی بھرتی یا ان کو اسلحہ کی فراہمی' دہشت گردی کے مرتکب افراد یا تنظیموں کو پناہ دینے والوں سے تعاون پر پابندی' سرحدوں پر کنٹرول اور دہشت گردی کے سلسلے کے جرائم کی تحقیق و تفتیش میں تعاون اور معلومات کا تبادلہ شامل ہے۔ اس میں نہ کوئی ملک متعین کیا گیا ہے اور نہ کسی کے خلاف فوجی کارروائی کرنے اور اس کارروائی میں مدد دینے کی کوئی بات ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک کسی فوجی کارروائی کا تعلق ہے اسے اقوام متحدہ کی بلاواسطہ یا بالواسطہ تائید حاصل نہیں اور ایسا ہر قدم عالمی چارٹر کی صریح خلاف ورزی ہے۔ فوج کشی کے دو ہفتے بعد بھی سلامتی کونسل کو باضابطہ اطلاع نہ دینا اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کا متحرک نہ ہونا بھی چارٹر کی خلاف ورزی ہے۔ اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ جو فوجی کارروائی عالمی برادری کے نام پر کی گئی' اسے نہ عالمی برادری کی تائید حاصل ہوئی اور نہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت جائز ٹھیری۔ اس کی حیثیت محض ایک سوپر پاور کی ریاستی دہشت گردی کی ہے۔ جس نے اس میں جس قدر تعاون کیا وہ اس حد تک دہشت گردی میں شریک ہوا اور ایک مظلوم ملک کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوا۔

دنیا کے ۱۹۸ ملکوں میں سے بمشکل ۴۰ امریکی دباؤ یا ''دوستی'' کے سبب اس میں شریک ہوئے۔ اور جو بظاہر شریک ہوئے ان میں بھی اختلاف' اضطراب' تحفظات اور بے زاری کے آثار تھے۔ افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ چند مسلمان ملک جن میں

پاکستان، ترکی اور ازبکستان قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اس جارحیت کے لیے نہ صرف اپنا کندھا پیش کیا، بلکہ حق و انصاف کا خون بھی کیا، اور اُمت مسلمہ کے مظلوم انسانوں کے خون سے بھی اپنے ہاتھ رنگ لیے۔ یہ وہ جرم ہے جسے نہ خدا معاف کرے گا اور نہ ملّت اسلامیہ۔ جو جس درجے کے ظلم کا مرتکب ہے اسے ان شاء اللہ ایک دن اس کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔ (ترجمان القرآن، نومبر ۲۰۰۱ء)

[اضافہ: مرتب] لندن کے اخبار سنڈے مرر نے افغانستان میں امریکی سفاکی کو بے نقاب کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک برطانوی ٹیلی ویژن پروڈیوسر جیمی ڈوران نے مزار شریف میں قتل و غارت گری کے موضوع پر ایک دستاویزی فلم تیار کی ہے۔ جس میں امریکی فوجیوں کے وحشیانہ سلوک کو دیکھ کر امریکہ کے اتحادی، شمالی اتحاد کے جوان بھی اکثر اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے۔ اس تحقیقاتی رپورٹ میں شمالی اتحاد کے ایک فوجی کو رقت انگیز لہجہ میں یہ کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے: ''امریکی فوجیوں کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ انھیں کھلی چھٹی تھی۔ طالبان پر ظلم و تشدد کے مناظر سے ہمارا دل روتا تھا، لیکن ہم بے بس تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک امریکی فوجی نے اپنے ہاتھوں سے ایک قیدی (طالبان) کی گردن مروڑ کر اسے مار ڈالا تھا۔ اس سنگدل امریکی نے چار طالبان قیدیوں پر تیزاب پھینک دیا، جس کی وجہ سے وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ ان کے جلے ہوئے چہرے ہم سے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ جب وہ درد سے چیخ و پکار کر رہے تھے تو یہ بے رحم امریکی فوجی خوشی سے قہقہے لگا رہا تھا''۔ شمالی اتحاد کے فوجی نے بتایا: ''امریکی فوجیوں نے چار طالبان قیدیوں کو ایک کوٹھڑی سے باہر نکالا، ان کے بال تیز دھار آلے سے اس قدر رگڑ کر کاٹے کہ قیدیوں کے سروں سے جگہ جگہ خون بہنے لگا۔ بعدازاں ان کے سروں پر تیزاب انڈیل دیا گیا جس کی انتہائی اذیت سے انھوں نے دلدوز انداز میں تڑپنا شروع کر دیا۔ وہ فریاد کر رہے تھے کہ ہمیں جان سے مار ڈالو''۔ چنانچہ امریکی فوجیوں نے انھیں اپنے مخصوص ڈنڈوں سے مار مار کر انھیں موت کی نیند سلا دیا۔ سنڈے مرر لکھتا ہے کہ امریکہ تردید کرتا ہے کہ اس کی فوجوں نے مزار شریف کے قلعہ جنگی میں قید طالبان یا القاعدہ کے اراکین کا قتل عام کیا تھا، لیکن ہماری تحقیقات کے نتیجہ میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ امریکی حکومت کی یہ تردید حقائق کے منافی ہے''۔ سنڈے مرر کے مطابق جیمی ڈوران نے افغانستان میں امریکی فوجیوں کے طالبان پر غیر انسانی مظالم کے بارے میں جو دستاویزی فلم بنائی

ہے اسے گذشتہ ہفتہ جرمن کی پارلیمنٹ میں دکھایا گیا تھا' جس کو دیکھ کر کئی لوگ بے اختیار رو پڑے تھے۔ (روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۱۷ جون ۲۰۰۲ء)

لندن (بی بی سی) بی بی سی اردو آن لائن سے انٹرویو میں مذکورہ بالا آئرش فلم ساز جیمی ڈوران نے بتایا: ''جس شخص نے قندوز میں طالبان کی طرف سے ہتھیار ڈالنے کا معاہدہ طے کروایا تھا' اس کا کہنا ہے کہ ہتھیار ڈالنے والے طالبان کی تعداد آٹھ ہزار تھی' مگر بعد میں سے صرف تین ہزار پندرہ قیدی پہنچے۔ ان آٹھ ہزار میں سے قریباً چار سو ستر قیدیوں کو قلعہ جنگی لے جایا گیا جہاں پر بہت سے قیدی مار دیے گئے۔ وہاں مبینہ ''بغاوت'' کے دوران امریکی طالب' جان واکر نے پچاسی دوسرے طالبان کے ساتھ مل کر قلعے کے نیچے سرنگوں میں چھپ کر جان بچائی۔ چونکہ دنیا کی توجہ اس وقت قلعہ جنگی پر تھی اس لیے لوگوں کے ذہن میں یہ نہیں آیا کہ باقی ساڑھے سات ہزار قیدیوں کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ ان قیدیوں کو مزار شریف سے شبرغان کے راستے پر واقع' قلعہ زینی منتقل کرنے سے پہلے قلعہ جنگی کے احاطے میں بٹھایا گیا اور بعد میں انھیں مال برادری کے لیے استعمال ہونے والے کنٹینروں کے ذریعے قلعہ زینی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ہر کنٹینر میں دو سے تین سو تک افراد کو بٹھایا گیا اور جب دم گھٹنے کی وجہ سے ان قیدیوں نے مدد کے لیے پکارا تو سپاہیوں نے کنٹینروں پر گولیاں برسا دیں' جس سے بہت لوگ ہلاک ہو گئے''۔ فلم میں گواہ کے طور پر بیان ریکارڈ کروانے والے ایک شخص نے اعتراف کیا وہ خود بھی فائرنگ کرنے والوں میں شامل تھا۔ قتل عام کے ایک اور عینی شاہد نے بتایا کہ شبرغان پہنچنے پر ایک امریکی افسر نے شمالی اتحاد کے لوگوں سے کہا کہ ان کنٹینروں کو دشت لیلیٰ لے جائیں جو شبرغان سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ صحرا میں پہنچنے تک بہت سے قیدی زندہ تھے اور ان کو پناہ دینے کے باوجود فوری طور پر مار کر لاشوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کے مطابق ان قیدیوں کو صحرا میں لے جاتے وقت کم از کم ایک موقع پر تیس سے چالیس امریکی فوجی بھی ساتھ گئے تھے۔ شبرغان کے علاقے میں قریباً ڈیڑھ سو فوجی تعینات تھے۔ اس کے علاوہ سی آئی اے کے اہلکار بھی پوچھ گچھ کے لیے وہاں موجود تھے۔

فلم پر بین الاقوامی ردعمل کے بارے میں جیمی نے بتایا کہ حال ہی میں اس فلم کو یورپی پارلیمنٹ میں قریباً ڈھائی سو افراد نے دیکھا۔ اس فلم میں پیش کیے گئے شواہد کی بنیاد پر افغان جنگ میں حصہ لینے والے امریکی فوجیوں کے خلاف نہ صرف بین الاقوامی' بلکہ امریکی قانون کے تحت بھی مقدمہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت' لاہور' ۲۸ جون ۲۰۰۲ء)

افغانستان کا المیہ

حکومت پاکستان کے کردار کا جائزہ

آج امت مسلمہ پر وہ کڑا وقت آ پڑا ہے جس کی پیش گوئی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

مسلمانوں کی کثرت تعداد اور کثرت وسائل کے حامل ہونے کے باوجود دشمن قومیں ان کو لقمہ تر سمجھ کر ان پر ٹوٹ پڑیں گی۔ مسلمان دنیا سے محبت اور موت سے نفرت کی وجہ سے خس و خاشاک کی طرح بے وقعت ہو کر رہ جائیں گے۔

مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکہ اور اس کے حواری افغانستان پر جس طرح سے حملہ آور ہوئے اور ہزاروں معصوم انسانوں کا خون بڑی بے دردی سے بہایا' اس منظر نے کچھ ایسا ہولناک نقشہ پیش کیا' جس کا تصور کر کے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف پوری مسلم دنیا پر ایک سکتہ طاری رہا' کچھ سہمے ہوئے تھے' کچھ منقار زیر پر تھے' کچھ کانپ رہے تھے' کچھ ہاتھ جوڑ کر

دشمنوں کو کندھا فراہم کر رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو آگے بڑھ کر ظالموں کے دست و بازو بن رہے تھے اور مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ بھی رنگ رہے تھے اور ان مظلوموں کی لاشوں پر اپنے تاج و تخت سجانے کے خواب دیکھ رہے تھے---

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُمت مسلمہ اپنی حالت پر غور کرے' لغزشوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لے' اور اپنی اصلاح کی فکر کرے! کیا خود احتسابی کے لیے اس سے بھی زیادہ کسی سنگین لمحے کا انتظار کیا جا سکتا ہے؟

خود احتسابی' ایک ذمہ داری

خود احتسابی کا آغاز اہل پاکستان کو خود اپنی ذات سے کرنا چاہیے۔ افغانستان اور اُمت مسلمہ کے وسیع تر پس منظر میں خود احتسابی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ عالمی سطح پر بھی خود احتسابی وقت کی ضرورت ہے۔ ان تینوں سطح پر خود احتسابی ہی سے وہ راہیں سامنے آ سکتی ہیں جن پر چل کر موجودہ بحران سے نکلا جا سکتا ہے اور ایک بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد ممکن ہو سکتی ہے۔

پاکستانی حکمران' امریکہ میں ہونے والے ۱۱ ستمبر کے اندوہناک واقعے کے بعد ایک سوپر پاور کی دھمکی اور دباؤ کے سامنے سہم کر بیٹھ گئے۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے حق و انصاف' عالمی قانون و روایات (conventions) 'اسلامی وحدت اور ملّی حقوق و فرائض کے احکام و آداب اور خود ملک کے حقیقی اور دیرپا مفادات سے صریحاً صرف نظر ہی نہیں کیا بلکہ ان کی خلاف ورزی بھی کی۔ اپنوں سے بے وفائی کا ارتکاب کرتے ہوئے گھٹنے ٹیک دیے اور چشم زدن میں خارجہ پالیسی میں ایسی قلابازی کھائی کہ دوست دشمن بن گئے۔ جن کی دوستی کبھی قابل بھروسا نہ تھی اور وطن عزیز جن سے بار بار چرکے کھا چکا تھا' ایک بار پھر انھی کے دامن کو تھامنے' اسی ''کوئے ملامت'' کے طواف کی ذلت قبول کرنے

کے لیے نکل کھڑے ہوئے[1] افسوس صد افسوس کہ انھی ٹھکرانے والوں سے کچھ ڈالروں کی بھیک مانگنے اور ان کی چاکری میں اپنے ستم زدہ مسلمان بھائیوں اور ہمسایہ ملک پر آگ اور خون کی بارش کرنے کے لیے' راستے کھولنے اور فضائیں ہموار کرنے جیسا ''جراءت مندانہ'' اور ''مبنی برحکمت'' کارنامہ انجام دیا۔

کسی بھی صاحب ایمان' خوددار اور باعزت فرد یا قوم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ محض دباؤ میں آ کر' حقائق کا صحیح تعین اور تجزیہ کیے بغیر اور خود اپنی قوم اور اپنے دوست ممالک کو اعتماد میں لیے بغیر کوئی بھی بڑا فیصلہ کرے۔ چہ جائے کہ ایک ایسا فیصلہ جس کے بڑے دُور رس اثرات پوری قوم' ہمسایہ دوست ممالک' اُمت مسلمہ اور پوری انسانیت کے مستقبل پر مرتب ہونے والے ہوں۔ نیتوں کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن قومی معاملات کے فیصلے رات کی تنہائیوں میں بیرونی دھمکیوں کے تحت نہیں کیے جاتے۔ صدر جنرل مشرف صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کی رات کو جو اقدام کیا اور جس کے کچھ نتائج چند ہفتوں میں ہی سب کے سامنے آگئے اور نہ معلوم ابھی کیسے کیسے نتائج رونما ہونے باقی ہیں۔ سرکاری ذرائع ابلاغ اور درباری اہل قلم نے اس اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا' لیکن حقائق اپنا لوہا منوا کر رہتے ہیں اور محض پروپیگنڈے کے گردوغبار سے تلخ حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔

۱- یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جنرل پرویز کے موجودہ موقف پر ہماری نقد و جرح کسی روایتی مخالفانہ رویے کا مظہر نہیں ہے۔ جب جنرل پرویز صاحب نے ''آگرہ مذاکرات'' کے دوران مسئلہ کشمیر پر' اہل پاکستان اور اہل کشمیر کے اصولی موقف پر دوٹوک انداز اختیار کیا' تو ہم نے ان کے جراءت مندانہ اقدام کی' ترجمان القرآن [اگست' ستمبر ۲۰۰۱ء] کے صفحات پر کھلے لفظوں میں تحسین کی۔ آج جب وہ اُمت مسلمہ اور خود اہل پاکستان بلکہ اہل کشمیر کے لیے ایک غلط پوزیشن کی نیو اُٹھائی ہے تو ہم اس اقدام کو کھلے لفظوں میں غلط اور خودکشی پر محمول سمجھتے ہیں ۔

ہم سخن فہم ہیں' غالب کے طرف دار نہیں

انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، صحیح فیصلے وہی ہوتے ہیں جو آزاد فضا میں، بے لاگ غور و خوض، نفع و نقصان کے حقیقت پسندانہ ادراک، باہمی مشورے اور قوم کو اعتماد میں لے کر کیے جاتے ہیں۔ کوئی فرد واحد عقل کل نہیں ہے اور چند افراد محض ''ہم پر اعتماد کرو'' کی بنیاد پر قوم کی قسمت سے نہیں کھیل سکتے۔

یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور خود ہمارا تجربہ کہ جب بھی بڑے بڑے فیصلے من مانے انداز میں ہوں گے، وہ بالآخر نقصان دہ اور تباہ کن ہوں گے۔ ۱۹۵۴ء کا امریکی حلقہ دفاع میں شرکت کا فیصلہ ہو یا سندھ طاس کا معاہدہ، ۱۹۶۶ء میں تاشقند کا معاہدہ ہو یا، ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کا مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کا فیصلہ ہو یا ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈالنے کا معاملہ، فروری ۱۹۹۹ء کا اعلان لاہور ہو یا ۴ جولائی کو کارگل سے پسپائی کا فیصلہ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو بہ عجلت تمام چیف آف آرمی اسٹاف کی برطرفی کا اعلان، سب قوم کے لیے نشاناتِ عبرت ہیں۔

حکومتی فیصلے کا جائزہ

۱- **دباؤ کے تحت:** افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف جنگ میں امریکہ کے حواری بننے کا یہ فیصلہ آزاد فضا میں اور مسئلے کے حسن و قبح کی بنیاد پر نہیں ہوا، بلکہ ایک سوپر پاور کی دھمکی اور دباؤ میں ہوا ہے۔ حکمران گروہ کیسی ہی تاویلیں کرے لیکن اب سارے حقائق دو اور دو چار کی طرح کھل کر سامنے آگئے ہیں، کہ ۱۱ستمبر کے واقعے کے بعد امریکہ کے اصل مقتدر طبقے نے طے کر لیا تھا کہ اس موقع کو اپنے اسٹرے ٹیجک مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنا ہے۔[۲] اس کا آغاز اسامہ بن لادن، القاعدہ، افغانستان اور

۲- امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے اعتراف کیا کہ ۱۱ستمبر کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لیے اتحاد کے قیام میں ہمیں جس اتحادی کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ پاکستان کے صدر پرویز مشرف تھے۔

بالآخر اسلامی احیا کی تحریک کو (جسے کبھی سیاسی اسلام (**پولیٹیکل اسلام**) کہا جاتا ہے' کبھی اسلامی بنیاد پرستی (**اسلامک فنڈامینٹل ازم**) اور کبھی عسکری اسلام (militant Islam) اور کبھی جہادی اسلام) دبانے اور اس کے لیے مقابلے کی قوتوں کو ابھارنے سے کیا جاتا ہے۔

اصل واقعے کی آج تک کوئی معروضی تحقیق نہیں ہوئی ہے اور نہ کرنے کا کوئی منصوبہ ہے۔ عدل و انصاف اور قانون کے مطابق مجرموں کے تعین اور سزا کی کوئی کوشش کی گئی ہے اور نہ اس کا کوئی ارادہ ہے۔ نیویارک کے عالمی تجارتی مرکز کے انہدام کے آدھ گھنٹے کے اندر اسامہ بن لادن کو گردن زدنی قرار دے دیا گیا اور پھر پروپیگنڈے اور جبروقوت کے ذریعے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کی ایک فضا بنا ڈالی گئی۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے صاف اعلان کر دیا کہ ''ہم نے ۱۳ ستمبر کو پاکستان کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ یا ہمارا ساتھ دو ورنہ تم کو بھی دہشت گرد ملک قرار دے کر ہم تمھارے خلاف صف آرا ہو جائیں گے''۔ صدر جنرل مشرف نے ۲۴ گھنٹے کی مہلت مانگی' مگر اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی ۱۴ ستمبر کی رات' صدر بش نے جنرل پرویز کو نیند سے بیدار کر کے الٹی میٹم کا جواب مانگا اور جنرل صاحب نے ''تحویل قبلہ'' کا کارنامہ انجام دیتے ہوئے فوجی اصطلاح میں

(گذشتہ سے پیوستہ)

برطانوی اخبار ٹیلی گراف کو انٹرویو دیتے ہوئے پاول نے کہا: امریکہ نے صدر پاکستان کو مشکل مطالبات کی فہرست بھجوائی۔ ہم نے انھیں فون کر کے پوچھا ''سر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کو لسٹ مل گئی؟'' اور ساتھ ہی یہ کہا کہ آپ کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا''۔ صدر پاکستان کو مشورہ کرنے میں ۲۴ گھنٹے لگے۔ انھوں نے ہمیں جواب دیا: آپ صحیح ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں--- اس کے بعد یہاں سے ہم نے بال کو لڑھکانا (جنگ کا آغاز) شروع کر دیا۔ امر واقعہ ہے کہ اس جنگ کے لیے ہمیں سب سے زیادہ ضرورت پاکستان کی تھی۔ (روزنامہ جنگ' راولپنڈی' ۱۵ دسمبر ۲۰۰۱ء) مرتب۔

ہتھیار ڈال دیے۔[3] اگر دہشت گردی کی تعریف (definition) کا کوئی متفق علیہ حصہ ہے تو وہ ''سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے قوت یا قوت کے استعمال کی دھمکی'' سے عبارت ہے۔ دہشت گردی کی یہ تعریف' صدر بش کی جانب سے جنرل مشرف کو دھمکی اور اپنی مطلب براری پر مکمل طور پہ صادق آتی ہے۔

کہا گیا کہ ''یا تم ہمارا ساتھ دو ورنہ تم دہشت گردوں کی صفوں میں شمار کیے جاؤ گے''۔ ساری دنیا کو من مانے انداز میں' سفید اور سیاہ کے دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا اور کہا گیا: ''۲۱ ویں صدی میں زندہ رہنا چاہتے ہو یا پتھروں کے عہد کی طرف لوٹنے اور کھنڈرات میں بدلنے کے لیے تیار ہو''۔ ایسا نہیں ہے کہ سب نے اس دھمکی کے آگے سپر ڈال دی۔ دنیا کے ۱۸۹ ملکوں میں سے اکثریت نے صرف ان دو راستوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ جن ممالک نے دہشت گردی کے خلاف محاذ میں شرکت پر آمادگی کا اظہار بھی کیا' ان میں سے بھی بیش تر نے غیر مشروط تعاون کی حامی نہیں بھری۔

بلجیم کے وزیراعظم نے ایسی دھونس میں آنے سے انکار کر دیا اور اسے سیاسی دباؤ (bullying) قرار دیا۔ برطانیہ کے پارلیمنٹ کے متعدد ارکان نے اس بے رحمانہ دھونس میں آنے سے انکار کیا۔ انڈونیشیا' ملائشیا' مصر' شام' ایران اور حتیٰ کہ سعودی عرب نے بھی اپنی زمین اور فضائی حدود امریکی حملہ آوروں کو دینے یا استعمال کرنے سے انکار کیا۔

۳- صدر صاحب کو یہ حقیقت ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جو قیادت' دھمکی کے نتیجے میں ایک بار جھکتی ہے' دشمن اسے بار بار اسی حربے سے جھکانے کی کوشش کرتا ہے۔ معلوم نہیں' صدر صاحب کے اس فیصلے کے بعد آیندہ کون کون سی دھمکیاں موصول ہوں گی' اور دشمن جواب میں کس کس محاذ پر پسپائی اختیار کرنے کی توقع رکھے گا۔ یہ دھمکی براہِ راست امریکہ کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے اور امریکہ کے اشارے پر بھارت کی جانب سے بھی۔

اُس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا' کیا ذلیل

ساری دھونس اور دباؤ کے باوجود بمشکل ۴۵ ممالک نے امریکہ کے ساتھ مکمل یا جزوی طور پر اتحاد میں شرکت کی حامی بھری۔ ان میں سے بھی اکثر کو اپنے اپنے ملکوں میں سخت مزاحمت سے سابقہ پیش آیا۔ آسٹریلیا اور جاپان کو دستور و قانون میں تبدیلی کرنا پڑی۔ جرمن حکومت کو اپنے وجود کے لالے پڑ گئے' اور حکومت چند ووٹوں سے ختم ہوتے ہوتے رہ گئی۔

پاکستان کے سامنے بھی صرف یہ دو ہی راستے نہیں تھے' لیکن پاکستانی حکومت نے ہر مشورے سے قبل اور کسی بھی نوعیت کی معلومات اور شہادتوں کے بغیر ۱۴ ستمبر کو امریکہ کے آگے سپر ڈال دی۔ نام نہاد مشاورت کا آغاز اس کے بعد ہوا ہے۔ صدر جنرل مشرف ریکارڈ پر ہیں کہ اس وقت تک کوئی معلومات اور نام نہاد ''شہادتیں'' ان کو نہیں دکھائی گئی تھیں۔ بہ ظاہر جو بھی معلومات دی گئیں (جو ناکافی اور حقائق سے زیادہ مفروضوں اور شبہات پر مبنی ہیں) وہ بھی خانہ پری کے لیے بعد میں دی گئیں۔ مگر حکومت پاکستان نے شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری کا رویہ اختیار کیا۔ جنرل مشرف صاحب اگر اپنی ۱۹ ستمبر کی تقریر کا ویڈیو اگر خود بھی ایک بار دیکھ لیں تو ان کے چہرے کا رنگ انھیں گواہی دے ڈالے گا کہ ان کا فیصلہ دباؤ اور دھمکی کے تحت تھا' آزادانہ نہیں۔

۲- **قوم کی مرضی کے خلاف:** یہ فیصلہ قوم کی مرضی کے بغیر ہوا اور اسے ہرگز قوم کی تائید حاصل نہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ ''صرف دس' پندرہ فی صد عوام اس کے خلاف ہیں' حقائق پر مبنی نہیں۔ ۲۷ ستمبر کو پاکستان کی پوری سرکاری مشینری کے ذریعے عوام کو اپنی تائید میں نکالنے کی بھرپور کوشش کے باوجود' اسکول کے بچوں اور سرکاری ملازمین کے سوا کسی کو اپنی تائید میں نہ لایا جاسکا۔ اس کے برعکس عوامی ہڑتالوں' ریلیوں' جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے عوام کی بہت بڑی اکثریت نے پُرامن رہتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار ان کے اقدام کے خلاف کیا۔ افغانستان پر امریکہ کے ہوائی حملے کے بعد ۱۵ اکتوبر کے گیلپ سروے کے مطابق ۸۳ فی صد عوام نے افغانستان کی طالبان حکومت سے یگانگت اور امریکی حملوں کی مذمت کی رائے کا اظہار کیا۔ کم و بیش یہی کیفیت ساری دنیا میں رائے

عامہ کے جائزوں کی رہی، حتیٰ کہ برطانیہ میں بھی مسلمانوں کی آرا کا تقریباً یہی تناسب رہا۔ ترکی، انڈونیشیا، ملایشیا، تھائی لینڈ بلکہ بھارت تک کے مسلمانوں کا یہی ردعمل تھا۔ اگر پاکستان میں بھی اس مسئلے پر عوامی ریفرنڈم ہوتا تو ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگ امریکہ کے خلاف اور اس معاملے میں جنرل مشرف کے اس سے تعاون پر ناراض، نادم اور برافروختہ نکلتے۔

بلاشبہ یہ پالیسی عوامی تائید سے محروم ہے، اس لیے کہ یہ فیصلہ قوم کے اجتماعی ضمیر اور ملت اسلامیہ کی تاریخی روایات اور ایمانی کیفیات کے خلاف ہے۔ پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ جن حکومتوں نے اس معاملے میں بہ خوشی یا بہ جبر امریکہ کا ساتھ دیا ہے، ان کے عوام کھلے بندوں ان کی اس روش سے برگشتہ ہیں۔ اسی دوران مجھے آکسفورڈ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس (۹ تا ۱۱ نومبر ۲۰۰۱ء) میں شرکت کا موقع ملا، جس میں امریکہ کے دو سابق سفیر اور انڈر سیکریٹری آف اسٹیٹ (نائب وزراے خارجہ) شریک تھے۔ دونوں نے باقی شرکا کے اس احساس کا اعتراف کیا کہ: ''خواہ قاہرہ ہو یا اسلام آباد، حکومتوں کا موقف ایک تھا اور گلی کوچوں (street opinion) میں گونجنے والی رائے بالکل دوسری تھی''۔ یہ کیفیت مسلم ممالک کی قیادتوں اور مسلم عوام کے جذبات و احساسات میں مکمل عدم مطابقت کی ایک واضح مثال اور ان قیادتوں کے اپنے عوام سے دُور ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔

۳- ظلم اور دہشت گردی سے تعاون: حکومت پاکستان نے ایک ایسا موقف اختیار کیا، جو حق و انصاف کے خلاف اور کھلے کھلے ظلم اور سامراجی دہشت گردی کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ ۱۱ ستمبر کو امریکہ مظلوم تھا اور ساری دنیا نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون پر خودکش حملے کی بھرپور مذمت کی۔ لیکن امریکہ نے اصل دہشت گردوں کے تعین اور ان کے احتساب اور گرفت کے لیے دستور، قانون، اخلاق، بین الاقوامی روایات کے فریم ورک میں اقدام کرنے کے بجائے ایک نئی عالمی

جنگ کا بلا جواز اعلان کر دیا اور بین الاقوامی دہشت گردی کے ذریعے ایک نئے سامراجی دَور کا آغاز کر دیا اور اس طرح ایک بار پھر ایک ظالم اور سامراجی طاقت کا کردار ادا کیا۔

دلائل اور شواہد سے یہ بات واضح ہے کہ دہشت گردی سے جنگ کے نام پر امریکہ نے جو کچھ افغانستان میں کیا ہے وہ صریح ظلم، کھلی کھلی غنڈا گردی اور بدترین دہشت گردی ہے۔جس کا ارتکاب اس نے خود اپنے دستور، قانون، اقوام متحدہ کے چارٹر، انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے اور بین الاقوامی قانون، روایات اور اخلاق کو پارہ پارہ کر کے پوری ڈھٹائی سے انجام دیا ہے۔ اس جنگ کا مقصد امریکہ کے اپنے سیاسی مفادات اور مقاصد کا حصول ہی قرار پاتا ہے۔ وہ ۱۱ستمبر کے واقعات کے نام پر دنیا کے غریب اور کمزور ممالک پر اپنے قبضے کو مستحکم کرنا اور ان کے مزید وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں اہل فکر ونظر، حق و انصاف کے اس طرح خون بہانے اور ظلم اور جارحیت کا نیا باب رقم کرنے پر سراپا احتجاج ہیں۔ بات صرف مسلمانوں کی نہیں، امریکہ میں کم لیکن یورپ اور باقی تمام دنیا میں بشمول مسلم دنیا اس کے خلاف بے زاری کی لہر ہے۔ ۱۸ نومبر ۲۰۰۱ء کو لندن میں جنگ کے خلاف ایک تاریخی مظاہرہ ہوا، جس میں شدید سردی کے باوجود ایک لاکھ افراد نے شرکت کی اور اس جنگ کو محض ''مفادات کی جنگ'' قرار دیا۔ برطانیہ کے سابق وزیر ٹونی بین (Tony Ben)، برطانوی پارلیمنٹ کے متعدد ارکان، اخبارات کے مدیر، کالم نگار اور ملائشیا کے ڈاکٹر چندرا مظفر اور سیکڑوں عمائدین نے اس میں شرکت کی اور امریکی عزائم کا پردہ چاک کیا۔ اہل علم وصحافت اور سیاسی شخصیات کی بڑی تعداد، حتیٰ کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہونے والوں کے قریب ترین عزیز واقارب بھی پکار اٹھے ہیں کہ: ''افغانستان کے غریب عوام پر ہولناک بم باری ایک ظلم ہے اور اس انتقامی کارروائی اور جنگ زرگری کے ذریعے ہمارے مرنے والوں کے خون کا سودا نہ کیا جائے''۔

ٹونی بین نے اس عالمی احساس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

[صدر امریکہ نے اپنی] ان کارروائیوں کو آغاز میں ''صلیبی جنگ'' قرار دیا۔

اب ہم کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ اسلام کے خلاف کوئی مقدس جنگ نہیں ہے۔ اگرچہ آرچ بشپ آف کنٹربری نے اپنے شرق اوسط کے حالیہ دورے میں اس کو ''منصفانہ جنگ'' قرار دیا ہے جس کی حمایت اچھے عیسائیوں کو کرنا چاہیے۔

اسامہ بن لادن کو نیویارک کے واقعات کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے لیکن اس پر مقدمہ چلائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔اس لیے کہ امریکہ کسی ایسے جنگی جرائم کے ٹربیونل کا مخالف ہے جس کو امریکی شہری پر مقدمہ چلانے کا اختیار ہو۔ بہرحال سابق صدر کلنٹن اور صدر بش پہلے ہی یہ احکامات جاری کر چکے ہیں کہ ''اسامہ بن لادن کو دیکھتے ہی گولی ماردی جائے''۔ یہ بالکل واضح ہے کہ امریکہ بن لادن کو عدالت میں کیوں نہیں لانا چاہتا۔ یقیناً وہ اپنے دفاع میں بتائے گا کہ افغانستان پر حملے کے بعد روسیوں کو نکالنے کے لیے خودسی آئی اے نے اسے ایک حریت پسند (یا دہشت گرد) کی حیثیت سے اسلحہ اور رقم فراہم کی تھی۔

دہشت گردی کی مذمت میں سلامتی کونسل کی قرارداد سے قطع نظر' یو این چارٹر میں امن کو درپیش خطرات سے نمٹنے کے لیے جو طریقۂ کار بیان کیا گیا ہے' اسے ترک کر دیا گیا ہے۔ نیٹو نے دفعہ ۵ کو متحرک کر کے اپنے کو ان ذمہ داریوں سے بری نہیں کرلیا ہے' جو معاہدہ نیٹو میں یو این چارٹر کی پابندی کرنے کے حوالے سے اس پر عائد ہوتی ہیں--- ہمیں یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ یہ منصفانہ جنگ ہے جو ہم جیت سکتے ہیں اور جیتنا چاہیے۔

شاید ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ کیا ہم اپنی خاموشی سے انسانیت کے خلاف جرائم کے ارتکاب میں شریک ہو رہے ہیں؟ کیوں کہ وہ لوگ جو پہلے ہی بہت تکلیف اٹھا چکے ہیں اب پھر اپنی سرزمین پر تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ بحیرہ کیسپین (Caspian Sea) کا تیل امریکہ کی مارکیٹ

میں لانے کے لیے ان کی زمین کی فوری ضرورت ہے۔[۴]

سر جان پلجر (Sir John Pilger) کئی کتابوں کے مصنف اور بی بی سی ٹیلی ویژن اور روزنامہ مرر کے چیف بین الاقوامی نامہ نگار رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک کھلا دھوکا ہے۔ جس میں دنیا کی غریب ترین اقوام میں سے ایک اور سب سے زیادہ مصیبت زدہ قوم کو دنیا کی طاقت ور ترین قوم کے ذریعے دہشت گردی کا اس حد تک نشانہ بنایا گیا ہے' کہ امریکی پائلٹوں کے لیے ''غیر یقینی'' فوجی اہداف ختم ہوگئے۔ جس کے بعد انھوں نے بلا روک ٹوک کچے گھروں' ہسپتالوں' ریڈ کراس کے گوداموں اور مہاجرین کو لے جانے والی بسوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

مبینہ طور پر ۱۱ ستمبر کے سانحے میں جو افراد براہ راست ملوث قرار دیے گئے ہیں' ان میں سے کوئی بھی افغانی نہیں ہے۔ بیش تر سعودی ہیں' جنھوں نے منصوبہ بندی اور تربیت بہ ظاہر جرمنی اور امریکہ میں حاصل کی۔ وہ کیمپ جن کے استعمال کی طالبان نے بن لادن کو اجازت دی تھی ایک ہفتہ قبل خالی ہو چکے تھے۔ طالبان خود امریکہ اور برطانیہ کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں وہ قبائلی فوج جس نے انھیں تیار کیا اسے سی آئی اے نے فنڈ فراہم کیے اور ایس اے ایس نے انھیں روس سے لڑنے کے لیے تربیت دی۔

منافقت صرف یہیں تک نہیں۔ ۱۹۹۶ء میں جب طالبان نے کابل پر قبضہ کیا تو واشنگٹن نے اس پر کوئی منفی تبصرہ نہ کیا۔ کیوں؟ کیونکہ طالبان کے لیڈروں کو جلد ہاؤسٹن' (ٹیکساس) میں ان سے معاملہ کرنا تھا' جہاں تیل کی کمپنی

۴- دی گارڈین' ۱۲ نومبر ۲۰۰۱ء

یونوکول (Unocal) کے اعلیٰ افسران کو ان کا استقبال کرنا تھا۔[۵] امریکی حکومت کی خفیہ منظوری سے کمپنی نے انھیں تیل اور گیس کی فراہمی میں وافر منافع دینے کی پیش کش کی' جو امریکہ' وسطی ایشیا سے افغانستان تک پائپ لائن کی تعمیر کے ذریعے چاہتا تھا۔

ایک امریکی سفارت کار نے کہا: طالبان غالباً سعودیوں کی طرح ترقی کے راستے پر چل پڑیں گے۔ اس نے واضح کیا کہ افغانستان تیل کی ایک امریکی کالونی بن جائے گا' اس میں مغرب کے لیے بہت منافع ہوں گے۔ کوئی جمہوریت نہ ہو اور نہ خواتین کی کوئی قانونی حیثیت' ہم اس صورت حال میں گزارا کر سکتے ہیں۔ اگرچہ سودا ناکام رہا' تاہم یہ جارج ڈبلیو بش کی انتظامیہ کی اہم ترین ترجیح رہی جو تیل کی صنعت سے وابستہ مفادات میں ڈوبا ہوا ہے۔ بش کا خفیہ ایجنڈا بحیرہ کیسپین کی تہ میں تیل اور گیس کے ذخائر کا استحصال کرنا ہے' جو دنیا کے محفوظ ذخائر میں سے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق امریکہ کی توانائی کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی ضروریات کے لیے آیندہ ایک نسل کے لیے کافی ہوں گے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب پائپ لائن افغانستان سے گزرے اور امریکہ کی امید بر آئے۔

۵- جب طالبان نے افغانستان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پیش رفت کی تو امریکی حکومت کو اس پر اطمینان تھا۔ کیونکہ اس طرح انھیں توقع تھی' کہ وسطی ایشیا میں تیل کے ذخائر تک رسائی میں امریکیوں کو کوئی چیلنج نہیں درپیش ہوگا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۹۸ء میں طالبان حکومت نے اعلان کیا کہ افغانستان میں تیل کی پائپ لائن بچھانے کا ٹھیکہ ارجنٹائن کی کمپنی بری ڈاس (Bridas) کو دیا جائے گا''۔ اس فیصلے نے بھی امریکی حکومت کو طالبان کے خلاف اقدام پر اُبھارا' پھر ۱۱ ستمبر کے سانحے نے انھیں حملہ کرنے کا بہانہ دے دیا۔ مرتب

عراقیوں' فلسطینیوں اور افغانیوں کا المیہ ایک حقیقت ہے۔ شرق اوسط اور جنوبی ایشیا کے مسلمان عالمی دہشت گرد تو کیا ہوتے' ان کی عظیم اکثریت خود دہشت گردی کا شکار ہے۔ یہ اپنے ممالک یا قریبی علاقوں کے قیمتی قدرتی وسائل کے سبب خود مغرب کے استحصال کا شکار ہیں۔

یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو رائل میرینز اور ایس اے ایس' فلوریڈا کے ساحلوں پر حملہ آور ہوتے' جہاں سی آئی اے کے پروردہ دہشت گردوں اور لاطینی امریکہ کے سابق آمروں اور سفاکوں کو دنیا کے کسی اور خطے کے مقابلے میں زیادہ پناہ دی جاتی ہے۔

تاہم' بے طاقتوں کے خلاف طاقت ور کی جنگ نئے بہانوں' نئے خفیہ ایجنڈوں اور نئے جھوٹوں کے ساتھ جاری ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور بچہ تشدد سے یا فاقہ کشی کی وجہ سے خاموشی سے ہلاک ہو جائے' اس سے پہلے کہ مشرق و مغرب میں نئے جنونیوں کی تخلیق کی جائے' یہ وقت ہے کہ برطانیہ کے عوام اپنی بات کو بھرپور طریقے سے منوائیں اور اس پرفریب جنگ کو بند کروائیں۔[6]

مغرب کے درجنوں دانش وروں نے اس ظالمانہ جنگ کو صریح ظلم اور سامراجی دہشت گردی قرار دیا ہے۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم صرف ان دو اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم یہاں پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہونے والے ایک سابق فوجی افسر کی بیوی امبر ایمنڈسن کا خط ضرور پیش کرنا چاہتے ہیں' جو ۷ اکتوبر کی بم باری کے بعد شائع ہوا اور جو دکھی انسانیت کے دل کی آواز ہے: وہ انسان خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں' افغانستان میں ہو یا امریکہ میں۔ لیکن اس کی آواز نہ صدر بش کے دل میں اتر رہی ہے اور نہ جنرل

۶- دی مرر' ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء

مشرف کے ضمیر کو جھنجھوڑ پا رہی ہے!

۱۱ ستمبر کو جب دنیا بے یقینی اور خوف کے عالم میں نظارہ کر رہی تھی' میرا شوہر کریگ اسکاٹ ایمنڈسن جو امریکہ کا فوجی افسر تھا' پنٹاگون میں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اپنے ۲۸ سالہ شوہر اور دو نوعمر بچوں کے باپ کو کھونا ایک تکلیف دہ اور الم ناک تجربہ ہے۔ اس کی موت عظیم قومی نقصان کا ایک حصہ ہے اور مجھے یہ معلوم کر کے سکون ہوتا ہے کہ اتنے بہت سے لوگ میرے غم میں شریک ہیں۔ میں نے اس تاریخی المیے کے ایک حصے کے طور پر کریگ کو کھو دیا ہے۔ لیکن میرا غم اس خوف سے بڑھ جاتا ہے کہ اس کی موت کو دوسرے معصوم مظلوموں کے خلاف تشدد کرنے کا جواز فراہم کرنے میں استعمال کیا جائے گا۔ میں نے قومی رہنماؤں سمیت کچھ امریکیوں کی غصے میں بھری لفاظی سنی ہے۔ وہ رہنما جو مسئلے کے حل کے لیے بہت زیادہ انتقام اور سزا کا مشورہ دے رہے ہیں' میں ان رہنماؤں پر واضح کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اور میرے خاندان کو غم و غصے کے ان الفاظ سے کوئی سکون نہیں ملتا۔ اگر وہ اس ناقابل فہم سفاکی کا جواب دوسرے معصوم انسانوں کے خلاف تشدد برت کر دینا چاہتے ہیں تو انھیں میرے شوہر کے لیے انصاف کے نام پر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی لفاظی اور انتقام کے فوری اقدامات میرے خاندان کی تکلیف کو صرف بڑھا سکتے ہیں' اور ہم کو اپنے پیاروں کو اس طرح یاد رکھنے میں جو ان کے لیے قابل فخر ہو' محروم کر سکتے ہیں اور امریکہ کے ایک امن ساز قوت کی حیثیت کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

کریگ اپنی موت کے انتقام کے لیے پرتشدد ردعمل ہرگز نہ چاہتا' اور میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس سے کوئی خیر کیسے برآمد ہو سکتی ہے۔ ہم تشدد کا مسئلہ تشدد سے حل نہیں کر سکتے۔ انتقام تو ایک خود بخود چلنے والا چکر ہے۔ میں قوم کے رہنماؤں

سے کہتی ہوں کہ ایسا راستہ اختیار نہ کریں جو زیادہ وسیع نفرتوں کی طرف لے جائے، جو میرے شوہر کی موت کو قتل و غارت کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی وجہ بنا دے۔ میں ان سے اپیل کرتی ہوں کہ اس ناقابل فہم المیے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ حوصلہ لائیں جس سے تشدد کا یہ چکر توڑا جا سکے۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ وہ اپنی توجہات دنیا میں امن و انصاف کے لیے کام کرنے پر مرکوز کریں۔[7]

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ صریح ظلم پر مبنی اس جنگ میں افغانستان میں جو کچھ ہوا، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا اصل مقصد افغان عوام کی کمر توڑنا، طالبان کے اقتدار کو ختم کرنا اور دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کو دہشت زدہ کرنا تھا کہ "یا ہمارے ساتھ رہو ورنہ تمھارا حشر بھی ایسا ہی کر دیا جائے گا"۔

افغانستان پر صرف پہلے چھ ہفتوں کے دوران ۵ ہزار سے زیادہ ہوائی حملے کیے گئے جن میں ۵ لاکھ سے زیادہ بم گرائے گئے۔ اس میں چپے چپے پر کی جانے والی بم باری (carpet bombing) کے علاوہ امریکی جنگی خزانے میں موجود ایٹم بم کا برادر نسبتی Daisy Cutter (ڈیزی کٹر) بے دردی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ہولناک بم ۱۵ ہزار پونڈ المونیم اور دوسرے کیمیاوی مواد کو زمین سے ۳ فٹ بلندی پر ۱۰ ہزار درجہ فارن ہائٹ گرمی کے ساتھ ایک آتشیں ہیولے کی شکل میں جنم دیتا ہے، اور پھر آگ کا یہ بادل ڈیڑھ کلومیٹر تک اس کی زد میں آنے والی ہر شے کو بھسم کر دیتا ہے۔ جو انسان یا اشیا اس کی شدید گرفت میں نہیں آتیں، لیکن تپش کی زد میں ہوتی ہیں، وہ جگر کے سرطان یا مستقل طور پر قوتِ سماعت سے محرومی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

یہ تہذیب کے وہ "تحفے" ہیں جو امریکہ نے افغانستان کے عوام کو دیے ہیں۔

۷- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، ۱۳ اکتوبر ۲۰۰۱ء

پاکستانی حکمرانوں نے اس جنگ کی نہ صرف تائید کی' بلکہ ان بے رحم حملہ آوروں کو فضائی حدود کے ساتھ زمینی سہولت بھی فراہم کی۔ مغربی اخبارات نے تفصیل سے بار بار لکھا ہے کہ کس طرح جنگی ہیلی کاپٹروں نے پاکستان کے فراہم کردہ ہوائی اڈوں سے پرواز کی اور پاکستان کی زمین کو اپنی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں بطور امریکی حلیف پاکستان کی شرکت' اثم وعدوان اور ظلم و سفاکیت میں شرم ناک تعاون کے مترادف ہے۔

۲۱ اور ۲۲ نومبر ۲۰۰۱ء کے برطانیہ کے اخبارات نے اطلاع دی: ''اب تک لاتعداد شہریوں کے علاوہ ۵ سے ۱۰ ہزار طالبان شہید کیے جا چکے ہیں' جن میں ایک ہزار کے قریب پاکستانی' عرب اور دوسرے رضا کار بھی شامل ہیں۔ مزار شریف' کابل اور دوسرے مفتوحہ علاقوں میں شمالی اتحاد کے وہ جنگجو' جو چار سال تک ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہ کر سکے تھے' اب امریکی بم باری اور امریکی فوجی مشیروں کی رہنمائی میں قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا یہ ''قبضہ'' ہر جگہ انتقام کی آگ بھڑکانے اور ہزاروں انسانوں کو ہلاک کرنے کا دوسرا نام ہے۔ وہ ان بے کسوں کی لاشوں کا مثلہ کر رہے ہیں۔ اپنے مسلمان اہل وطن کی بے گور و کفن لاشوں کی سڑکوں پر بے حرمتی کر رہے ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں ان کی پاک باز عورتوں کی آبرو ریزی کر رہے ہیں''۔

قندوز کے محاذ پر شمالی اتحاد کی قیادت ہی نے نہیں' بلکہ امریکی وزیر دفاع نے بھی کہا: ''یا ہتھیار ڈالو ورنہ موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہتھیار ڈالنے پر بھی جان کی امان نہیں اور جنگی قیدی بھی بنانے کے لیے ہم تیار نہیں''۔ اسلام تو بہت اعلیٰ تعلیمات کا دین ہے۔ یہ تو مغرب کے جنگی قانون اور جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ ظلم اور آتش انتقام کا وہ مقام تھا جس پر جنرل مشرف صاحب بھی چیخ اٹھے۔ وہ اپنے کیے پر نادم ہوں یا نہ ہوں' لیکن ٹونی بلیر اور کولن پاول سے درخواستیں کرنے پر مجبور ہوئے کہ ''رحم کرو اور کم از کم باعزت انخلا کا راستہ دو''۔

۴- **قومی مفادات یا امریکی مفادات:** جنرل مشرف نے اپنی اس پالیسی کے لیے ''قومی مفاد'' کے گھسے پٹے نعرے کا بھی سہارا لیا ہے۔ یہ وہ مظلوم نعرہ اور سہارا ہے جو ہر برسرِ اقتدار گروہ اپنے جائز و ناجائز اقدام کے لیے ہمیشہ استعمال کرتا چلا آیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ''قومی مفاد'' کا تعین کون کرے گا اور خود قوم کا بھی اس میں کوئی دخل ہے یا نہیں؟ ورنہ جس کا داؤ چل جائے بس اس کو ''قومی مفاد'' کے نام پر اپنا کھیل کھیلنے کا حق ہے؟

پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے کہا گیا: ''ہم نے اپنی ایٹمی تنصیبات کی حفاظت' کشمیر کی جدوجہد کی بقا اور مکمل تباہی سے بچنے کے لیے یہ اقدام کیا ہے''۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت کوئی ایسا خطرہ تھا کہ امریکہ' پاکستان پر حملہ کر دیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ محض ایک دھمکی اور خوف کا منظر پیدا کر کے امریکہ نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ ورنہ کیوبا جو امریکہ سے دو قدم پر ہے' اس کو بھی بار بار دھمکیاں دی گئیں' مگر اس کا بال تک بیکا نہ کیا جا سکا۔ پاکستان پر حملہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بھارت کو استعمال کیا جا سکتا تھا مگر نہ پاکستان اتنا کمزور اور بے یارومددگار ہے اور نہ بھارت اتنا احمق اور عاقبت نااندیش ہے کہ اس آسانی سے خودکشی پر تیار ہو جاتا۔ بین الاقوامی سطح پر تنہائی کی دہائی بھی دی گئی ہے' مگر یہاں بھی دنیا کے ممالک کی اکثریت نے امریکہ کا ساتھ نہیں دیا ہے اور دنیا کے ہر ملک میں امریکہ کی اس جارحیت کے خلاف ردعمل ہوا ہے۔

ہم نے حق و انصاف کی بنیاد پر دنیا کی رائے اور ہم خیال ممالک کو متحرک کرنے کا سوچا بھی نہیں۔ پوری عرب دنیا اور تیسری دنیا کے تمام ممالک حتیٰ کہ یورپ کے کئی ممالک اس امریکی دہشت گردی اور محاذ آرائی کی پالیسی کے مخالف ہیں۔ مسلم عوام اور دنیا کے عام امن پسند انسان اس کے خلاف ہیں۔ ہم نے خود کو ان سب سے حتیٰ کہ اپنے عوام اور افغانستان میں اپنے دوستوں سے اپنے کو کاٹ کر تنہا کر لیا اور خوش ہیں کہ ہمیں جرأت مندی کے تمغے دیے جا رہے ہیں۔ وہ جو کل تک آپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ جو آپ کو دولت

مشترکہ (کامن ویلتھ) ہی نہیں مہذب برادری سے' آپ کی فوجی وردی کی وجہ سے نکالنے کے لیے ڈٹے ہوئے تھے' وہ اپنے مفاد کی خاطر اب آپ کے ساتھ شیروشکر ہیں اور آپ کی پیٹھ تھپک رہے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ یہ مفاد کا کھیل ہے' محبت نہیں۔ ایک بات شہری آبادی کی حفاظت اور محدود نشانوں کی بھی کہی گئی تھی' لیکن سب نے دیکھ لیا کہ نشانہ کون کون تھا--- شہری آبادی' ہسپتال' مسجدیں' مدرسے' ریڈ کراس کے گودام' اقوام متحدہ کے دفاتر' الجزیرہ ٹی وی کا مرکز ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

۱۰ نومبر کو صدر بش اور جنرل مشرف مشترکہ پریس کانفرنس میں اعلان کر رہے تھے کہ ''شمالی اتحاد کو کابل میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا'' مگر عین اسی وقت امریکی طیاروں کی چھاؤں میں اور امریکی فوجی مشیروں کی رہنمائی میں شمالی اتحاد یہ بازی سر کر رہا تھا۔

یہ ایک ناخوش گوار حقیقت ہے کہ پاکستان نے جو کچھ ۲۲ سال کی قربانیوں سے حاصل کیا تھا' اسے ۲۲ گھنٹے میں امریکہ کے آگے جھک جانے کی ہمالہ سے بڑی غلطی نے پادر ہوا کر دیا۔ روس جو مقصد ۱۹۲۰ء سے ۱۹۸۹ء تک کی سیاسی اور عسکری کارروائیوں سے حاصل نہ کر سکا تھا' وہ امریکہ کی ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کی فوجی یلغار کے نتیجے میں ایک حد تک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب افغانستان کی سیاست میں روس کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہوگا۔ یہ خطرات افق پر منڈلا رہے ہیں کہ خدانخواستہ اب افغانستان میں بیرونی طاقتوں کے حلقہ ہائے اثر وجود میں آ ئیں گے۔

پاکستان جس strategic depth [دفاعی وسعت و گہرائی] کے خواب دیکھ رہا تھا وہ قصہ پارینہ بنتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جس مغربی محاذ کی طرف سے پاکستان مطمئن تھا وہ ایک بار پھر پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی آیندہ کی سلامتی پالیسی کو مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں کی فکر کرنا ہوگی۔ جس طوائف الملوکی کی طرف افغانستان جا رہا ہے'

اس کے اثرات سے خود پاکستان کو محفوظ رکھنا ایک نیا دردِ سر بن جائے گا۔

ایک بات ماضی کی غلطیوں اور محرومیوں کی تلافی کی بھی ہوئی تھی' مگر نومبر ۲۰۰۱ء میں سفرِ امریکہ کے دوران جنرل مشرف نے ایف ۱۶ طیاروں کے حصول کے لیے امریکی صدر سے بات کی تو جواب میں پاکستانی حکومت کے منہ پر طمانچہ مارا گیا: ''ایف-۱۶ کی بات کرنے والے تم کون ہوتے ہو؟'' معاشی امداد اور قرضوں کی معافی کے بھی بہت خواب دیکھے گئے اور پلاؤ پکائے گئے مگر حاصل کیا ہوا--- چند ملین ڈالر کی امداد' ایک ارب کے پیکج کی نوید' اور ورلڈ بنک کا بیان کہ ''ہم سے دو ارب پچاس کروڑ ڈالر کے ریلیف کی توقع نہ رکھو'' --- اور اس کے ساتھ ملک میں بے روزگاری میں اضافے' سرمایہ کاری میں جمود' بلکہ جو برآمدات ہو رہی تھیں ان میں بھی تعطل اور زیرِ تکمیل آرڈر تک کا اتلاف وہ پہلو ہیں' جن کے نتیجے میں معیشت کو دو ڈھائی ارب ڈالر کے خسارے کا اندیشہ ہے--- خدا نہ کرے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ندامت اور سزا دونوں ہی اس ''جرأت مند'' قیادت کے نتیجے میں قوم کی قسمت میں لکھے ہیں۔

ایٹمی تنصیبات کی حفاظت کی بھی بات ہوئی ہے' لیکن امریکی اخبارات اور خصوصیت سے نیویارک میں مشہور صحافی ہیسٹ (Heist) کی رپورٹ اگر صحیح ہے تو ہماری ایٹمی تنصیبات تک رسائی اور حفاظت کے نام پر سارے انتظامات گرفت میں لیے جا چکے ہیں ؎

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے!

کشمیر کے بارے میں اگرچہ بہت کچھ کہا گیا ہے' مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے حکم پر بعض جہادی تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی اور ان کے حسابات کو منجمد کر دیا گیا۔ جب کہ امریکہ کے سارے دباؤ کے باوجود لبنان تک نے حزب اللہ پر پابندی لگانے یا حسابات کی بندش سے صاف انکار کر دیا۔ امریکی وزیرِ دفاع' قومی سلامتی کی مشیر اور برطانوی وزیرِ دفاع تینوں نے بھارت کے خلاف نام نہاد دہشت گردی کے عنوان سے

ایسی مبہم باتیں کیں، جو کان کھڑے کرنے والی ہیں۔ کشمیر میں بھارت کا ظلم اور ریاستی دہشت گردی کے واقعات اس زمانے میں کئی گنا بڑھ گئے اور معصوم انسانوں اور مجاہدین کی شہادت اور آبادیوں کی تباہی میں اضافہ ہوا۔ آثار یہ دکھائی دیتے ہیں کہ فلسطین ہو یا کشمیر، باہر سے کسی حل کو مسلط کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کیا یہی اسٹرے ٹیجک معاملات کا وہ تحفظ ہے جسے ہمارے حکمرانوں کی جانب سے ''قومی مفاد'' کا نام دیا گیا ہے؟

طالبان کی خوبیاں اور کمزوریاں اپنی جگہ--- ہم طالبان سے کمزور تو کسی اعتبار سے بھی نہ تھے، مگر انھوں نے اپنی عزت اور اپنی روایات کے پاس میں جان کی بازی لگا دی اور کسی دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ بجا، ان کو بڑے نقصانات اٹھانے پڑے اور واحد سوپر پاور کی یلغار کا ۳۷ دن مقابلہ کرنے کے بعد بہت سے علاقوں سے پسپا ہونا پڑا۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ انھوں نے جان اور مال پر، عزت اور ایمان کو فوقیت دی۔ ان کے لیے خطرات ہم سے کہیں زیادہ تھے اور ان کی مشکلات اور مجبوریاں بھی ہم سے بہت بڑھ چڑھ کر تھیں۔ مگر انھوں نے مقابلے کا، خواہ وہ محدود مقابلہ ہی کیوں نہ ہو، راستہ اختیار کیا، لیکن ظلم اور ظالم کا چہرہ سب کے سامنے بے نقاب کر دیا ۔

سودا قمار عشق میں، خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اسلامی تعلیمات کی تضحیک

اس پوری بحث میں حکمرانوں نے اسلام کی بھی اچھی خاصی گت بنانے کی کوشش کی ہے۔

صدر مشرف نے فرمایا: ''ہم نے یہ فیصلہ عین اسلامی ہدایات اور تاریخی روایات

کے مطابق کیا ہے''۔ کچھ دلائل تو وہی گھسے پٹے ہیں' جن میں مظلوم معاہدہ ''صلح حدیبیہ'' پر طبع آزمائی کی جاتی ہے اور بے چارے ''میثاق مدینہ'' کی گوشمالی کی جاتی ہے۔ لیکن اس مرتبہ کچھ دور کی کوڑیاں نئی لائی گئی ہیں' جن میں ''حکمت'' اور ''چھوٹی برائی کو قبول'' کرنے کا تذکرہ قابل ذکر ہے۔ یہ اسلام اور مسلم اُمت پر ایک ظلم ہوگا کہ اس ظالمانہ کارروائی کے لیے اسلام کے نام پر جواز فراہم کرنے کی اس جسارت کو چیلنج نہ کیا جائے اور اس کے پاے چوبین کو بے نقاب نہ کیا جائے۔

۱- **اُمت مسلمہ' حق کی گواہ**: اسلام نے اس اُمت کو حق کا شاہد اور گواہ بنایا ہے اور اس کا فرض منصبی ہے کہ عدل و انصاف قائم کرے اور کسی حال میں بھی عدل اور انصاف کا دامن نہ چھوڑے' خواہ معاملہ اپنوں کا ہو یا حتیٰ کہ دشمن کا۔ قرآن کریم کا حکم ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (النساء ۴:۵۸)

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

لیکن حکومت پاکستان نے اس معاملے میں کھلے طور پر انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا' ظلم اور زیادتی کرنے والوں کا ساتھ دیا اور اپنے دوستوں کو چھوڑ کر ان پر حملہ کرنے والوں کی صف میں شامل ہو کر اللہ کے عذاب کو دعوت دی ہے۔

۲- **قومی ریاست کا مقام**: اسلام نے فرد یا ملک کے لیے مختلف شناختوں (identities) کی نفی نہیں کی' بلکہ کچھ حدود میں ان کو نہ صرف باقی رکھا' بلکہ معتبر قرار دیا ہے۔ البتہ سب کو ایک بالاتر شناخت کے' جو ایمان اور تقویٰ سے عبارت ہے' تابع کیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

(الحجرات ۴۹:۱۳)

لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم

میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔
یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

آج کی قومی ریاست ایک جدید سیاسی اکائی ہے' لیکن حبّ وطن اپنی اخلاقی اور نظریاتی حدود میں ایک اسلامی قدر ہے۔ اگرچہ اُمت مختلف ملکوں میں بٹی ہوئی ہے' تاہم ملک اور ملت دونوں کے حقوق میں ہم آہنگی اور پاس داری اسلامی اصولوں کے مطابق ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ اس لیے کہ اس نئی اکائی کے باوجود اُمت کا ایک نظریاتی وجود ہے۔ اور مسلمان عوام کا اجتماعی ضمیر اور ان کے قلوب کی دھڑکن کی مماثلت اس گئے گزرے دَور میں بھی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قرآن نے صاف فرمایا ہے:

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ○(المومنون ۲۳: ۵۲)
اور یہ تمھاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمھارا رب ہوں' پس مجھی سے ڈرو۔

خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے' نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے' نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے' نہ اس پر ظلم کرتا ہے (ترمذی' مشکوۃ)۔

مومن مومن کے لیے عمارت کی طرح ہے' جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کے لیے سہارا بنتا ہے (متفق علیہ)۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں' یعنی مسلمانوں کو اس طرح مل کر رہنا چاہیے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن سکیں:

تمام مسلمان فرد واحد کی طرح ہیں۔ اگر آنکھ دکھتی ہے تو پورا بدن بے قرار ہو جاتا ہے اور اگر سر میں درد ہوتا ہے تو سارا جسم بے چینی اور تکلیف محسوس کرتا ہے (مشکوۃ)۔

جس نے ظالم کی مدد کی تاکہ اس کے باطل کے ذریعے حق کو مغلوب کردے تو وہ اللہ کی اور اللہ کے رسولؐ کی حفاظت سے الگ ہوگیا۔(المعجم الصغیر للطبرانی 'ص۴۴' بحوالہ حدیث' ص۲۸۲)

اسی لیے قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ اگر مسلمان ظلم کا نشانہ بن رہے ہوں تو ان کی مدد کرو [ترجمہ]:

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں' اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے' وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو' اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔ (النساء ۴:۷۵-۷۶)

ان احکامات کی روشنی میں' جہاد کے مسائل میں تمام ہی فقہی مکاتب فکر کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی ایک اسلامی حصے پر غیر مسلم حملہ کریں تو دوسرے حصوں کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی یاوری اور اعانت کے لیے اس طرح اٹھ کھڑے ہوں جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اٹھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے موطا کی شرح میں لکھا ہے کہ "اگر ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہوگئی تو جہاد فرض ہوگیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہو اور ان کی شکست کا خوف ہو تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر جہاد فرض ہوگیا' خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے"۔ (مسئلہ خلافت از مولانا ابوالکلام آزادؒ)

قرآن و سنت کے ان تمام احکام کو بدقسمتی سے پاکستان کی حکمران قیادت نے

یکسر نظرانداز کر دیا' بلکہ ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے کو امریکی حملہ آوروں کی صف میں شامل کرلیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

۳- میثاق مدینہ کی مثال : امریکیوں سے جنگی اتحاد (coalition) کے لیے ''میثاق مدینہ'' کی مثال دی گئی ہے۔ جنرل مشرف صاحب نے اپنی ۱۹ ستمبر والی تقریر میں مدینہ کے پہلے چھ سال کی تاریخ بھی یاد دلائی ہے۔ لیکن کاش انھوں نے ''میثاق مدینہ'' کا مطالعہ کرلیا ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کے پہلے چھ سالوں کی تاریخ پر سرسری نظر بھی ڈال لی ہوتی تو وہ ایسی فاش غلط بیانی کے مرتکب نہ ہوتے۔

''میثاق مدینہ'' دراصل مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کے دستور کا خاکہ ہے' جس کا نصف مسلمان قبائل' نصف یہودی قبائل کے بارے میں ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ریاست کا حاکم اور تمام فیصلوں کے لیے آخری سند تسلیم کیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے: کیا امریکہ سے ہمارے عہد و پیمان اور افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف صدر بش کے بنائے ہوئے جنگی اتحاد کی یہی حیثیت ہے؟ اصل حکم اور فیصلہ کرنے والا کون ہے؟ ہمارا شمار تو مصاحبین میں اور صرف حکم برداری کرنے والوں میں ہے۔ کیا ''میثاق مدینہ'' میں مسلمانوں کی یہی حیثیت تھی؟ کہا جا سکتا ہے کہ میثاق کا اصل مقصد قریش مکہ کے مقابلے کے لیے حفاظت اور مہلت کا حصول تھا۔

اگر محض دلیل کے لیے بھی یہ بات مان لی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس کے مقابلے کے لیے کمر ہمت کس رہے ہیں؟ بھارت بھی اس جنگی اتحاد کا رکن رکین ہے اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ کیا ''میثاق مدینہ'' میں کوئی ایسا بھی شریک تھا؟ چلیے اس بات کو چھوڑیے' یہی بتایے کہ کیا افغانستان اور افغانستان کی طالبان حکومت کی حیثیت قریش مکہ والی تھی جن کے مقابلے کے لیے ہم امریکہ کے حلیف بنے؟

مدنی دور کے چھ سال کی تاریخ کا بار بار ذکر کیا گیا۔ لیکن کیا جنرل مشرف صاحب

اور ان کے مشیروں کو اس کا علم نہیں کہ ان چھ سالوں میں میثاق مدینہ پر دستخط کرنے والے یہودیوں کا کردار کیا تھا۔ کیا شوال ۲ ہجری ہی میں غزوہ بنی قینقاع واقعہ نہیں ہوا' جس میں معرکہ بدر کے فوراً بعد بنوقینقاع کے یہودیوں نے اعلان جنگ کیا' ۱۵ دن تک محاصرہ رہا اور بالآخر بنوقینقاع کے یہودی خود اپنے حلیف عبداللہ ابن ابی کی سفارش پر جلاوطن نہیں کیے گئے۔ پھر کیا ۳ ہجری میں بنونضیر کی طرف سے کش مکش کا آغاز نہیں ہوا' جو ۴ ہجری میں غزوہ بنونضیر پر منتج ہوا اور بالآخر بنونضیر بھی مدینہ چھوڑ گئے۔ پھر انھی چھ برسوں میں تیسرے بڑے یہودی قبیلے بنوقریظہ نے بھی بدعہدی کی' معرکہ آرائی ہوئی اور بالآخر تلوار کو ان کا بھی فیصلہ کرنا پڑا۔ دور نبویؐ کی تاریخ کا آنا کانا مطالعہ اور پھر اپنے کمزور موقف کی تائید میں اس سے خطرناک نتائج نکالنا ایک خطرناک جسارت ہے' جس کا ارتکاب جنرل مشرف صاحب نے کیا ہے۔

۴۔صلح حدیبیہ سے استدلال : معاہدہ "صلح حدیبیہ" بھی ہماری تاریخ کے ان مظلوم واقعات میں سے ایک ہے' جسے ہر پسپائی اختیار کرنے والا اپنی بزدلی اور بے تدبیری کے لیے ڈھال بنانے کی مجرمانہ کوشش کرتا ہے۔ معاہدہ تاشقند ہو یا کیمپ ڈیوڈ اور اوسلو کا معاہدہ' کارگل ہو یا ۱۴ستمبر کی پسپائی' ان سبھی کے کرتا دھرتا "صلح حدیبیہ" کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ صلح وہ ہے' جسے قرآن نے فتح مبین کا پیش خیمہ قرار دیا ہے اور فی الواقع وہ فتح کی باب کشا ثابت ہوئی۔ اس صلح کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جان نثاروں کے ساتھ بیت اللہ کے عمرہ کے لیے تشریف لائے تھے اور آپؐ نے رکاوٹ کو تلوار سے دُور کرنے کے بجائے اللہ کے حکم سے ایک سال بعد معاہدے کے ذریعے اس سعادت کو حاصل کرنے کی بات طے فرمائی۔

بھلا اس فریم ورک کا امریکی جال میں پھنسنے اور پھر ایک مسلمان ملک کے خلاف ایسے الزامات کی تائید میں' جو حقائق اور اصول انصاف کے مطابق ثابت تک نہیں ہوئے' فوج کشی کے لیے کندھا پیش کر دینے کا کیا تعلق ہے؟ پھر سب سے بڑھ کر حضور اکرمؐ نے

فرمایا کہ: ''وہ یہ معاہدہ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں''۔ آج کس پر یہ وحی نازل ہوئی ہے اور کس دلیل کی بنیاد پر اسے اسلام کے لیے کسی ''فتح'' اور پاکستان کے لیے کسی ''کامیابی'' اور حصول عظمت کا زینہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

بلاشبہ حکمت' دین کا بڑا اہم اصول اور پالیسی سازی کے لیے رہنما اصول ہے۔ لیکن حکمت اور حماقت اور غیرت اور بزدلی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حکمت' عبارت ہے: ایمان و فراست' صبر و استقامت' جرأت و قوت اور اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے یکسوئی اور مسلسل جدوجہد سے۔ حکومت پاکستان نے ۱۴ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد حکمت کے نام پر ان میدانوں میں کون سا تیر مارا ہے۔ اس قیادت کی حکمت کا تو یہ حال ہے کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور جس جس بات کو ضمانت سمجھ رہے ہیں وہ ہمارے منہ پر ماری جا رہی ہے اور ہم تمام ذلت و خواری برداشت کر کے اسی تابع داری سے تعاون کرنے کی رضامندی کا اعادہ کیے جا رہے ہیں۔ اس کا نام حکمت نہیں اور نہ اس کا کوئی تعلق قومی غیرت اور آزادی و سلامتی سے ہے۔ اسے حکمت اور دینی حکمت کا نام دینا حکمت جیسے معتبر لفظ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

۵- چھوٹی بڑی برائی کی منطق: آخری دلیل چھوٹی اور بڑی برائی والی ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یا تو ان ساری ترک تازیوں کو حکمت' میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ کے ہم پلہ قرار دیا جا رہا تھا اور کہاں پھسل کر چھوٹی برائی کا وعظ شروع ہو گیا۔ اگر یہ حکمت اور قومی مفاد کا تقاضا تھا تو پھر چھوٹی برائی کیسی؟ اور اگر یہ چھوٹی برائی ہے تو پھر ان ارفع اصولوں کی مٹی کیوں پلید کی جا رہی ہے؟ دوسروں کو جذباتی کہنا آسان ہے' لیکن خود عقل کی بات کرنا بھی کوئی ایسا آسان کام نہیں!

ہم مان لیتے ہیں کہ **اھون البلیتین** ایک فقہی اصول ہے اور کچھ حالات میں اسے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت لاگو ہوتا ہے جب کوئی تیسرا راستہ ممکن نہ ہو۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ایک اور راستہ ممکن تھا۔ ایک نہیں ایک سو سے زیادہ ملکوں نے اسے اختیار کیا۔

بلکہ مصر' ایران اور سعودی عرب تک نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو ہم نے کیا۔ بھارت کی جانب سے فائدہ اٹھانے کا راستہ روکنے کی دہائی بے موقع ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کی پوزیشن اسٹرے ٹیجک تھی اور ہے۔ بھارت کی کوئی سرحد افغانستان سے مشترک نہیں۔ وہ ساری اچھل کود کے باوجود کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تھا۔ ان زمینی حقائق کی روشنی میں صدر بش کے اس کلیے کو تسلیم کر لینا کہ راستے صرف دو ہیں اور ان میں سے پسپائی کے راستے کو چھوٹی برائی قرار دے کر اختیار کر لینا فقہی اصول کے اعتبار سے ناقابل قبول اور ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مترادف ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے ''میثاق مدینہ'' اور ''صلح حدیبیہ'' کی بات کرنے والوں کو تاریخ میں غیر مسلم طاقتوں سے معاہدات کے انجام کی یاد دلانا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔ دورِ رسالت مآبؐ سے لے کر آج تک' اور خصوصیت سے دور جدید کی مغربی اقوام نے استعماری غلبے سے لے کر اب تک' مسلمان ممالک بلکہ تمام غیر مغربی اقوام اور خصوصیت سے کمزور ممالک کے ساتھ جو کچھ کیا ہے' اس سے صرف نظر کرنا اور ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جاتے رہنا کوئی حکمت کا شاہکار نہیں۔ امریکہ نے اپنے گذشتہ نصف صدی میں جس طرح پاکستان سے اور دوسرے مسلم ممالک سے اپنی دوستی نبھائی ہے' اس سے آنکھیں بند کرنا خودفریبی ہی نہیں خودکشی کا راستہ ہو سکتا ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نئی قیادت' نئی حکمت عملی

ہم دنیا سے کٹنے اور کسی قسم کی بھی تنہائیت (isolationism) کے قائل نہیں۔

اچھے اور برے دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ افغانستان پر امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ بہت سے غیر مسلم اور مشرک ہی نہیں

مغرب کے اہل علم و دانش، سیاست کار اور عوام بھی شامل ہیں۔ ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن امریکہ کی قیادت جو سیاسی کھیل کھیل رہی ہے اور یہود، ہنود، اور نصاریٰ جو چالیں تاریخ میں چلتے رہے ہیں، ان کو نگاہ میں نہ رکھنا اور بڑی معصومیت سے ہر ٹھوکر پر ''میثاق مدینہ'' اور ''صلح حدیبیہ'' کی گردان کرنا بھی فراست اور دیانت کا راستہ نہیں۔

جس قرآن نے حکمت، دوستی، امن اور انسانیت کے لیے رحمت بننے کا درس دیا ہے اور اہل کتاب میں سے اچھے لوگوں کی قدر کی تعلیم دی ہے، اسی میں یہ ابدی رہنمائی بھی موجود ہے کہ: اپنی آنکھیں کھلی رکھو، اہل ایمان کے مقابلے میں کفار کو دوست نہ سمجھو، دوسروں کی چالوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھو، اور حق و باطل کی کش مکش میں اپنا کردار اللہ کے دین کی مصلحتوں کے مطابق ادا کرو:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ط (النساء ۴: ۱۴۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط (البقرہ ۲: ۱۲۰)

یہ یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت اور اس کی قیادتوں کو قیامت تک کے لیے متنبہ کر دیا ہے کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ صرف اللہ سے وفاداری کا رشتہ استوار کریں۔ سب سے معاملہ کریں، مگر خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایت اور روشنی کے مطابق کریں۔ دوستی اور دشمنی، الحاق اور انحراف، صلح اور جنگ، تعاون اور عدم تعاون سب کا فیصلہ اللہ کے دین کے احکام اور اُمت مسلمہ کے مصالح کے مطابق کریں اور مخالفین کی چالوں اور فتنہ سامانیوں سے خبردار رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تاریکی میں نہیں چھوڑا ہے، سب حالات

کے لیے ہمیں رہنمائی سے نوازا ہے ــــــ اگر ہم اس ہدایت کو نظر انداز کرتے ہیں اور اپنی خواہشات یا دوسروں کی ترغیبات کا شکار ہو جاتے ہیں تو ذمہ داری ہماری ہے اور اس کے نتائج بھی ہمیں ہی بھگتنا ہوں گے۔

جنرل مشرف صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ۱۴ ستمبر کو امریکہ کے آگے سپر ڈال کر ملک و ملت کو ایک بہت ہی خسارے کے راستے پر ڈال دیا ہے' جس کی قیمت اس قوم کو برسوں ادا کرنا پڑے گی۔ جن اُمیدوں پر انھوں نے یہ بازی لگائی وہ بے وقعت بلبلے کی مانند ہیں اور بہت سے بلبلے تو ان چند ہفتوں ہی میں ٹوٹ چکے۔ جس دلدل میں انھوں نے قوم کو پھنسا دیا ہے وہ اپنے آخری انجام میں تباہ کن ہے۔ اگر اس راستے میں کچھ وقتی اور جزوی فوائد بھی ہوں تب بھی نقصانات اور مفاسد کا پلڑا اتنا بھاری اور ان کی نوعیت اتنی گمبھیر ہے کہ اسے پاکستان کی تاریخ کا سب سے افسوس ناک اور نقصان دہ اقدام قرار دینا ہوگا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد یہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین فیصلہ ہے۔ ۱۶ دسمبر والے سانحے کے بعد تو پاکستان اور بنگلہ دیش میں دوستی اور تعاون کا ایک نیا دَور شروع ہو گیا ہے۔ لیکن اس اقدام کے جو اثرات ہمارے ایمان کے ساتھ ہماری آزادی' سلامتی' معیشت' ایٹمی صلاحیت' خود کشمیر کی تحریک آزادی و الحاق پاکستان اور علاقے کے ممالک سے تعلقات پر مرتب ہوں گے' ان کے تصور سے روح کانپ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے ہوئے ان مہیب خطرات کے ادراک اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی حکمت عملی اور نئی قیادت کی دعا ہمارے دل کی آواز ہے۔

یہی وہ پکار ہے جس کی طرف ہم ملک کے عوام کو دعوت عمل دیتے ہیں۔

☆ ترجمان القرآن' دسمبر ۲۰۰۱ء

نیا استعمار

اہداف، حکمت عملی اور جوابی لائحہ عمل

افراد کی کامیابی اور ناکامی، فوجوں کی فتح و شکست، قوموں کے عروج و زوال، حکومتوں کے بناؤ اور بگاڑ اور تہذیبوں کے غلبے اور پسپائی کے کچھ اٹل، طبعی اور اخلاقی قوانین ہیں جن کی کارفرمائی زندگی کے ہر میدان اور تاریخ کے ہر دور میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حقیقت پسندی کا راستہ

کچھ لوگوں کی نگاہیں صرف طبعی عوامل پر مرکوز ہوتی ہیں، لیکن بالآخر طبعی عوامل کی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کچھ دوسرے افراد صرف اخلاقی عوامل کی بات کرتے ہیں لیکن یہ بھی تصویر کا صرف ایک رخ دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک طبعی اور اخلاقی دونوں عوامل کا مکمل اور مربوط ادراک نہ ہو حقیقت پر پوری گرفت ممکن نہیں ــــ اسی طرح حالات کا ہر وہ تجزیہ نامکمل ہوگا جو صرف فوری عوامل اور اثرات تک محدود ہو اور جس میں نہ حقیقی اسباب کا صحیح ادراک ہو اور نہ مستقل اور دیرپا نتائج کا شعور۔

افغانستان میں بہ ظاہر امریکہ کو فوجی کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن فی الحقیقت اسے تاریخ کی بدترین اخلاقی شکست ہوئی ہے۔ طالبان کی حکومت ختم کر دی گئی ہے اور ان کی بے سروسامانی' سیاسی تدبر کی کمی اور عسکری حکمت عملی کی خامیاں تو بیان کی جا سکتی ہیں لیکن اپنے اصول اور روایات کی پاس داری کے باب میں ان کی اخلاقی برتری سے انکار ناممکن ہے۔

افغانستان پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوج کشی کا پہلا مرحلہ اب مکمل ہوا چاہتا ہے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات نے جس طوفان کو جنم دیا تھا اور جس نے ۷ اکتوبر کو افغانستان کو اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا تھا' وہ ایک غریب' تباہ شدہ اور بدنصیب مگر غیرت مند ملک کو تقسیم کرنے کے بعد اپنی کامیابی کے شادیانے بجاتے ہوئے نئے سے نئے شکاروں کی تلاش میں کروٹیں لے رہا ہے۔ طالبان کی حکومت کو ختم کر کے امریکہ نے جرمنی کے شہر بون میں مذاکرات کے ذریعے ایک نیا سیاسی بندوبست قائم کیا ہے۔ جسے وہ اپنے نقشے کے مطابق تصور کرتا ہے اور اسے اپنے اور اپنے اتحادیوں کی عسکری قوت کے سائے میں مستحکم کرنے کی اُمید رکھتا ہے۔ طالبان کی قوت بہ ظاہر منتشر ہو گئی ہے' اسامہ بن لادن تادم تحریر عسکری اور سیاسی غلبہ پانے والوں کی گرفت سے باہر ہیں' لیکن ان کی القاعدہ تنظیم کے کچھ مجاہد خاک و خون میں لوٹ چکے ہیں' ایک تعداد جیلوں میں بدترین تشدد کا سامنا کر رہی ہے اور باقی دربدر ہیں۔

امریکی وزیر خارجہ جنرل کولن پاول نے فخر سے اعلان کیا: ''ہم نے افغانستان میں القاعدہ کو تباہ کر دیا ہے اور دہشت گرد سرگرمیوں کی پناہ گاہ کی حیثیت سے افغانستان کے کردار کو ختم کر دیا ہے''۔[1] امریکی وزیر دفاع رمس فیلڈ خود اپنے تباہ کردہ کابل پر شاہانہ نزول کے موقع پر کہا: ''ہم نے دہشت گردی کا افغانستان سے صفایا کر دیا ہے اور ان کو پناہ دینے

۱- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون' ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

والی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ نئی افغان حکومت آیندہ بھی ان کے عزائم میں شریک کار رہے گی اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور میں یہ یقینی بنانا چاہتا ہوں کہ ہماری سوچ ایک ہی ہے"۔[۲] اور امریکہ کی قومی سلامتی کی مشیر کونڈا لیزا رائس دوسرے شکاروں کی تلاش میں سرگرداں ہیں: "کوئی بھی یہاں قبل از وقت فتح کا اعلان کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور فتح صرف اسی وقت حاصل ہوگی جب ساری دنیا میں القاعدہ کا جال توڑ دیا جائے گا"۔[۳]

گویا ایک مرحلہ پورا ہوگیا' آگے کے مرحلوں کا انتظار کرو--- یہ ہے ۱۱ ستمبر کو اٹھنے والے طوفان کی آج تک کی حشر سامانی کا ایک پہلو۔ لیکن اس مرحلے پر' اب تک کے اقدامات کا اس پہلو سے جائزہ لیا جانا ضروری ہے کہ امریکہ' عالمی برادری اور افغانستان اور خود ۱۱ ستمبر کے ذمہ داروں نے اس سارے خونی عمل سے کیا پایا اور کیا کھویا—— تاکہ آیندہ کے اقدامات سے پہلے' غوروفکر اور تحلیلی تجزیے کے ذریعے پالیسی سازی کے لیے مفید مطلب بنایا جا سکے۔ دنیا کی اقوام اور لوگ محض جذبات کی رو میں آگے بڑھتے نہ چلے جائیں بلکہ رک کر تھوڑا سا جائزہ بھی لے لیں اور انسانیت کو بگاڑ کے مقابلے میں بناؤ اور بہتری کی طرف لے جانے کی فکر کرسکیں۔ آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی تیار ہو جائیں کہ خطرے کی خبر بھی خطرے سے بچنے اور پیش بندی کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔

طالبان کا کردار

۱۱ ستمبر کے واقعات کا جو بھی ذمہ دار ہے (اور سارے خون خرابے کے باوجود دنیا

۲- دی گارڈین' ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

۳- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹربیون' ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

ابھی تک شبہات کے دھندلکوں سے باہر نہیں آ سکی) اس نے عالمی سطح پر ایسے حالات کو پیدا ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے جن کے نتیجے میں سیاست کا نقشہ بدل گیا ہے یا صحیح تر الفاظ میں: جس طرف مقتدر قوتیں اسے لے جانا چاہتی تھیں وہ ممکن ہو گیا ہے۔

اسی طرح افغانستان پر حکومت کرنے والے طالبان کے فیصلوں پر بھی مدتوں بحث ہو گی: وہ اگر ایسا کرتے تو کیا ہوتا اور ایسا نہ کرتے تو کیا ہو سکتا تھا؟ آج تو صرف ان میں کیڑے نکالنے ہی کی خدمت انجام دی جا رہی ہے اور ہر برائی ان کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے۔ بلاشبہ ان کے سات سالہ دور حیات اور پانچ سالہ دور اقتدار کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں، جن کے بارے میں تاریخ کا قاضی اپنا بے لاگ فیصلہ ایک نہ ایک دن ضرور دے گا۔

بظاہر طالبان آندھی کی طرح اٹھے اور دو سال میں افغانستان کے ۹۰ فی صد علاقے پر کسی بڑے پیمانے کی جنگ و جدل کے بغیر چھا گئے۔ ۲۰۰۱ء کے آخری تین مہینوں میں دنیا کی سب سے طاقت ور سوپر پاور کی یلغار اور اپنوں کے دباؤ (جنھوں نے ہوا کا رُخ دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں) کے مقابلے میں ان کی مزاحمت دم توڑ گئی ـــــ کچھ حلقوں میں ان کی اصول پرستی اور قبائلی روایات کی پاس داری کی باتیں ہوں گی تو کچھ کی نگاہ میں ان کی سیاسی ناپختگی اور عسکری بے تدبیری قابل ذکر ہو گی، بلکہ وہ اپنی تباہی کو خود دعوت دینے کے مرتکب بھی قرار پائیں گے۔ افغانستان کے تباہ شدہ کھنڈرات، بے یار و مددگار لاشوں کے انبار اور بے گھر خاندانوں کے قافلے اپنی اپنی داستانیں سناتے رہیں گے۔ جب کہ سوچنے والے سوچتے رہیں گے اور غم کرنے والے نوحہ کناں رہیں گے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اگر طالبان محض ایک حکومت تھے تو وہ ختم ہو گئے، اور اگر وہ فی الحقیقت ایک تحریک تھے تو تحریکیں محض سیاسی نشیب و فراز سے ختم نہیں ہوتیں۔ خود احتسابی کی یہاں بھی ضرورت

ہے اور تاریخ تو ہر کسی کا احتساب برابر کرتی رہے گی۔ نئی حکومت کو بھی اپنے احتساب سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ نہ وہ انتظام ابدی تھا اور نہ یہ بندوبست مستقل ہو سکتا ہے: ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ جس نوعیت کی کش مکش میں آج افغانستان‘ بلکہ پوری امت مسلمہ مبتلا ہے اس میں وقتی تبدیلیاں اور فتح و شکست فیصلہ کن بھی ہو سکتی ہیں اور گمراہ کن بھی! جو بازی آج کھیلی جا رہی ہے اس کے بارے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ

کبھی جیت کر نہ جیتی‘ کبھی ہار کر نہ ہاری

اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پورے عالمی تناظر میں نگاہ ڈالیں ۔گویا انگریزی محاورے کے مطابق درخت پر ہی نہیں اس جنگل پر بھی نظر رکھیں‘ جس کے یہ شجر صرف چند ہی شریک کار ہیں یعنی Seeing the wood and not merely some of the trees ۔اس خوں آشام اور حسرت ناک جوار بھاٹے کی آغوش سے جو افغانستان سیاسی نقشے پر ابھرنے والا ہے‘ اور جن حالات کی طرف مسلم دنیا ہی نہیں‘ تیسری دنیا‘ بلکہ صحیح تر الفاظ میں پوری دنیا کشاں کشاں بڑھ رہی ہے‘ اس کے ادراک کی ضرورت ہے۔ یہ حالات دنیا بھر کے امن پسند اور انصاف کے طالب انسانوں کے لیے ایک گراں قدر لمحہ فکریہ فراہم کر رہے ہیں ـــــ اور مسلمان ممالک اور اسلامی قوتوں کے لیے تو یہ فیصلے کی گھڑی ہے!

ا

۱۱ستمبر کے بارے میں ایک جملہ میڈیا سے لے کر سیاسی قائدین اور کالم نگاروں تک سب ہی کی زبان اور نوک قلم پر گردش کر رہا ہے: ''اس دن کے بعد دنیا بدل گئی اور زمانہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا''۔ لیکن کیا کیا جائے کہ یہی جملہ اس سے پہلے بھی بہت سے تاریخی لمحات کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے۔

نئے استعمار کی پیش رفت

۱۹۸۹ء میں دیوار برلن کے انہدام پر' ۱۹۷۹ء میں انقلاب ایران کے موقع پر' ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب روس کے غلغلے پر اور خصوصیت سے ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس کے تاریخی لمحات کے بارے میں بھی کثرت سے یہ جملہ دہرایا گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انقلاب فرانس کے دو سو سال بعد عوامی جمہوریہ چین کے دانش ور وزیراعظم چواین لائی [م:۱۹۷۶ء] نے برملا کہا تھا: ''انقلاب فرانس کے بارے میں یہ اظہار رائے ذرا قبل ازوقت ہی' ہے! ابھی اور انتظار کرو''۔ اس لیے ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے بارے میں تو معلوم نہیں ابھی کتنے انتظار کی ضرورت ہوگی____

لیکن کچھ پہلو ایسے ہیں جن پر فوری غوروفکر اور بحث و گفتگو کی ضرورت ہے:

۱- **صدر بش کا نشۂ کامرانی:** اس واقعے کے بعد جس طرح صدر جارج بش نے امریکہ میں لام بندی کی ہے' جذبات کو ایک خاص انداز میں ابھارا ہے اور دہشت گردی کے خلاف عالم گیر جنگ کی نفیر دی ہے' اس کا سب سے زیادہ فائدہ خود جارج بش کی ذات کو پہنچا ہے۔ ان کی صدارت جس طرح وجود میں آئی' وہ اخلاقی اور ایک حد تک قانونی جواز سے محروم تھی۔ چار ارب ڈالر کی صدارتی انتخابی مہم چلانے کے بعد بھی عام ووٹوں کی حد تک ریپبلکن صدارتی امیدوار جارج بش کو اپنے مدمقابل سے پانچ لاکھ ووٹ کم ملے تھے۔ انتخابی ادارے (الیکٹورل کالج) کے سہارے فلوریڈا کی ریاست کے ووٹوں پر' جہاں خود ان کے بھائی گورنر تھے' ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔ لیکن اسی ریاست میں ووٹوں کی گنتی وجہ نزاع بن گئی۔ پھر تقریباً چھ ہفتے پر پھیلی ہوئی سیاسی اور عدالتی جنگ کا آغاز ہوگیا' جس کے بارے میں بہت سی کہانیاں سامنے آئیں۔ اس طرح تیسری دنیا کے ممالک میں ہونے والے بہت سے کرتب اور کرشمے امریکہ کی ترقی یافتہ جمہوریت کی قسمت کا فیصلہ کرتے نظر آنے لگے۔ بالآخر عدالت عظمیٰ کے ایک ووٹ کے سہارے ان کو صدارت مل گئی۔ یہ عدالت بھی ججوں میں اس طرح تقسیم تھی کہ ایک پارٹی کے دور کے نامزد

جج ایک طرف اور دوسری پارٹی کے زمانے کے نامزد جج دوسری طرف ہو گئے۔ نتیجتاً جارج بش کی صدارت' حلف صدارت اٹھانے کے باوجود حقیقی سند جواز کی تلاش میں تھی۔

۱۱ ستمبر نے وہ نادر موقع فراہم کر دیا اور چند گھنٹے زیر زمین اور چند گھنٹے آسمان کی فضاؤں میں حفاظت کی تلاش کے بعد وہ واشنگٹن کی زمین پر اس طرح اترے کہ امریکی قوم کے جذبات کو ایک نئی جنگ کے لیے متحرک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ۲۰ ستمبر کو امریکی مقننہ کے دونوں ایوانوں سے خطاب نے ان کو ایک نئے فراز سے نوازا۔ جسے نصف سے کم ووٹوں کے نصف سے بھی کم کی تائید حاصل تھی' وہ ۸۲ فی صد کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس تائیدی لہر پر دنیا بھر کو اپنے جھنڈے تلے لانے اور افغانستان پر حملہ کر کے قوم کے جوش انتقام کو استعمال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ان کے گرد عقابوں (hawks) کا دائرہ مضبوط تر ہوتا گیا اور ایک جنگجو لیڈر بلکہ فاتح صدر کی حیثیت سے ان کا سر بلند ہو گیا۔

۱۱ ستمبر کے پیچھے امریکی انتظامیہ کی جو ناکامیاں اور خصوصیت سے سیاسی اور خفیہ ایجنسیوں کی کوتاہیاں تھیں' ان سب پر پردہ پڑ گیا۔ دنیا کے سب سے کمزور اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ ملک افغانستان' ایک فرد واحد (اسامہ بن لادن) اور اس کے چند سو یا چند ہزار ساتھیوں پر دنیا کی واحد سوپر پاور نے اپنے اتحادیوں کی بے پناہ تائید' اپنی تمام عسکری' تکنیکی' عددی' معاشی اور ابلاغی (media) قوت کے ساتھ حملہ کیا اور دو چار دن نہیں پورے دو مہینے میں اسے مغلوب کر دینے کا ''تاریخی کارنامہ'' انجام دیا۔ گویا مرے کو مارے شاہ مدار! اس ''عظیم فتح'' نے ماضی کی تمام ہزیمتوں کو دھو ڈالا اور امریکہ اور اس کے صدر کے لیے کامیابیوں اور عالمی بالادستی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ یہ ہے وہ شے جسے American triumphalism (فتح ہمیشہ امریکہ کی) کہا جا رہا ہے اور سوپر پاور خوشی اور فخر سے جامے میں پھولے نہیں سما رہی!

۲- ناقابل تسخیر ہونے کا زعم: ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگون کی تباہی سے

جس ضرب پذیری کا اظہار ہوا تھا' اس طرح اس کا تدارک بھی ہو گیا۔ گویا کمزوری اور زخم خوردگی کا احساس ختم ہوا اور امریکی قوت کا دبدبہ ایک بار پھر قائم ہو گیا۔ اس میں تین پہلو ایسے مزید سامنے آئے جن کی وجہ سے امریکہ کو بلاشرکت غیرے دنیا کی بالاترین قوت ہونے اور اپنی اس حیثیت کو ثابت کرنے کا موقع مل گیا۔ اولاً: دوسرے ۴۰' ۵۰ ملکوں کا طوعاً وکرہاً امریکہ کے اشارے پر صف بند ہو جانا' ثانیاً: افغانستان کی جنگ میں ایسی ٹکنالوجی کا استعمال جس نے فنی اعتبار سے امریکہ کو' (افغانستان تو بے چارہ کس شمار قطار میں تھا)' یورپ' لاطینی امریکہ اور دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں بھی ان سے انچوں نہیں گزوں بلند ہونے کے مظاہرے کا موقع مل گیا۔ لڑاکا طیارے ہوں یا جاسوسی کا نظام' بم ہوں یا جنگ کا دوسرا اسلحہ' ہر باب میں امریکہ نے گذشتہ دس سال میں جو غیر معمولی ترقی کی تھی اس کا بھرپور اظہار ہوا۔

اس حملے سے معلوم ہوا کہ افغانستان میں جنگ فلوریڈا سے بیٹھ کر لڑی جا سکتی ہے۔ ایک ایک غار اور ایک ایک نشانے پر مار کرنے کا حکم بارہ ہزار کلومیٹر دُور سے دیا جا سکتا ہے۔ یہ بالکل ایک دوسری ہی قسم کی جنگ تھی جس نے روایتی جنگ کے سارے طور طریقے بدل کر رکھ دیے۔ اب نہ مدمقابل سے لڑنے کی ضرورت ہے' نہ زمینی فوجوں کی حاجت ہے۔ بس فضا سے آگ برساتے رہو اور مقابل قوت کو پارہ پارہ کر دو۔ میدانِ جنگ میں دو دو ہاتھ کرنے کا جن کو شوق ہو' وہ شوق دھرے کا دھرا رہ جائے۔ حتیٰ کہ اگر جیل کے بے بس قیدیوں کو بھی خاک و خون میں تڑپانا ہو تو اس کے لیے بھی آسمان ہی سے آگ برسائی جا سکے۔ انسانوں کے بغیر مشینوں کے ذریعے سارا کام لیا جائے' معلومات کا بھی اور بم برسانے کا بھی۔ اس سے جنگ کی پوری بساط ہی بدل جاتی ہے۔ اب اس میدان میں بہ ظاہر امریکہ کا کوئی حریف نظر نہیں آ رہا۔

اس سے تیسرا پہلو یہ ابھرا کہ اب لڑائی حملہ آور قوت کے لیے انسانی جانوں کی قربانی دیے بغیر فتح کا پیغام لا سکتی ہے۔ ساری جانی قربانی مقابل فریق کو دینی ہوتی ہے۔

جنگ بھی بڑی حد تک یک طرفہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے اپنے دعوے کے مطابق: ''افغانستان میں اِن ۱۰ ہفتوں میں اس کے صرف ۷ افراد ہلاک ہوئے ہیں''--- جو مرنے والے اخباری نامہ نگاروں کی تعداد سے بھی کم ہیں۔ اور ان سات میں سے بھی تین خود اپنے ہی گولوں کا نشانہ بنے' جس کے لیے friendly fire کی لطیف اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ ایسی ''ہاتھ کی صفائی'' روایتی جنگوں میں کہاں ممکن ہے! اس طرح امریکہ کو صرف فوجی اور سیاسی فتح ہی نصیب نہیں ہوئی' بلکہ فنی مہارت اور ٹکنالوجی کی بالادستی کا وہ مقام بھی حاصل ہوگیا جس نے اسے ایک بار پھر ناقابل تسخیر (invincible) ہونے کے زعم اور اعتماد سے نواز دیا۔

۳- **حلیفوں کا اختلافی پہلو:** امریکہ نے دوسروں کو ساتھ رکھنے کا محض تکلف کیا' جب کہ دراصل یہ سارا کھیل امریکہ اور صرف امریکہ کا مرہون منت تھا۔ اولین فیصلہ بھی امریکہ نے تن تنہا کیا اور ساری سیاسی اور عسکری مہم بھی عملاً اس طرح چلائی کہ سب کچھ اس کے اشارہ چشم و ابرو کا کرشمہ تھا۔ ایسے نازک لمحات بھی آئے جب خود برطانیہ کو بھی' جو ''شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار'' کا کردار ادا کر رہا تھا' بار بار جھینپ کر قدم پیچھے ہٹانے پڑے اور فوجوں کو میدان میں اترنے کی ہدایات دے کر واپس بلانا پڑا۔ یہی کیفیت جرمن شہر بون کے سیاسی مذاکرات کی میز پر بھی رہی' اور یہی رنگ ڈھنگ کارزار جنگ کا تھا۔ ایک امریکی سیاسی تبصرہ نگار چارلس کروتھامیر (Charles Krauthammer) نے جو واشنگٹن پوسٹ سے وابستہ ہے' امریکہ کے اس 'انا ولا غیری' والے کردار کی بڑے طمطراق سے عکاسی کی ہے۔ کروتھامیر کا مضمون: America Rules OK گارڈین میں بھی شائع ہوا ہے اور اپنی نظیر آپ ہے:

> یہ پورا تصور کہ افغانستان میں طالبان کے خلاف جنگ ''امریکی اتحادی'' لڑ رہے ہیں' مضحکہ خیز ہے۔ آخر مصر نے کیا دیا ہے؟ معروف عسکری تجزیہ نگار جے لینو (Jay Leno) کے مطابق: ''فرانس نے مزار شریف میں اپنی فوجیں لڑائی ختم

ہونے کے بعد بھیجیں"۔ (کیا ان کا مشن یہ تھا کہ طالبان کو ہتھیار ڈالنا سکھائیں!) اسلام آباد میں کسی جگہ اتحادیوں کا دفتر ہے۔ کیا کوئی اسلام آباد میں کسی جگہ اتحادیوں کا دفتر بتا سکتا ہے؟ کیا کوئی اتحادیوں کے ترجمان کا نام ہی بتا سکتا ہے' جو جنگ کے بارے میں اعلانات کرتا ہے؟

اتحادی افواج امریکی ہوائی جہاز' امریکی خصوصی افواج اور زمین پر موجود اس وقت کے افغان دوستوں سے زیادہ پر مشتمل نہیں۔ خلیجی جنگ کی طرح افغان جنگ بھی یک فریقی ہے جس پر کثیر فریقی کا لبادہ اوڑھا دیا گیا ہے۔ ہم نے صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی ہمارے ساتھ نہ آیا تو پھر بھی ہم آگے جائیں گے۔ حیرت ہے کہ پھر بھی دوسرے پیچھے آئے۔

صرف خود ہی لڑنے والے فریق کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا کہ دوسرے اس کے ساتھ جنگ میں شریک ہو جائیں۔ اس کو اعتراض تب ہوتا ہے جب کلنٹن کی طرح دوسروں کو ساتھ لے کر لڑنے والے کوسووا میں بم باری کے ہدف کے تعین میں ۱۸ ملکوں کو ویٹو پاور دے دیتے ہیں۔

افغان جنگ کسی کمیٹی کے زیر سرکردگی نہیں لڑی جا رہی۔ یک طرفہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم دوسروں کو' خواہ وہ کتنے ہی خیر خواہ کیوں نہ ہوں' یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ امریکہ اور آزاد دنیا کے سلامتی کے بنیادی مفادات کے حصول میں مزاحم ہوں۔ یہ بش کی خارجہ پالیسی کی اصل قوت محرکہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اتنی کامیاب رہی ہے۔[۴]

اس مضمون پر ڈیلی گارڈین میں ڈاکٹر ڈریو وہائٹ ورتھ (Drew Whitwurth) کا خط شائع ہوا ہے' جو امریکہ کے اس نئے ذہن اور نام نہاد لبرل

۴- دی گارڈین' ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

جمہوریت کے اصل عزائم کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود اس کے حلیف ملک کے دانش ور بھی امریکہ کے اس چہرے کو کس طرح دیکھ رہے ہیں: ''تنازعے کے دونوں طرف جنگ کا بڑھاوا دینے والوں کو خوش ہونے کے لیے حال ہی میں بہت کچھ ملا ہے۔ ویڈیو فلم میں ہم نے بن لادن کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے انہدام پر بے حد خوشی کا اظہار کرتے پایا اور اب اس طرح کی ایک خود کو مبارک باد چارلس کروتھامیر کی جانب سے گارڈین میں آئی ہے۔[5]

ڈاکٹر ڈریو وہائٹ ورتھ' آنے والے ۵۰ برسوں میں دنیا کی جو خاصی واضح تصویر دیکھ رہا ہے' ہمارے سامنے لاتا ہے: ''ایک ایسی دنیا جس میں کسی ملک کے شہریوں کو' سوائے امریکہ کے' جوہری حملوں یا ماحولیاتی نقصان سے تحفظ حاصل نہ ہو' ایک ایسی دنیا جہاں اگر نتائج امریکی مفادات کے خلاف ہوں تو جمہوریت کوئی معنی نہیں رکھتی' ایک ایسی دنیا جس میں ان مفادات سے اختلاف کا اظہار دہشت گردی کا ٹھپا لگا دے' اور نگرانی' ظلم و جبر اور ہلاکت کا جواز فراہم کرے''۔[6]

۴- جبری تائید کا ردعمل: اس ذہنی فضا کو پیدا کرنے میں امریکی ذرائع ابلاغ (میڈیا) نے بڑا کلیدی کردار ادا کیا ہے اور سیاسی قیادت اور میڈیا دونوں نے حب الوطنی کے جذبے کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ پہلے مرحلے میں شدید جذباتی فضا پورے ملک میں قائم کی گئی ہے۔ دستور' قانون' اخلاق' انصاف ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور سیاسی اختلاف کو ''غداری'' کا نام دیا گیا ہے۔ میڈیا نے افغان جنگ کے صرف وہ مناظر دکھائے' جن سے امریکی فتح کی نوید ملتی ہے۔ جو ظلم وہاں کے عوام پر ہوا ہے اور جس طرح ملک کو تباہ اور معصوم انسانوں کو ہلاک کیا گیا ہے' ان مناظر کو پالیسی کے طور پر بلیک آؤٹ کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ قلعہ جھنگی میں زیر حراست سیکڑوں

۵- ایضاً' ۱۸ دسمبر ۲۰۰۱ء   ۶- ایضاً

انسانوں پر بم باری اور ان کے قتل عام کی ایک جھلک بھی ٹی وی اسکرین پر نہیں آنے دی گئی ہے۔ امریکہ میں رائے عامہ کو سیاسی مصالح کا قیدی بنا کر نام نہاد سیکولر جمہوریت کے اس کرب ناک پہلو پر سے پردہ اٹھا دیا گیا۔ ملک کو جس جبری تائید (conformism) کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور جسے عوامی تائید کا نام دیا جا رہا ہے وہ دراصل ایک مصنوعی اور سوچے سمجھے انداز میں رائے عامہ کی تشکیل کا کارنامہ ہے۔ جسے چومسکی نے manufactured consent (وضع کردہ رضامندی) کا نام دیا ہے۔ اس پر خود امریکہ کے لوگ اب دل گرفتہ اور نوحہ کناں ہیں۔

دبے لفظوں میں تو لوگ شروع ہی سے شکایت کر رہے تھے' پھر آہستہ آہستہ اخبارات کے کالموں اور اداریوں میں ایک نئے میکارتھی ازم (Mc Carthism) کے خدشات کا اظہار شروع ہوا اور اب شہری آزادیوں کی تنظیمیں عوامی احتجاج پر مجبور ہو رہی ہیں۔ نیویارک ٹائمز میں فرینک رچ (Frank Rich) نے ایک دہلا دینے والا مضمون لکھا ہے "Yes, I am a Traitor"۔ جس میں امریکی اٹارنی جنرل جان ایش کرافٹ کو چیلنج کرتے ہوئے کہا ہے کہ قانون کے محافظوں کا اب وہی رویہ ہے جو کبھی سرپھرے بادشاہوں کا ہوا کرتا تھا۔ فرینک لکھتا ہے:

> جارج بش یا اس کی انتظامیہ میں کسی پر تنقید صرف سیاسی طور پر غلط نہیں ہے--- بلکہ اس وقت یہ غداری ہے۔ سینٹ کے سامنے بیان دیتے ہوئے جان ایش کرافٹ نے اعلان کیا کہ: "جو ہماری دانش کو چیلنج کرتے ہیں' وہ دہشت گردوں کے مددگار ہیں" اور "امریکہ کے دشمنوں کو اسلحہ فراہم کرتے ہیں"۔ بڑے سخت الفاظ ہیں! آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ جو شخص ہمیں القاعدہ کو تازیانے لگانے میں مدد دے رہا ہے' کس چیز سے خوف زدہ ہے۔ جو نمایاں "غدار" نظر آ رہے ہیں وہ تو شہری آزادیوں کے معمول کے محافظ ہیں یا ایک دو غیر معروف سینٹر جنھیں ان کے حلقہ انتخاب سے باہر کوئی نہیں جانتا۔ رائے عامہ کے جائزوں کے

مطابق عوام اٹارنی جنرل کے مکمل طرف دار ہیں اور وہ چند نام نہاد دانش ور جو اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں' انھیں ان کے صحافی دوست حقارت سے ہیجان زدہ قرار دیتے ہیں' جو شہری آزادیوں سے متعلق شور مچانے میں اتنے اُلجھ گئے ہیں کہ یہ بھول گئے ہیں کہ 'ایک جنگ جاری ہے'۔

میں اس کو غداری کہنے کی جرأت تو نہیں کروں گا' لیکن یہ ملک کے مفاد میں نہیں ہے' کہ جس وقت ایش کرافٹ' رچ تھامسن کی ٹیم داخلی محاذ پر اتنی ہی نااہل ثابت ہورہی ہے جتنی کہ بیرونی محاذ پر ڈک چینی' ڈونلڈ رمس فیلڈ' پاول' رائس کی ٹیم مستعد' ہم اس سے آنکھیں بند کرلیں۔ افغانستان جنگ کے بعد داخلی محاذ پر صومالیہ کی طرح جنگ کا اگلا تھیٹر بننے کا امکان رکھتا ہے۔ مسٹر ایش کرافٹ اور بش انتظامیہ کے دوسرے سست روؤں کو کھلا راستہ دینا حب الوطنی نہیں ہے--- یہ حقائق سے چشم پوشی ہے جس کی بسااوقات بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

اگر جنگ کے وقت اپنے رہنماؤں کی قابلیت کے بارے میں سوال اٹھانا غداری ہے' تو مجھے قریب ترین فوجی ٹریبونل کی طرف لے جایئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جو بات ہم نے ۱۱ستمبر کو منگل کی صبح سیکھی ہے' اس کے مطابق آیندہ یہ سوال اگلی صبح اٹھانے سے بہتر ہے کہ آج ہی اٹھالیا جائے۔[۷]

۵- اسی ہنگامے میں مقاصد کا حصول: امریکی قیادت نے ایک اور کامیابی بھی گھریلو محاذ پر حاصل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو قانون سازی معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی' خصوصیت سے دفاعی بجٹ کے سلسلے میں' وہ چشم زدن میں دونوں ایوانوں سے منظور کرالی گئی۔ بجٹ میں دفاع اور انٹیلی جنس کے لیے علی الترتیب اصل مطالبہ زر سے ۵۰ اور ۲۰ ملین ڈالر زیادہ حاصل کرلیے گئے۔ قومی دفاعی چھتری (شیلڈ) کا جو منصوبہ

۷- دی ایشین ایج' لندن' ۱۹ دسمبر ۲۰۰۱ء

ڈانواں ڈول تھا' وہ بھی منظور کرا لیا گیا ہے۔ اے بی ایم (اینٹی بیلاسٹک میزائل پروگرام) کے جس عالمی معاہدے سے نکلنے کے لیے امریکی حکومت پر تول رہی تھی' اس خواہش کو بھی عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ توانائی کے باب میں اس کی صنعت کے جو مطالبات تھے وہ بھی پورے ہو گئے ہیں اور ان کے بارے میں ساری مخالفت پادر ہوا ہو گئی ہے۔ تیل کی کمپنی Enron جس سے بش فیملی' ڈک چینی (نائب صدر) اور حکمران گروہ کے نصف درجن افراد وابستہ رہے ہیں' وہ ملک کو ۸۰ ارب ڈالر کا نقصان پہنچا کر دیوالیہ ہو گئی' لیکن کوئی شدید ردعمل نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ حب الوطنی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کی دھول میں گم ہو گیا ہے۔

صدر جارج بش اور امریکی انتظامیہ کی یہ وہ بڑی بڑی کامیابیاں ہیں جو اسامہ بن لادن' القاعدہ اور طالبان کے نام پر حاصل کی گئی ہیں۔ ان کی بنیاد پر ''تہذیب' آزادی' حقوق انسانی اور جمہوریت'' کی خاطر ایک نئے عالمی سامراج کے در و بست تعمیر ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات نے ان رکاوٹوں کو ہٹا دیا اور وہ سارے بند اس ریلے میں بہہ گئے جو امریکہ کے عالمی عزائم کے اظہار اور ان کے حصول کے لیے جارحانہ اقدام کی راہ میں حائل تھے۔

بہ ظاہر یہ جنگ دہشت گردی کے خلاف ہے لیکن دراصل یہ دہشت گردی کے خلاف واویلے کی آڑ میں ایک نئی سامراجی جنگ کا آغاز ہے جس کا پہلے ہدف مسلمان ممالک اور خصوصیت سے اسلامی احیا کی تحریکیں ہیں۔ بالآخر اس کا مقصد دنیا کے سارے ہی ممالک پر مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ کی بالادستی کا قیام' ان کے وسائل پر مکمل قبضہ' مغربی اور صہیونی استعمارانہ نظام سرمایہ داری کے خلاف سیاسی آزادی کی تحریکوں اور سیاسی اور اداراتی احتجاج کی جدوجہد کو لگام دینا اور انھیں امریکی پالیسی سازوں کے مسلط کردہ ''نئے عالمی نظام'' کے آگے سپر ڈالنے پر مجبور کرنا ہے۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ایک بڑے منصوبے کے سارے خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۲

امریکہ اور مغربی اقوام جو کچھ حاصل کر رہی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں وہ اپنی جگہ' لیکن ان چند مہینوں میں تیزی سے رونما ہونے والے واقعات اور ان کے تانے بانے سے عالمی سیاست اور نئے نظام کا جو نقشہ اُبھر رہا ہے' وہ اپنے دامن میں انسانیت کے لیے بڑے گمبھیر خطرات لیے ہوئے ہے۔

دنیا کو درپیش نئے خطرات

فتح کے شادیانوں کے جلو میں جو طوفان مغرب اور مشرق کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے' تہذیب و تمدن کے دفاع کے نام پر تہذیب و تمدن کو جن خطرات سے دوچار کیا جا رہا ہے اور امن و انصاف کے باب میں جو کچھ انسانیت نے بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا' اسے جس طرح معرض خطر میں ڈالا جا رہا ہے' اس کا ادراک وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس منظرنامے میں' مسلمان تو نشانہ خاص ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نئی یلغار کی زد میں پوری انسانیت ہے۔ آج امریکہ کے طاقت ور طبقات پوری دنیا کو' حتیٰ کہ خود اپنے اور یورپی ممالک کے عام انسانوں کو بڑے ہی پرفریب انداز میں ایک نئی غلامی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ان مہیب سایوں کا اس وقت ادراک نہ کیا گیا تو تاریکی پورے انسانی اُفق پر چھا سکتی ہے' ایک نئے تاریک دور (dark ages) کا آغاز ہو سکتا ہے اور مسلمان ہی نہیں' پوری دنیا کے امن و انصاف پسند انسان بڑے خسارے اور بڑی تباہی سے دوچار ہو سکتے ہیں۔

دہشت گردی کا مفہوم

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جس چیز کو ''دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ'' کا نام دیا جا رہا ہے' اور جس کا پہلے ہدف افغانستان بنایا گیا ہے اور القاعدہ کے ہاتھ نہ آنے والے کارکنوں کی تلاش میں جس طرح درجنوں ممالک کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں وہ ایک ایسا جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا۔ جس چیز کے خلاف امریکہ لڑ رہا ہے اس کی کوئی واضح اور متفق علیہ تعریف موجود نہیں۔[8] اقوام متحدہ بار بار کوشش کے باوجود کسی ایک تعریف پر متفق ہونے میں ناکام رہی ہے۔ چند ہفتے پیش تر ۱۱ ستمبر کے واقعات پر بحث کے دوران ایک بار پھر جنرل اسمبلی دہشت گردی کی کوئی متعین تعریف وضع کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ خود امریکہ کی ۲۰ سے زیادہ سرکاری دستاویزات کا تجزیہ کرنے والے محققین اور ماہرین قانون شکایت کناں ہیں کہ ان میں کہیں بھی اس کی متعین تعریف نہیں دی گئی۔ مختلف دستاویزوں میں مختلف اعمال اور سرگرمیوں کو دہشت گردی کہا گیا ہے۔[9]

اسی طرح نیلسن منڈیلا نے ۷ اکتوبر کو افغانستان پر امریکی فضائی حملے شروع ہونے پر اقوام متحدہ میں کہا ہے: ''میں ایک زمانے میں دہشت گرد تھا اور اس کے بعد سربراہ مملکت۔ کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں' کسی کو علم نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری آف پالیٹکس کے مطابق امریکی ڈالر پر شائع ہونے والی جارج واشنگٹن کی تصویر بھی آزادی کے سپاہی کی یا کسی دہشت گرد کی ہوتی ہے'' (ص ۴۹۳)۔ گویا ؎

لائے ہیں اس کی بزم سے یار خبر الگ الگ!

اس سلسلے میں آکسفورڈ کنسائز ڈکشنری آف پالیٹکس کا یہ اقتباس حرف معتبر کہا جا سکتا ہے:

۸- محمد اکرم ذکی: Terrorism: Myths & Reality انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۲۰۰۲ء

۹- ملاحظہ ہو روہنی ہینس مین (Rohini Hensman) کا مضمون Only Alternative To Global Terror (اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی' ۲ نومبر ۲۰۰۱ء' ص ۴۱۸۴۔)

دہشت گردی: حکومتوں یا اہل علم تجزیہ نگاروں کے درمیان اس کی کوئی متفق علیہ تعریف نہیں ہے۔ بالعموم جانی نقصان پہنچانے والی ان سرگرمیاں کو بیان کرنے کے لیے یہ بلااستثنا' بُرے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے جو خود ساختہ نیم سرکاری گروہ سیاسی مقاصد کی خاطر انجام دیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سرگرمیاں کسی مقبول عام مقصد کے حصول کے لیے کی جائیں' مثال کے طور پر وچی فرانس کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مارکویس کی کوشش' تو پھر لفظ ''دہشت گردی'' کے استعمال سے عام طور پر احتراز کیا جاتا ہے' اور اس کے بجائے کوئی زیادہ دوستانہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک شخص: کسی کے خیال میں دہشت گرد اور دوسرے فرد کے نزدیک آزادی کا سپاہی ہوتا ہے۔

بعض اوقات دہشت گردی' نیم سرکاری اداروں کے بجائے حکومتوں کے لیے بھی برے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ریاستی دہشت کی اصطلاح بعض اوقات گسٹاپو' کے جی بی اور مشرقی جرمنی کی اسٹیٹ سائی اور ان جیسے دوسرے اداروں کے بارے میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جنھیں سرکاری طور پر خود اپنے ہم وطن شہریوں میں سے اختلاف کرنے والے یا نسلی اقلیتوں کے خلاف کارروائیوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں اس پالیسی کے تحت بلاواسطہ انجام دی جانے والی پُرتشدد کارروائیاں یا ان میں بالواسطہ مدد کو بھی ریاستی دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں مختلف رجحان رکھنے والے ممالک انھی کاموں کے لیے دوسرے ملکوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے' اسی طرح کی سرگرمیوں میں خود ملوث رہے ہیں۔ مثال کے طور پر رونالڈ ریگن کے دورِ صدارت میں خود امریکہ نے مختلف حکومتوں' خاص طور پر لیبیا کو' موردِ الزام ٹھہرایا۔ جب کہ اس وقت نکاراگوا کے

خلاف نیم سرکاری تشدد کی کھلے عام پشت پناہی کی' حالانکہ نکاراگوا کی حکومت کے ساتھ اس کے مکمل سفارتی تعلقات قائم تھے۔ اس طرح کی کھلے عام عدم مطابقت سے شاید ہم کو زیادہ حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے' اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ:

امریکی ڈالروں کے نوٹوں پر سیاسی مقاصد کے لیے نیم سرکاری تشدد کرنے والی ایک مشہور و معروف شخصیت یا دہشت گرد یا آزادی کے سپاہی یعنی جارج واشنگٹن کی تصویر ہوتی ہے۔[10]

دراصل جو سوال پوری انسانیت کے لیے بڑا اہم ہے' وہ یہ کہ ایک ایسے معاملے میں جس کو متفق علیہ طور پر متعین نہیں کیا گیا' اور نہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے' ایسی صورت حال میں بھلا کسی ملک یا گروہ کو یہ اختیار کیسے مل جاتا ہے کہ وہ جس پر چاہے حملہ آور ہو جائے اور جس فرد' گروہ' تنظیم' حکومت حتیٰ کہ ملک کو تباہ کرنا چاہے' تباہ کر ڈالے۔ انسانیت کو اس سے زیادہ بڑا خطرہ اور کون سا ہو سکتا ہے!

کارروائی کا اختیار؟

دوسرا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر دہشت گردی کا ایک مفہوم متعین بھی کر لیا جائے تو یہ کون طے کرے گا کہ دہشت گردی کیا ہے؟ کس نے اس کا ارتکاب کیا ہے اور اس پر گرفت کس طرح کی جائے؟ اور معقول اور متناسب سزا کیا ہو سکتی ہے؟ مسئلہ ہر ملک کے اندر بھی ہو سکتا ہے اور عالمی سطح پر اور عالمی شراکت کے ساتھ بھی۔ ہر دو صورتوں میں کسے یہ اختیار ہے کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا اقدام کرے۔ ملک کے اندر یہ کام محض انتظامیہ کا نہیں بلکہ ملک کے قانون اور عدالتی نظام کا ہے' جس میں انتظامیہ اپنا

۱۰- مدیر' ایان میک لین' آکسفورڈ کنسائزڈ ڈکشنری آف پالیٹکس' آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس' ۱۹۹۶ء' ص ۴۹۲' ۴۹۳

کردار ادا کرے اور عدالت' جرم کی تحقیق اور سزا کا تعین کرے۔ دہشت گردی کا مقابلہ اگر دہشت گردی ہی کے ذریعے کیا جائے گا تو معاشرہ اور بالآخر دنیا جہنم بن جائے گی۔ اگر دہشت گردی کی عالمی پہنچ ہو تو یہ کام کسی بین الاقوامی عدالتی نظام ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

ہر کسی کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ جسے چاہے دہشت گرد قرار دے کر اس کی گردن مارنا شروع کر دے۔ یہ تو پوری دنیا کو تباہی میں جھونکنے کی راہ ہموار کرنے کے مترادف ہوگا۔ عملاً امریکہ نے ۱۱ ستمبر کے بعد یہی سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں امریکہ نے اندھا دھند افغانستان کا جو حشر کیا ہے کل وہی کسی دوسرے ملک کا بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ کی انتظامیہ کسی عدالتی کارروائی کے بغیر جس طرح تھوک کے بھاؤ سے افراد اور تنظیموں پر پابندیاں لگا رہی ہے اور دوسرے ممالک کو پابندیاں لگانے پر مجبور کر رہی ہے' وہ بھی عالمی دہشت گردی کی ہولناک مثال ہے۔

امریکی دانش ور نوم چومسکی (Noam Chomsky) نے نومبر میں اپنے دورہ بھارت و پاکستان میں بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ: ''اسامہ بن لادن دہشت گرد ہے مگر اس کی دہشت گردی ابھی شبہ ہی کے زمرے میں ہے اور معروضی تجزیے کے تحت ثابت نہیں ہوئی' مگر جو کچھ صدر بش نے کیا ہے وہ ثابت شدہ دہشت گردی اور بن لادن کی دہشت گردی سے بڑھ کر دہشت گردی ہے''۔ بھارت کا رپورٹر مرلی دھر ریڈی لکھتا ہے:

> جب نوم چومسکی نے زور دے کر کہا کہ امریکی صدر بش' اسامہ بن لادن سے زیادہ بڑے دہشت گرد ہیں' اس لیے کہ اسامہ کے خلاف امریکی صدر کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے' مگر دوسری جانب افغانستان میں بے گناہ لوگوں کا قتل عام امریکی صدر کے خلاف ثبوت ضرور ہے' تو ہال میں موجود لوگوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجائیں[۱۱]

۱۱- فرنٹ لائن' ۲۱ دسمبر ۲۰۰۱ء

حقیقت ہے کہ جس طرح امریکہ نے ''دہشت گردی'' کے لفظ کو اپنی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ایک حربے کے طور پر استعمال کیا ہے' وہ استعماریت کی تاریخ میں ایک سیاہ اور ہولناک باب کا اضافہ ہے۔

چومسکی نے بھارت میں فرنٹ لائن کے سیمی نار میں اس موضوع پر بڑی کھری کھری باتیں کیں:

> چومسکی نے دہشت گردی کے تصورات کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے: ایک لغوی' اور دوسرا پروپیگنڈے والا۔ دہشت گردی کا لغوی تصور جو امریکہ کے سرکاری دستاویزات میں بھی اختیار کیا گیا ہے' یہ ہے کہ ''دہشت گردی: تشدد' یا تشدد کی دھمکی کا نپا تلا استعمال ہے جو دباؤ ڈال کر اور جبر یا خوف پیدا کر کے سیاسی' مذہبی یا نظریاتی نوعیت کے اہداف حاصل کرنے کے لیے کیا جائے''۔ چومسکی نے تسلیم کیا کہ امریکہ کی استعماری پالیسی نے لغوی تعریف کو پروپیگنڈے والی تعریف کے حق میں دست بردار کر دیا ہے۔ اس کے مطابق' جو کوئی بھی امریکہ [کی سیاسی اور فوجی پالیسیوں] کے خلاف ہے' اس کے دوستوں یا حلیفوں کے خلاف ہے' دہشت گرد ہے۔[۱۲]

امریکہ کی اس جارحانہ پالیسی نے پوری دنیا کے امن کے لیے شدید خطرات کو جنم دیا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر اس سلسلے کو روکنے کی کوئی موثر کوشش نہ کی گئی تو دنیا ایک عالمی عدم استحکام (Global destabilization) کی دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔ عالمی امن اور انسانوں اور اقوام کے درمیان انصاف کے قیام کے لیے بیسویں صدی میں جو بھی کوششیں ہوئی ہیں' آج وہ معرض خطر میں ہیں۔ انسانیت ایک بار پھر بڑی تیزی سے ''جنگل کے قانون'' کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بلاشبہ' اس ترقی معکوس کی سراسر ذمہ داری

۱۲- فرنٹ لائن' ۷ دسمبر ۲۰۰۱ء' ص ۲۵' ۲۶

امریکہ اور اس کے جنگی اتحادیوں پر ہے۔ ظلم کے خلاف جدوجہد‘ آزادی کے لیے جنگ‘ ایمان اور سلامتی کی حفاظت کے لیے مزاحمت‘ بیرونی غاصبانہ قبضے کے خلاف لڑائی‘ انسانیت کے ان بنیادی حقوق میں سے ہیں‘ جو ظلم کے خلاف برسرپیکار ہونے کے لیے قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ دہشت گردی کے شبہ اور احتمال کی بنیاد پر دوسروں پر حملہ انسانیت کے خلاف جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس پس منظر میں اگر حقیقی دہشت گردی اور ظلم کے خلاف مزاحمت میں فرق نہ کیا گیا تو پھر جو ظالم اور جابر ایک بار کسی ملک یا قوم پر مسلط ہو گیا اس سے نجات کی کیا راہ باقی رہ جائے گی؟ امریکہ نے محض اپنے اسٹرے ٹیجک مفادات کے حصول کے لیے‘ جو کچھ افغانستان‘ طالبان اور اسامہ بن لادن کے خلاف اقدام کیا ہے‘ لاریب اس کا نہ قانونی جواز ہے اور نہ اخلاقی۔

روزنامہ گارڈین کی ایک مضمون نگار میڈیلین بنٹنگ‘ بنیادی نکتے پر بحث کے دوران اپنے مضمون A Fairy Tale at Christmas میں جس نتیجے پر پہنچتی ہے‘ وہ بہت اہم ہے:

> امریکہ انتقام لینا چاہ سکتا تھا‘ لیکن یہ ہرگز ایسی بات نہیں جس کے اخلاقی طور پر درست ہونے کا کوئی دعویٰ کر سکے۔ اب امریکیوں نے خارجہ پالیسی کے لیے ایسا راستہ کھول دیا ہے‘ جس کے مطابق دہشت گردی کا مقابلہ زیادہ بڑی دہشت گردی سے کرنا جائز قرار پایا ہے--- وہ جو شرق اوسط میں تباہی پھیلا رہا ہے‘ اور جو کشمیر میں غاصبانہ راستہ اختیار کیے ہوئے ہے‘ زیادہ تباہی لا سکتا ہے۔ امریکیوں کا یہ اقدام چین سے زمبابوے تک سنگ دلانہ جبر و تشدد کا اختیار دیتا ہے۔[۱۳]

۱۳- دی گارڈین‘ ۱۷ دسمبر ۲۰۰۱ء

جنگ اور ضابطہ

''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کی اصطلاح کا استعمال بھی ایک ناروا اقدام اور معروف قانونی اور سیاسی ضابطے کی خلاف ورزی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی قانون میں جنگ کا ایک واضح تصور ہے۔ استعارے کے طور پر غربت کے خلاف جنگ اور بیماری اور جہالت کے خلاف جنگ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے' مگر فوج کشی کے معنی میں جنگ کا استعمال نہ ان میں سے کسی کے بارے میں جائز ہے اور نہ دہشت گردی کے لیے۔

دہشت گردی بلاشبہ ایک جرم ہے اور اس کے خلاف اقدام قانون اور نظام انصاف (judicial process) کے مطابق ہی ہوسکتا ہے۔ اور خود امریکہ نے' خواہ وہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ۱۹۹۳ء کی دہشت گردی کا معاملہ ہو یا اوکلاہاما کا ۱۹۹۵ء کا واقعہ' جس میں ۱۶۰ افراد ہلاک اور ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہو گئے تھے' یا اس کے اپنے بحری جہاز ایس ایس کول پر حملہ جس میں ۱۷ فوجی ہلاک ہوئے' یا پان امریکن جہاز کا اغوا اور تباہی جس میں ۲۵۰ افراد مارے گئے ___ ان سب جرائم کا تعاقب قانون کے مطابق عدالتوں کے ذریعے کیا گیا۔ لیکن ۱۱ ستمبر کے الم ناک واقعات پر ایک من مانے انداز میں دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ایک آزاد اور خودمختار ملک کے خلاف جو اقوام متحدہ کا رکن ہے جنگی جارحیت کا ارتکاب کر دیا گیا اور اس کی حکومت کو بہ زور بدلنے کا کام پوری ڈھٹائی کے ساتھ کیا گیا۔ یہ بین الاقوامی قانون کو بدلنے یا re write کرنے کی ایک ایسی مذموم اور تباہ کن کوشش ہے جو مستقبل میں عالمی امن کو تہ و بالا کرنے کا باعث ہوگی۔

قانون شکنی کی مثال

بین الاقوامی قانون کی یہ خلاف ورزی صرف دہشت گردی کو جنگ کی بنیاد قرار

دے کر ہی نہیں کی جارہی بلکہ کم از کم آٹھ ایسے جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک انسانیت کے خلاف جرم کا درجہ رکھتا ہے:

۱- محض شبہ کی بنا پر' خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو' انصاف اور قانون کے عمل کو یکسر نظرانداز کر کے' محض اپنی طاقت کے بل پر افراد' اقوام اور ممالک کو سزا دینا اور ان کے خلاف فوج کشی کرنا۔

۲- باقاعدہ اعلان جنگ کے بغیر ایک ملک پر حملہ کرنا اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف تنازعات کے پرامن حل کے راستے کو ترک کر کے قوت کا استعمال کرنا۔

۳- افراد کے جرائم (اگر جرائم ثابت ہو جائیں تب بھی) کی سزا کسی ملک' اس کی حکومت اور اس کے عوام کو دینا۔ یہ اصول انصاف اور بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے۔

۴- ذاتی دفاع یا قومی دفاع (self defense) کے معروف تصور کے برعکس اپنے دفاع کے نئے تصور کے نام پر ہزاروں کلومیٹر دُور' ایک آزاد ملک پر حملہ کرنا اور اس طرح دوسرے ممالک کے لیے جارحیت اور جنگل کے قانون کا راستہ ہموار کرنا۔ امریکہ کے اس اقدام کا فوری اثر یہ ہوا کہ اسرائیل نے ''اپنے دفاع ہی کے نام پر'' فلسطین اتھارٹی اور غزہ اور غرب اُردن کے علاقوں پر ایف-۱۶' گن شپس اور ٹینکوں سے حملے شروع کر دیے اور برملا امریکہ کی مثال کو بطور جواز پیش کیا ہے۔ اس پر بھارت نے بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے جو روزانہ دس' پندرہ' بیس مسلمان نوجوانوں کو مقبوضہ کشمیر میں قتل کر رہا ہے۔ بھارتی وزیراعظم واجپائی اور وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی دونوں اس مقصد کے لیے امریکہ کی افغانستان کی کارروائی کا سہارا لے رہے ہیں۔

۵- قانون کی ایک معروف اصطلاح collateral damage (ضمنی نقصان) کی نئی تعریف کو وضع کیا گیا ہے' جس کے مطابق جس کے ذریعے ہزاروں انسانوں کی

ہلاکت اور پورے پورے ملک کی تباہی کو بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ایک قابل قبول ثمر قرار دیا جا رہا ہے۔

۶- امریکہ نہ صرف خود دہشت گردی کا مرتکب ہو رہا ہے بلکہ دہشت گردی کی ایک اور شکل intimidation and threat of violence یعنی خوف زدہ کرنے اور تشدد کی دھمکی کے ذریعے دوسرے ملکوں کو اپنی صف میں شامل کر رہا ہے۔ یہ فلسفہ کہ: "یا ہمارے ساتھ ہو ورنہ ہمارے مخالف" ___ یا "دہشت گردی کی جنگ میں ہمارے حلیف بنو ورنہ تم خود دہشت گرد قرار دے دیے جاؤ گے" ___ یہ وہ شیطانی فلسفہ ہے جس نے جرمن قوم پرست لیڈر ہٹلر (م: ۱۹۴۵) کے فلسفہ جارحیت کو بھی مات کر دیا ہے۔ اس "جدید فلسفے" کا نشانہ پاکستان جیسے ملک ہی نہیں بنے یورپی ممالک کو بھی اسی طرح بل ڈوز (bulldoze) کر دیا گیا ہے۔ ہالینڈ کے وزیر خارجہ کے بارے میں اخباری اطلاع ہے کہ جب امریکی وزیر خارجہ جنرل پاول نے ان سے دھونس کے اسی اصول کے مطابق تعاون مانگا تو انھوں نے باادب کہا: "Yes General!"

۷- جرم و سزا اور جنگ کے باب میں انصاف کے اصولوں میں مرکزی اہمیت کے حامل نکات: ضرورت (necessity) اور اس کا جواز (legitimacy) تو ہیں ہی' لیکن توازن اور تناسب بھی اس کا ایک اہم تقاضا ہیں۔ افغانستان پر مسلط کردہ امریکی "جنگ" میں ان میں سے ہر ایک کو پامال کیا گیا ہے۔

۸- افغانستان میں جو جنگی اسلحہ (weaponry) استعمال کیا گیا' کارپٹ بم باری اور ڈیزی کٹر بم کا استعمال' زیر حراست قیدیوں پر بم باری' ہتھیار ڈالنے پر جان کی امان دینے سے انکار' عام شہری ٹھکانوں' مساجد' ہسپتال اور ریڈکراس کے دفاتر پر بم باری' اور بین الاقوامی قانون کی دھجیاں بکھیرنا (brutalization) یہ سب اقدام کھلے جنگی جرائم (war crimes) کے زمرے میں آتے ہیں۔

لیکن محض طاقت کے گھمنڈ میں نہ صرف ان گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے، بلکہ انھیں جرم بھی شمار نہیں کیا جا رہا۔ یہ بین الاقوامی قانون کو بالکل ہی بدل ڈالنے کی بدترین مثال ہے۔

پسند کے ظالم

امریکہ جس راستے پر چل پڑا ہے نظر آ رہا ہے کہ افغانستان صرف پہلا قدم ہے۔ عراق، صومالیہ، یمن، شمالی کوریا، سوڈان کا تو کھلا کھلا ذکر کیا گیا ہے اور پر تولے جا رہے ہیں کہ اگلا نشانہ کون ہو۔ پھر سعودی عرب، شام، ایران اور پاکستان کی باتیں بھی دبی زبان سے ہو رہی ہیں۔ ایک طرف تو امریکہ انھیں اپنا طرف دار قرار دے رہا ہے لیکن درپردہ ان سب کے بارے میں بڑی خطرناک منصوبہ بندی ہو رہی ہے، جس کی کچھ جھلکیاں سامنے آ رہی ہیں۔

سعودی عرب کے خلاف ایک منظم پروپیگنڈا مہم جاری ہے۔ ابھی واضح نہیں کہ اس کا مقصد وہاں کے نظام کی تبدیلی ہے یا صرف بلیک میل کرنا، جیسا کہ ایران میں ۷۰ کے عشرے میں ایران کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اسی طرح شام اور ایران بھی زد میں ہیں۔ پاکستان کو ''دلیر ساتھی'' قرار دے کر اور اس کی فوجی حکومت ''جمہوریت دوست'' شمار کی جا رہی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے ایٹمی پروگرام، نظام، تنظیمات اور تنصیبات پر قبضے، نگرانی، اثر اندازی کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ فوج اور عوام میں اسلامی رجحانات کو لگام دینے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ فلپائن اور انڈونیشیا کا بھی ذکر ہے اور ۴۰ سے ۶۰ ممالک کو القاعدہ کے سلسلے میں ملوث کیا جا رہا ہے۔ بات صرف القاعدہ کی نہیں، ہر وہ ملک جس سے امریکہ کے مفاد کو کسی شکل میں بھی خطرہ ہو اسے دہشت گردی کے نام پر مطیع بنانے کی کوشش ہے۔

بات صرف دہشت گردی کی نہیں، اب تو صاف کہا جا رہا ہے کہ: ''دہشت گردی کو

پیدا کرنے والی سب سے اہم قوت نام نہاد مذہبی انتہا پسندی اور مذہبی تعلیم کا نظام ہے اور جب تک ان کو ختم نہیں کیا جائے گا دہشت گردی ختم نہیں ہو سکتی"۔ بڑی ہوشیاری اور شاطرانہ انداز سے اسلام' اسلامی احیا کی تحریکوں' اسلامی فلاحی اداروں اور دینی تعلیمی نظام کو ہدف بنایا جا رہا ہے اور زہریلا پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ: "اسلام میں 'اصلاح مذہب' (reformation) کی ضرورت ہے'[14] مذہب اور سیاست کی تفریق وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور ترقی کا اہم ترین ذریعہ ہے' سیکولرازم اور مغربی لبرلزم کے فروغ کے بغیر دہشت گردی سے نجات ممکن نہیں"۔

یہ سارا کام ایک وسیع تر عالم گیریت اور جدیدیت کا حصہ ہے اور پوری دنیا کی نجات اس راستے کو اختیار کرنے میں ہے ورنہ اسے اس پر مسلط کیا جائے گا اور یہ سب امریکہ کے اپنے دفاع (self defense) ہی کا ایک حصہ ہے۔

۳

نیوز ویک' ٹائم' اٹلانٹک جیسے معروف رسائل اور تمام اہم روزنامے تک ایسے مضامین' ادارتی تبصروں اور خطوط سے بھرے ہوئے ہیں جن میں جہادی کلچر' سیاسی اسلام (political Islam) اور اسلامی بنیاد پرستی (Islamic fundamentalism) پر کاری ضرب لگانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

نئے استعمار کا ایجنڈا

یہ نئے استعمار کا ایجنڈا ہے جس کے چار بڑے بڑے میدان ہیں:

۱۴- جیسی اصلاح اسلام' انیسویں صدی میں برطانوی استعمار نے مرزا غلام احمد قادیانی کے ذریعے قادیانیت کے پردے میں کی تھی۔ مرتب

۱- سیاسی اعتبار سے امریکہ کی بالادستی اور اس امر کا اہتمام کہ یہ بالادستی اکیسویں صدی میں قائم رہے اور اس کے لیے کوئی حریف اُبھرنے نہ پائے۔

۲- امریکہ کی فوجی برتری اور اس کو نہ صرف ناقابل تسخیر رکھنا بلکہ ساری دنیا میں اس کی موجودگی یا اس کے قائم مقام عناصر (surrogates) کی حفاظت جو اس کے آلہ کار کے طور پر کام کر سکیں اور دنیا کا نقشہ ان خطوط پر قائم رکھ سکیں جو امریکہ کو مطلوب ہے۔ نیز اس بات کی ضمانت کہ کسی شکل میں بھی ایسی عسکری صلاحیت دوسرے ملکوں میں پیدا نہ ہو جو امریکہ اور اس کے حواریوں خصوصیت سے اسرائیل کے لیے چیلنج بن سکے۔

۳- دنیا کے معاشی وسائل پر امریکہ' اس کے اتحادیوں اور اس کے زیر اثر ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور مغرب کے استعماری مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم کار این جی اوز کا قبضہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک فیصلہ کن ہدف تیل اور گیس کے تمام اہم ذرائع اور ترسیل کے راستوں پر قبضہ ہے۔

۴- تہذیبی میدان میں مغربی کلچر اور ثقافت کا عالم گیر غلبہ اور دین و مذہب خصوصیت سے اسلام کی بنیاد پر اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کے امکانات کو معدوم کرنا۔

نئے سامراج کا یہ ایجنڈا کسی پردے کے بغیر اب سرعام پیش کیا جا رہا ہے اور اس پر عمل کرانے کے لیے پروپیگنڈے سے لے کر عسکری قوت تک ہر حربہ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی ہے۔

امریکی سامراج کے یہ عزائم تو پہلے بھی ظاہر تھے' مگر دہشت گردی کے خلاف حالیہ جنگ نے ان عزائم کو نئی زندگی اور ان پر عمل کو نئے امکانات فراہم کر دیے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں: کیا دہشت گردی کا آغاز ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء سے ہوا؟ اور کیا افغانستان اور القاعدہ کی تباہی سے دہشت گردی روئے زمین سے فنا ہو جائے گی؟ جسے بنیاد پرستی کہا جا رہا ہے کیا اس کا وجود صرف مسلم دنیا میں ہے یا خود امریکہ میں بنیاد پرستوں کی ایک نہیں

درجنوں تحریکیں سرگرم کار ہیں؟ کیا خود جارج بش کی صدارت کے پیچھے امریکی بنیاد پرستوں کا کوئی کردار نہیں؟ کیا اسرائیل کی لیکود پارٹی اور وزیراعظم شیرون' صہیونی بنیاد پرستی کے بدترین مظاہر نہیں؟ کیا بھارت کی بھارتیہ جنتا پارٹی' راشٹریہ سوامی سیوک سنگھ' بجرنگ دل' اور وشوا ہندو پریشد' ہندو بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے سوا کچھ اور ہیں؟ کون سا ملک ہے جہاں انتہا پرستی موجود نہیں اور کون سا دور ہے جو انتہا پرستی سے پاک رہا ہے۔

پھر ''دہشت گردی'' کے خلاف تو بہت کچھ بخار نکالا جا رہا ہے' مگر اس کی کوئی فکر نہیں کہ وہ حقیقی اسباب کیا ہیں' جن کے نتیجے میں: امریکہ اور مغربی اقوام کے خلاف نفرت کے طوفان امنڈ رہے ہیں' سرمایہ داری کے خلاف لاوا پک رہا ہے' مظلوم انسانوں کی ایک تعداد مایوس ہو کر اپنی جان تک پر کھیلنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

ہدف بنائی جانے والی ''دہشت گردی'' ایک معمول کی کارروائی نہیں' ایک غیر معمولی رویے کی مظہر ہے۔ یک رخے پن سے اس کو نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے' جب تک ان اسباب کا کھوج نہ لگایا جائے جن کے بطن سے یہ جنم لیتی ہے۔ ان کے تدارک کے بغیر اس سے نجات ممکن نہیں۔ فلسطین ہو یا کشمیر' چیچنیا ہو یا فلپائن' اسپین ہو یا کیوبک (کینیڈا)' آئرلینڈ ہو یا تھائی لینڈ' سوڈان ہو یا صومالیہ' کیوبا ہو یا نکاراگوا' فیجی ہو یا ہیٹی' اراکان (میانمار) ہو یا کوسووا' جہاں بھی ظلم ہوگا' اس کا ردعمل بھی رونما ہوگا۔ جو جائز کے ساتھ ناجائز اور پرامن کے ساتھ خونی اور تشدد کے راستے بھی اختیار کر لیتا ہے۔

جس طرح غربت خودکشی کی طرف لے جاتی ہے' اسی طرح مظلومیت اور محرومی تشدد اور دہشت گردی کے روپ بھی دھار لیتی ہے۔ جرم کا خاتمہ محض قانون اور جبر سے نہیں ہو سکتا۔ جب جرم کے اسباب ختم ہوں گے تو اسی وقت جرم میں بھی کمی آئے گی اور حقیقی امن و آشتی کے امکانات روشن ہوں گے۔ بدقسمتی سے سامراجی ذہن اس سامنے کی حقیقت کو سمجھنے' اور سامراج کی آنکھ اس کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں' بلکہ محض جبر اور طاقت

سے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے زعم میں مبتلا ہے۔ خدا کی زمین پر ظلم کی فراوانی اور انسانوں کے درمیان کش مکش اور شورش کی بڑی وجہ یہی ذہنیت اور یہی سیاست ہے۔ آج امریکہ اس ذہنیت اور سیاست کا سب سے بڑا علم بردار اور عالمی اقتدار کا ٹھیکے دار بن گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ اسی سامراجی ایجنڈے کا حصہ ہے۔

بڑا ہدف: اسلامی تحریکات

امریکی سامراج اور مغربی تہذیب کا ہدف تو پوری دنیا ہے' لیکن فوری طور پر پہلا اور بڑا ہدف اسلامی دنیا اور اسلامی احیا کی تحریکات اور ادارے ہیں' اور ان پر ہی اس وقت اصل توجہ مرکوز ہے۔ نیوز ویک کا ڈاؤس خصوصی ایڈیشن (دسمبر ۲۰۰۱ء-فروری ۲۰۰۲ء جو ''۲۰۰۲ء کے مسائل'' کے بارے میں ہے) اس عالمی ایجنڈے کا خلاصہ پیش کر رہا ہے۔

اس شمارے میں خصوصیت سے سیموئیل ہن ٹنگٹن' فرید زکریا اور فرانسس فوکویاما کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم صرف دو مختصر اقتباسات پیش کرتے ہیں:

سیموئیل ہن ٹنگٹن کا فتویٰ ہے:

> معاصر عالمی سیاست مسلم جنگوں کا دور ہے۔ مسلمان آپس میں لڑتے ہیں اور غیر مسلموں سے بھی' دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ لڑتے ہیں۔ مسلم جنگوں نے بین الاقوامی تنازعات کے سب سے بڑے مظہر کی حیثیت سے سرد جنگ کی جگہ لے لی ہے۔ ان جنگوں میں دہشت گردی کی جنگیں' گوریلا جنگیں خانہ جنگیاں اور بین الاقوامی تنازعات شامل ہیں۔ مسلم تشدد کی یہ مثالیں اسلام اور مغرب کے درمیان یا اسلام اور باقی دنیا کے درمیان تہذیبوں کے ایک بڑے تصادم کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ ناگزیر نہیں ہے اور زیادہ امکان یہ ہے کہ تشدد' جس میں مسلمان شامل ہیں' منتشر' متنوع اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے

بعد ہوتا رہے۔[15]

داد دیجیے کہ سارا الزام مسلمانوں پر ہے، جیسے وہ سب سے طاقت ور قوت ہوں اور سارے عالم میں تباہی مچائے ہوئے ہوں۔ ظلم کا نشانہ بھی مسلمان، دنیا میں سب سے زیادہ بے گھر اور مہاجر بھی مسلمان، سب سے زیادہ جانی نقصان بھی مسلمانوں کا ہو رہا ہے اور گردن زدنی بھی مسلمان ۔

وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب اُلٹا

اب ذرا فرانسس فاکویاما کی گل افشانی بھی دیکھ لیجیے۔ موصوف کے مضمون کا عنوان ہے: حقیقی دشمن (The Real Enemy)

انقلابی اسلامسٹ جو کسی طرح کے اختلاف کو برداشت کرنے کے روادار نہیں ہیں، ہمارے دور کے فاشسٹ ہو گئے ہیں۔ دراصل ہم ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔[16]

اس مضمون میں فاکویاما کا مرکزی پیغام یہ ہے:

پس اس طرح یہ محض دہشت گردوں کے خلاف ایک سادہ "جنگ" نہیں ہے جس کا امریکی حکومت قابل فہم انداز میں نقشہ کھینچتی ہے، اور نہ جیسا کہ بہت سے مسلمانوں کا موقف ہے کہ فلسطین میں یا عراق کے ساتھ امریکہ کی خارجہ پالیسی اصل مسئلہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں جو بنیادی تنازع درپیش ہے وہ بہت وسیع تر ہے اور دہشت گردوں کے ایک گروپ سے متعلق نہیں ہے، بلکہ انقلابی اسلامسٹوں کے بڑے گروہ سے مقابلے کا چیلنج درپیش ہے، اور ان مسلمانوں سے متعلق ہے جن کی مذہبی شناخت دوسری تمام اور سیاسی اقدار کو مسترد کر دیتی ہے۔[17]

۱۵- نیوز ویک، ڈاؤس ایڈیشن، دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۶- نیوز ویک، ایضاً، ۵۸

۱۷- ایضاً

ہم امریکی دانش ورفو کویاما کے ممنون ہیں کہ انھوں نے دل میں چھپی بات کھول کر سامنے رکھ دی اور ڈپلومیسی کے پردوں کو چاک کر کے مغرب کے عزائم اور ان کی نگاہ میں تنازع کے اصل سبب یعنی دین اور سیاست کے رشتے کو صاف لفظوں میں یوں بیان کر دیا: اگر مغرب کی دوستی چاہتے ہو تو دین کے اثر سے سیاست اور تہذیب وتمدن کو پاک کر لو ورنہ ہماری تمھاری کھلی جنگ ہے۔

فیصلہ کن سوال

جنگ کا نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟

ایک راستہ تو بڑا آسان اور سادہ ہے' جس کی دعوت مغرب کے دانش ور اور سیاسی قائدین دے رہے ہیں۔ اسی کی آہنگ بازگشت خود مسلم دنیا میں جدیدیت کے دلدادہ افراد کی تحریروں اور ارشادات سے چھلکی پڑتی ہے ۔

چلو تم ادھر کو' ہوا ہو جدھر کی

یہ وہ راستہ ہے جو زمانے کے پرستاروں نے ہر دور میں سجھایا ہے اور آسایش اور تن آسانی کے متوالوں نے آزادی' غیرت اور ایمان سب کی قربانی دے کر جسے اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن کیا اہل ایمان اور مسلم امت کے لیے بھی نجات کی یہی راہ ہے؟ نہیں' علامہ اقبال' اس کا جواب دیتے ہیں!

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

اسلام تو نام ہی اس دین کا ہے جو طاغوت سے بغاوت اور اللہ کی بندگی سے عبارت ہے: فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ ؕ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ق (البقرہ ۲:۲۵۶) یہ راستہ تو ہے ہی کفر' شرک اور طغیان سے کش مکش کا راستہ۔ اس میں طاقت اور تعداد اصل چیز نہیں' کہ دونوں حصول مقصد کا ذریعہ ہیں اور مطلوب بھی'

مگر اصل ہدف وہ نصب العین اور وہ مقصودِ حیات ہے جو ایمان کا تقاضا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس دعوت کا علم بلند کیا تو اُن کے کتنے ساتھی تھے اور انھیں کتنی قوت حاصل تھی؟ مگر نصب العین واضح اور منزل کے بارے میں یکسوئی تھی اور ساری مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں ایک ہی جواب تھا کہ: اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور ایک پر چاند بھی رکھ دیا جائے تو اس راستے کو نہیں چھوڑوں گا' جدوجہد جاری رہے گی' تاآنکہ یہ دین غالب آجائے یا میری جان اس جدوجہد میں کام آجائے۔۔۔ اکثریت اور اقلیت' طاقت اور کمزوری تبدیل ہونے والی چیزیں ہیں اور بالآخر تبدیل ہوتی ہیں۔ کل کی اقلیت آج کی اکثریت بن سکتی ہے اور آج کی اکثریت کل اقلیت میں بدل سکتی ہے۔ یہی معاملہ طاقت اور کمزوری کا ہے۔

مسلمانوں کے لیے اصل فیصلہ طلب سوال یہی ہے کہ آیا انھیں مسلمان رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تشکیل و تعمیر کرنی ہے یا اسلام سے بے نیاز ہو کر دنیا طلبی کا راستہ اختیار کرنا ہے؟ اگر مطلوب اسلام ہے تو پھر اپنے ایمان' اپنے نظریے' اپنے دین' اپنی تہذیب اور اپنی سیاست پر قائم رہنے اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ بلاشبہ اس جدوجہد میں ایمان اور نظریے کی قوت اور اتحاد کے ساتھ' علم' تحقیق' معاشی قوت' عسکری طاقت' ایجاد و اختراع اور ٹکنالوجی پر مہارت اور گرفت سب ضروری ہیں۔ لیکن سب سے اہم چیز وژن (vision) اور عزم ہے۔ اگر وژن موجود نہیں اور عزم و ارادے کا فقدان ہے تو پھر اُبھرنے اور ترقی کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن اگر یہ موجود ہیں تو پھر توفیق الٰہی سے تمام وسائل بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور زمانے کا نقشہ اسی طرح بدلا جا سکتا ہے جس طرح ماضی میں بدلا گیا۔ کوئی طاقت ورا تنا مضبوط نہیں کہ ہمیشہ مضبوط رہے اور کوئی سوپر پاور ایسی نہیں جو ہمیشہ سوپر پاور رہی ہو۔

تاریخ' ایک نہیں درجنوں سوپر پاورز کا قبرستان ہے۔ خود ہماری زندگیوں میں برطانیہ اور اشتراکی روس دو سوپر پاورز کس بلندی سے کس پستی تک پہنچی ہیں۔ آج امریکہ کی

طاقت کا اعتراف ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ اب ہمیشہ وہی غالب و حکمران رہے گا' تاریخ کے ساتھ مذاق اور انسانیت کے امکانات سے مایوسی ہے۔ اس لیے پہلا قدم اپنی منزل کا تعین اور اپنے مقاصد کی تفہیم ہے۔ پھر ان کے حصول کے لیے تیاری اور منصوبہ بندی ہے۔ جدوجہد کتنی ہی طویل ہو اور راہ کیسی ہی دشوار گزار' لیکن ہمیں سوچ سمجھ کر اپنی راہ طے کرنی ہے اور آستان یار سے وفاداری کے سوا کوئی راستہ ہمارے شایان شان نہیں ؂

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

جب ایک قوم خدا پر بھروسے کے ساتھ' دانش مندی سے اپنی منزل حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی ہے تو پھر نئے امکانات اُبھرتے ہیں اور حالات تبدیل ہوتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر کمزوری کے بعد طاقت کا اُبھار واقع ہوا ہے' بشرطیکہ ہمارا وژن واضح اور ہماری ہمتیں بلند رہیں۔ راستہ ایک ہی ہے اور وہ جدوجہد کا راستہ ہے ؂

زمانہ با تو نہ سازد' تو با زمانہ ستیز

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے' کہ پھر کیا ہمیں مخالف قوتوں سے تصادم اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟

بلاشبہ کش مکش تو اس راستے کے لازمی مراحل میں سے ہے' مگر دین نے جہاں ہمیں مستقبل کا ایک واضح وژن دیا ہے' وہیں یہ بھی سکھایا ہے کہ جدوجہد کے مختلف مراحل ہوتے ہیں اور تیاری کے بغیر معرکے میں کودنا عقل مندی اور حکمت نہیں' حماقت ہے۔ صبر اور حکمت' یہ دونوں مومن کی میراث ہیں۔ ہماری جدوجہد' طویل اور وقت طلب ہے۔

بلاشبہ ہمارا ہر لمحہ اصل منزل کی طرف پیش قدمی کی تیاری اور تحرک میں صرف ہونا چاہیے' شارٹ کٹ کی تلاش اور جلدبازی کے اقدام دینی فراست کے خلاف ہیں۔ مقابلے

کے لیے صحیح حکمت عملی کا تعین اور جدوجہد کے لیے مکمل تیاری بھی اسی طرح ایمان کا حصہ اور دین کا تقاضا ہیں، جس طرح طاغوت کے آگے سپر ڈال دینے، دوسری تہذیبوں کی غلامی قبول کرنے اور شیطان کی دکھائی ہوئی راہ سے برأت لازم ہے۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ جذباتیت سے مکمل احتراز کیا جائے۔ صبر، حکمت اور محنت سے، علم، اجتہاد اور جہاد کے راستے کو اس طرح اختیار کیا جائے جو ان کا حق ہے۔

۴

ان بنیادی امور کے تجزیے کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ اس اصولی موقف کو بھی بالکل واضح الفاظ میں بیان کیا جائے جس کو اختیار کر کے آج پاکستان اور اُمت مسلمہ وقت کے چیلنج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

امریکہ اور مغربی اقوام آج خواہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہوں، ان کی موجودہ بالادستی اور وسائل پر غلبے اور دسترس کے اعتراف کے ساتھ، اس عزم کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ: مسلمان اپنا جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور ان کی منزل اپنی آزادی اور اپنی تہذیب کی ترقی اور فروغ ہے جو دوسروں کی غلامی یا بالادستی کے تحت جائے پناہ پر قناعت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر امریکہ کا ایک سوپر پاور ہونا ایک حقیقت ہے تو مسلم امت کے ایک ارب ۳۰ کروڑ نفوس بھی ایک حقیقت ہیں جنھیں نہ نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور نہ محض طاقت سے غلام بنایا جاسکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تصادم سے پہلو بچاتے ہوئے اپنے گھر کی اصلاح، دینی و دُنیوی علم میں پختگی، اپنے اتحاد کا حصول، اپنے وسائل کی ترقی اور اپنی قوت کا استحکام ہمارا اصل ہدف ہوں۔ اس کے لیے اپنے ایمان، اپنے دین اور اپنے نظریے پر مضبوطی سے قائم رہنا، وقت کے چیلنج کو سمجھنا اور اپنی بنیادوں کو استوار کر کے اس کا مقابلہ کرنے کی تیاری ہماری فکروسعی کا محور ہونا چاہیے۔

اصولی موقف کے پانچ نکات

اس کام کو انجام دینے کے لیے ہمیں کچھ عالم گیر اصولوں کو اپنی دعوت اور حکمت عملی کی بنیاد بنانا چاہیے اور دنیا کے تمام انسانوں اور تمام عوام کو ان کی طرف لانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ نہ ہمیں دوسروں کا کاسہ لیس ہونا چاہیے‘ اور نہ ہر ایک سے الگ تھلگ اور مقاطعے کا راستہ اختیار کرنا صحیح عمل ہو سکتا ہے۔ قدر مشترک کی تلاش اور اس پر تعلقات استوار کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ دنیا کے حالات بھی اس مقام پر ہیں کہ کچھ اصولوں اور مشترک اقدار پر سب کو لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسی میں تمام انسانوں کا بھلا ہے۔ بجائے اس کے کہ مسلمان محض دوسروں کے اقدامات پر ردعمل تک اپنے کو محدود رکھیں‘ ہمیں آگے بڑھ کر پوری انسانیت (بشمول مغربی اقوام) کو کچھ بنیادوں پر متفق کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اصول ہماری عالمی دعوت کا محور بن سکتے ہیں:

۱- تمام اقوام کی آزادی‘ حاکمیت اور سلامتی کا تحفظ۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد‘ تمام انسانوں کی برابری‘ تمام اقوام کی آزادی‘ اور ان کا حق خود ارادیت ہے۔ اسلام نے اسی اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کیا تھا اور یہ اصول استعماریت اور امپریلزم کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

۲- کسی ایک ملک یا تہذیب کی بالادستی پر اُستوار تکثیری نظام (pluralism) ہی عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ سب اس اصول کو تسلیم کریں کہ ہر قوم کو اپنی تہذیب و ثقافت کی پاس داری کا حق ہے اور دنیا کی یک رنگی‘ فطرت کے خلاف اور انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہے۔ اس لیے سب کو اپنے اپنے اصول و اقدار کی روشنی میں ترقی کے مواقع حاصل ہونے چاہییں۔

۳- تمام انسانی معاملات کو دلیل اور مکالمے (dialogue) کے ذریعے حل کیا جائے اور قوت کے استعمال کو قانون اور عالمی انصاف کا تابع کیا جائے۔ ہر قسم کے تشدد کے خلاف عالمی رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور اس میں دہشت گردی کی ہر شکل

میں مخالفت شامل ہو۔ نیز دہشت گردی اور آزادی کے حصول یا ملک وملت کی حفاظت کے لیے جدوجہد کو اس سے ممتاز وممیز کیا جائے اور قوت کے استعمال کی حدود اور اس کا ضابطہ کار متعین کیا جائے۔

۴- انصاف کے حصول کے لیے دنیا کے تمام انسانوں اور اقوام کو ایک منصفانہ عالمی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ انصاف وہ مثبت بنیاد ہے جس پر عالمی امن قائم ہوسکتا ہے اور ظلم کی دراندازیوں سے انسانوں کو بچایا جاسکتا ہے۔

۵- بین الاقوامی تعاون اور اشتراک کے ساتھ ساتھ قوموں یا ملکوں کے الحاق کی اجتماعی خود انحصاری کے اصول کا احترام۔ اس سے عالم گیریت کا ایک ایسا نظام وجود میں آسکتا ہے جس کے تحت اگر ایک طرف انسانوں' مال تجارت' مالی اور دوسرے وسائل کی نقل وحرکت میں سہولت ہو تو دوسری طرف ایسے عالمی ادارے وجود میں آئیں' جو دولت اور قوت کی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے کمزوروں کو طاقتوروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھ سکیں۔ بالآخر دنیا میں قوت اور دولت کی منصفانہ تقسیم وجود میں آسکے جس کے نتیجے میں سب کو خوش حالی' استحکام اور باعزت زندگی حاصل ہوسکے۔

یہ وہ پانچ بنیادیں ہیں جن کی طرف دنیا کے تمام انسانوں کو دعوت دے کر پاکستان اور اُمت مسلمہ ایک ایسے عالمی نظام کی داغ بیل ڈال سکتی ہے' جو حقیقی امن و انصاف کا ضامن ہوسکے۔

آج کے طاقت ور اس کی راہ میں حائل ہوں گے' لیکن دنیا کے تمام دوسرے ممالک کو منظم اور متحرک کر کے اور پرامن ذرائع سے عالمی رائے عامہ کو منظم کر کے اس قدرِ مشترک کو نئے نظام کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ نیز یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب دنیا کے ممالک دوسروں پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنے اوپر بھروسا کر کے اپنے وسائل کو صحیح صحیح استعمال کرنے اور منظم کرنے کی جدوجہد کریں اور تعاون اور اشتراک کی منصفانہ شکلوں

کو رواج دیں۔ جس طرح دنیا کے بہت سے ممالک میں' بشمول آج کے ترقی یافتہ مغربی ممالک' اندرون ملک دولت کی تقسیم اور قوت کے توازن کو حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے اور اس میں ایک درجہ کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے' اسی طرح عالمی سطح پر بھی ایک متوازن اور منصفانہ نظام کا قیام ممکن ہے' بشرطیکہ اس کے لیے صحیح طریقے پر مسلسل جدوجہد ہو۔

مسلم ملّت کے لیے خطوط کار

اس ایجنڈے کو عالمی سطح پر محض پیش کرنا مطلوب نہیں۔ اس ایجنڈے پر دنیا کو لانا اسی وقت ممکن ہوگا جب مسلمان ممالک خود اپنے گھر کو درست کریں اور اس کا آغاز خود احتسابی سے کریں۔

۱۱ستمبر کے بعد جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ جو افراد یا ملک یہ سمجھتے تھے کہ: امریکہ سے دوستی کے ذریعے ان کو حفاظت' عزت اور سلامتی مل جائے گی اور جو اپنی دولت اپنے ملکوں میں رکھنے کے بجائے امریکہ اور یورپ میں اسے محفوظ سمجھ رہے تھے اس ایک ہی ہلّے میں ان کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ انھوں نے کیسا کمزور سہارا تھاما تھا اور کس طرح خود کو دوسروں کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا۔ موسم کی ایک ہی تبدیلی نے ان کو بتا دیا کہ۔

جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

نیز اس سے یہ سبق بھی حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے' کہ مانگے کا اُجالا کبھی روشنی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ خود انحصاری اور اپنی قوت کی تعمیر کے بغیر آپ اپنی آزادی' اپنے ایمان اور اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ مقصد کسی سے لڑنا نہیں لیکن اپنے گھر کی تعمیر اور اپنے ممالک کی مضبوطی اور دوسروں پر محتاجی سے نجات' قومی سلامتی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم ممالک میں خود اپنے عوام پر اعتماد کی فضا پیدا کی جائے۔ شخصی اور سیاسی آزادیاں حاصل ہوں' اختلاف کو برداشت کیا جائے' اور معیشت اور سیاست پر چند خاندانوں کی اجارہ داری کو ختم کیا جائے۔ کیونکہ اسی میں اصحاب اقتدار کے لیے بھی خیر ہے اور مسلم عوام کے لیے بھی۔

کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے جہاں نظریہ اور قومی تشخص ضروری ہے وہیں سیاسی' معاشی اور اداراتی نظام کا ایسا آہنگ درکار ہے جس میں سب کی شرکت ہو' عوام اور حکمرانوں کے درمیان کش مکش کے بجائے تعاون اور اشتراک کا رشتہ قائم ہو۔ اسی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: تمھارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہیں اور بدترین حکمران وہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور جو تم سے نفرت کرتے ہیں۔

پھر اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ: آزادی اور اشتراک کے ساتھ تعلیم' زندگی کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی' روزگار کے مواقع اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو ملکی پالیسی میں مرکزیت کا مقام حاصل ہو' وقت کی ٹکنالوجی کو حاصل کیا جائے اور ایجاد و اختراع اور تحقیق و تفتیش کے ذریعے علم اور سائنس پر قدرت حاصل کی جائے۔ نیز معیشت اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں بھی خود انحصاری کی پالیسی اختیار کی جائے۔ خود انحصاری کا مطلب نہ خود کفالت ہے اور نہ دنیا سے الگ تھلگ ہونا۔ اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمیں وسائل پر اتنی دسترس حاصل ہو کہ ہم اپنی پالیسیاں' اپنے مقاصد اور اہداف کے مطابق خود طے کرسکیں اور دوسروں کی ایسی محتاجی نہ ہو کہ وہ ہماری پالیسی پر اثرانداز ہوسکیں۔ دنیا کے تمام ممالک سے تعاون اور تجارت سب کے لیے اسی وقت بہتری کا باعث ہو سکتے ہیں' جب خود انحصاری کے ساتھ یہ تعاون ہو۔ ورنہ یہی بین الاقوامی رشتے اور معاملات ظلم اور استحصال کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

مسلمان ممالک کی تعمیر و ترقی میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ یہ اُمت' اُمتِ وسط

ہے جس کا کام دنیا کے سامنے خدا کے پیغام کی شہادت دینا ہے اور جو انصاف کے فروغ اور نیکیوں کی ترویج اور برائیوں سے نجات کی داعی ہے۔ اس اُمت میں اگر انتہا پسندی اور تشدد کی سیاست در آئی ہے تو یہ اس کے مشن اور مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اور اس کے اصل کردار پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی' اسلام: تشدد' زور زبردستی اور اکــراہ کا مخالف ہے اور محبت' بھائی چارے' رواداری اور تعاون و اشتراک کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

جہاد کا مقصد انصاف کا قیام اور تمام انسانوں کے لیے آزادی' عزت اور عدل کی ضمانت ہے جہاد اپنی تمام صورتوں میں --- یعنی نفس کے ساتھ جہاد' زبان اور قلم سے جہاد' مال سے جہاد اور جان سے جہاد --- واضح اخلاقی حدود اور مقاصد کا پابند ہے۔ ہر سطح پر اس کے تصور' تعلیم اور تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ جہاد کا صحیح فہم و ادراک ہو اور اس کی نعمتوں سے مسلمان اور غیر مسلم سب فیض یاب ہوسکیں۔ جہاد کے اس تصور کا فہم اور احترام ہر دور میں ضروری تھا مگر آج جب جہاد کو بدنام کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور جہادی کلچر کو تشدد اور دہشت گردی کے مترادف قرار دیا جا رہا ہے' اس میں جہاد کی تفہیم اور جہاد کے آداب کے مکمل احترام کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ جہاد اسلام کی ابدی تعلیم اور اس کا رکن رکین ہے جس کے بارے میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ جہاد ایک اخلاقی قوت اور تعمیر کی صورت ہے اور اس کا یہ کردار سب سے پہلے خود مسلمانوں کے سامنے ہونا چاہیے تاکہ غیر مسلم بھی اس کی گواہی دے سکیں۔

عصر حاضر میں تحریک اسلامی کی خدمات میں سے ایک نمایاں خدمت یہ ہے کہ ایک طرف اس نے جہاد اور روحِ جہاد کے احیا کا کارنامہ انجام دیا ہے تو دوسری طرف جہاد کے مقاصد' آداب اور ضابطہ کار کی وضاحت اور احترام کر کے اس کے اصل کردار پر توجہ مرکوز کی ہے اور مسلمانوں کو اس کا پابند بنانے کی کوشش کی ہے۔

مسلم ممالک کے درمیان معاشی' سیاسی' تعلیمی' ٹکنالوجی اور میڈیا کے میدانوں میں

قریب ترین تعاون بلکہ اتحاد اور الحاق کی ضرورت ہے جو نظریے اور تاریخ کے اشتراک کے ساتھ مفادات کے اشتراک اور سیاسی اور معاشی حوالوں سے باہمی تعاون اور احترام کی محکم بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ یہ اب سب کی ایسی ضرورت ہے جسے موخر نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظام میں تنازعات کے تصفیے کا بھی مناسب انتظام ہونا چاہیے' تاکہ حقیقت پسندی سے اتحاد کو مستحکم کیا جا سکے۔ عالمی سطح پر مسلم نقطہ نظر کو پیش کرنے کے لیے میڈیا کی موثر ترقی و تنظیم بھی ضروری ہے۔

اسلام کے عالمی کردار کی موثر ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب تمام مسلمان ملک اور امت مسلمہ ان خطوط پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرے۔ امت وسط کی حیثیت سے اللہ کی بندگی اور انسانوں کے لیے انصاف اور فلاح کے نظام کی داعی کی حیثیت سے اپنے گھر کی تعمیر کرے اور دنیا کے سامنے اس کا نمونہ پیش کرے۔

پاکستان کی ذمہ داری: دس پہلو

وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان اور اہل پاکستان پر بھی ایک بڑی ذمہ داری آتی ہے۔ ۱۱ستمبر کے بعد جو کچھ ہوا' وہ خواہ مجبوری کے تحت ہوا یا عاقبت نااندیشی کے تحت --- ہم اس پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

افغانستان میں جو کچھ کیا جانا تھا وہ ہو گیا' بھارت اس سے جو فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہے وہ واضح ہوتا جا رہا ہے اور جنگ کے مہیب سائے اُفق پر اُمنڈتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے اندرونی معاملات میں بیرونی در اندازیاں مشکلات میں اضافے اور آزادی اور خود مختاری کے لیے خطرات کا باعث ہیں۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ تصادم' عدم مشاورت اور وقت گزاری کی پالیسی ترک کر کے ایک ایسی پالیسی کو اپنایا جائے جس میں پاکستان' اس کے نظریے اور قوم کی سلامتی' اور ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل امور فوری توجہ کے طالب ہیں:

۱- اللہ سے وفاداری اور اس پر بھروسے کو سب چیزوں پر اولیت دی جائے۔ اللہ کی طرف رجوع ہو اور اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اپنے مالک کے حضور اعتراف کر کے اس سے طاقت اور رہنمائی طلب کی جائے۔ پوری قوم اور اس کی قیادت اپنے خالق و مالک کا دامن رحمت تھامے اور اس سے مدد مانگے۔

۲- عوام پر بھروسا کیا جائے' ان کو اعتماد میں لیا جائے اور موثر طور پر ان کو قومی سلامتی' ترقی اور تعمیرنو کے لیے متحرک کیا جائے۔

۳- اس نظریاتی کش مکش سے بچا جائے اور جس لاحاصل بحث میں مغربی میڈیا اور دانش ور ہمیں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں' اس سے دامن بچایا جائے۔ بنیاد پرستی' انتہا پرستی اور فرقہ پرستی ہمارے مسائل نہیں۔ جدید اور قدیم کی بحثیں بہت پرانی ہیں اور ہم ان سے گزر چکے ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات بہت صاف اور واضح ہیں۔ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے جو بنیادی اخلاقی اقدار کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ سیکولرزم ایک مردہ گھوڑا ہے' اس پر سواری کے خواب دیکھنا ایک حماقت ہے۔ پاکستان کے دستور نے جن تین بنیادوں کو واضح طور پر پیش کر دیا ہے یعنی: اسلام' جمہوریت اور وفاقی طرز حکومت انھیں متفق علیہ بنیاد بنا کر قومی پالیسی کی تشکیل کی جائے اور ان طے شدہ امور کو ازسرنو بحث میں لانے کی جسارت نہ کی جائے۔ اسلام اعتدال کا دین ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس پر عمل کی ہے۔ ہمارا ایجنڈا ہماری تحریک آزادی اور ہماری قرارداد مقاصد' ہمارے دستور میں طے ہے۔ اسے مضبوطی سے تھام لیجیے۔

۴- ملک کی دفاعی قوت کی حفاظت کو اولیت حاصل ہے۔ امریکی فوجوں کی موجودگی اس کے لیے ایک خطرہ ہے۔ اسی طرح بھارت کے عزائم کا ادراک اور مقابلے کے لیے فوج اور قوم میں ہم آہنگی اور دونوں کا متحرک وفعال ہونا ضروری ہے۔

۵- جموں وکشمیر کے حق خودارادیت کی پالیسی کے بارے میں مکمل یکسوئی اور مضبوطی کی ضرورت ہے۔

۶- افغان پالیسی کی جلد از جلد تشکیل نو مطلوب ہے۔ افغانستان میں ایک ایسی حکومت کے قیام میں ہماری دل چسپی ہونی چاہیے' جسے افغان بھائی خود طے کریں اور جس سے افغانستان کا اتحاد باقی رہے اور وہ ایک ہمسایہ اور بھائی ملک کی حیثیت سے ترقی کرے۔ دفاعی مفادات کے چکر سے بلند ہو کر افغان پالیسی کی تشکیل کی ضرورت ہے' تاکہ ماضی کی غلطیوں کی تلافی ہو سکے۔ افغان عوام کے دل پاکستانی عوام کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور قیادتوں نے جو بھی غلطیاں اور ناانصافیاں کی ہیں ان سے متاثر ہو کر کسی قسم کی کش مکش یا جانب داری کا راستہ ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ' ہماری پالیسی کی بنیاد وہ رشتہ اشتراک ہونا چاہیے جو دین' تاریخ اور مشترک مفادات کی وجہ سے قائم ہے اور جس نے دلوں میں محبت اور معاملات میں تعاون کی روایت قائم کی ہے۔

۷- ملک میں فی الفور جمہوری عمل کا احیا' دستور کو ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق تبدیل کرنے سے مکمل احتراز اور دستور کے مطابق جمہوری نظام کی بحالی کے لیے بلاتاخیر اجتماعی مشاورت' آزاد الیکشن کمیشن کے قیام اور اس سلسلے کے تمام ضروری انتظامات پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

۸- معیشت کی بحالی کے لیے: قومی مشاورت' تجارت' زراعت' صنعت اور محنت سے متعلق طبقات کے تعاون سے قومی خود انحصاری کے حصول اور معاشی ترقی اور سرگرمی کی بحالی کے لیے فوری اقدامات کی طرف توجہ دینا۔

۹- مسلم ممالک سے تعلقات بڑھانے اور مشترک خطرات کے مقابلے کے لیے مشترک حکمت عملی کی تشکیل کی کوشش۔

۱۰- ایران اور چین سے خصوصی تعاون اور ان کے ساتھ مشترک حکمت عملی وضع کرنے

اور اس پر عمل کا نظام بنانے کی کوشش۔

یہ دس نکات فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم حالات اور خطرات کا صحیح ادراک کریں۔ اپنے نظریے اور قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے خدا پر بھروسے اور ایک دلی جذبے کے ساتھ اصلاح احوال کی جدوجہد شروع کر دیں۔ اگر ہم ۱۱ستمبر سے اب تک کے رونما ہونے والے واقعات کو ایک خطرے کی گھنٹی سمجھیں‘ اب بھی بیدار ہو جائیں اور اٹھ کھڑے ہوں تو آگے کے مراحل زیادہ مشکل نہیں۔ واللہ المستعان![☆]

☆ ترجمان القرآن‘ جنوری ۲۰۰۲ء

امریکہ میں دعوت اسلامی

امکانات' اہداف اور مشکلات

آج اگر ایک طرف وہ ۵۶ آزاد مسلمان ملک ہیں' جن میں تقریباً ۹۲ کروڑ مسلمان بستے ہیں اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی خطوط پر تشکیل نو کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف ۸۵ غیر مسلم ممالک میں مسلمان آبادیاں ہیں' جن کی مجموعی آبادی ۴۰ کروڑ سے زیادہ ہے۔ وہ اس ملک میں خواہ اقلیت میں ہیں' لیکن اس کے باوجود وہ بھی اپنے اپنے طور پر اسلامی زندگی کی تشکیل و تعمیر کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں--- اس مضمون میں امریکہ کے حالات پر گفتگو' دراصل اُمت مسلمہ کے ایک بڑے حصے کے حالات اور مسائل کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں تلاش کرنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

امریکہ' تاریخی اور عالمی تناظر میں

امریکہ کی خصوصی اہمیت کئی وجوہ سے ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ ایک علاقائی طاقت تھا اور اس کی دل چسپی کا

اصل دائرہ براعظم امریکہ یعنی شمال میں کینیڈا، وسطی اور جنوبی امریکہ کے ممالک اور جزائر تک محدود تھا۔ اس فکر کا عکاس وہ نظریہ تھا، جسے **نظریہ منرو** (Monroe Doctrine) کہتے ہیں۔[1] اس نظریے کا مطلب یہ تھا کہ: ''شمالی، جنوبی اور وسطی امریکہ پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA) کو بالادستی حاصل ہے، یہاں کوئی دراندازی نہ کرے اور دُنیا کے باقی علاقوں سے امریکہ کو چنداں دل چسپی نہیں'' —— تاہم، ۱۸۹۸ء میں امریکہ اور اسپین کے درمیان جنگ (Spanish - American War) اس حصار کو توڑنے اور امریکہ کے عالمی کردار کا آغاز کرنے کا باعث ہوئی۔ جزیرہ ہوائی (Hawai) امریکہ کا حصہ بن گیا اور فلپائن آزاد ہوکر بھی دامِ اسیری میں گرفتار رہا۔ البتہ اس کے بعد یورپ اور پھر ایشیا آہستہ آہستہ امریکہ کی جولاں گاہ بن گئے۔

پہلی عالمی جنگ [۱۹۱۴-۱۸ء] کا فیصلہ امریکہ کے ساڑھے تین لاکھ فوجیوں کی جنگ میں عملی شرکت سے ہوا، اور یورپ کی سیاست پر امریکہ کی قوت کے بادل چھا گئے۔ پھر دوسری جنگ [۱۹۳۹-۴۵ء] میں پرل ہاربر پر جاپانی حملے نے امریکہ کو جنگ میں عملاً شریک بنا دیا۔ اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے [۱۹۴۵ء] کا انسانیت کش ''کارنامہ'' انجام دیا۔ اس طرح دوسری جنگ کے اختتام تک دُنیا کا سیاسی نقشہ تبدیل ہوگیا۔ یورپی اقوام جو پچھلے پانچ سو سال تک یورپ اور باقی دُنیا پر حکمران تھیں، جو علاقائی اور عالمی قوتوں کا رول ادا کر رہی تھیں، منقارِ زیرِ پر ہوگئیں۔ چین اور جاپان جو ایشیائی قوتوں کی حیثیت سے اُبھر رہی تھیں، محکوم اور مغلوب ہوگئیں۔ دو نئی عالمی طاقتیں دُنیا پر چھا گئیں، یعنی امریکہ اور اشتراکی روس۔ پچاس سالہ سرد جنگ کے بعد اور جہاد افغانستان کی آخری ضرب کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۹۱ء میں اشتراکی روس کی

۱- جیمز منرو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پانچویں صدر (۱۸۱۷-۲۵ء) تھے، انھوں نے مذکورہ نظریہ پیش کیا تھا۔

سلطنت منتشر ہو گئی۔ مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا اس کے چنگل سے آزاد ہو گئے اور امریکہ دُنیا کی واحد سوپر پاور بن کر سامنے آیا۔

معاشی اور سیاسی کردار

امریکہ کے عالمی رول کا اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس میں دو چیزیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں:

- ایک سیاسی اور معاشی غلبہ و استیلا' جو تمام ہی سامراجی قوتوں کا خاصہ رہا ہے۔
- دوسرے ایک نظریے اور پیغام کی علم برداری' جس میں تمام سامراجی طاقتوں کا کردار ایک سا نہیں رہا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے جمہوریت کی ترویج' قوموں کے حق خود ارادیت کی تائید اور ایسے عالمی اداروں کے قیام کی آواز اٹھائی جو عالمی امن کی ضامن ہوں اور بین الاقوامی قانون کے احترام کا ذریعہ بن سکیں۔

امریکہ کے ۲۸ ویں صدر ووڈرو ولسن [۲۱-۱۹۱۳ء] کے چودہ نکات اور لیگ آف نیشنز کا تصور اسی امریکی پیغام کے عکاس تھے۔ لیکن بہت جلد خود امریکہ میں ووڈرو ولسن کی تائید کمزور پڑ گئی' لیگ آف نیشنز کا سب سے بڑا علم بردار اور موید ہونے کے باوجود امریکہ اس کا ممبر نہ بنا۔ مشرقی یورپ میں جمہوریت نہیں بلکہ آمریت کی فتح کے دور کا آغاز ہوا' اور کمیونزم اور فاشزم کی شکل میں بدترین آمرانہ نظام وجود میں آئے۔

امریکہ ایک بہت بڑی معاشی قوت تھا۔ پہلی جنگ کے بعد دُنیا کی کل پیداواری دولت (GDP) کا ۳۳ فی صد صرف امریکہ میں تھا' جبکہ امریکہ کی آبادی کبھی بھی' دُنیا کی آبادی کے ۶ فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ امریکہ کے سیاسی اثرات کی بنیاد اس کی معاشی قوت لیکن بڑی جنگوں کے درمیان بڑے شان دار آغاز کے باوجود امریکہ کا سیاسی کردار

محدود رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد صورت حال مختلف تھی۔ یورپ کی تمام روایتی طاقتیں پژمردہ اور مضمحل تھیں۔ امریکہ نے دونوں جنگوں میں فیصلہ کن شرکت تو ضرور کی' مگر خود میدان جنگ کبھی نہیں بنا۔ اس لیے اس تباہی سے محفوظ رہا جو جنگ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ قصہ مختصر' یورپ اور ایشیا میدان جنگ تھے اور تباہ حال۔ اشتراکی روس بھی فتح کے باوجود زخم خوردہ تھا' مگر امریکہ بہت زیادہ تازہ دم رہا۔ اس لیے دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کا عالمی کردار برابر بڑھتا گیا۔ اس دور میں بھی اس نے ایک نظریاتی پوزیشن اختیار کی۔ جس میں امریکہ اور روس کی سرد جنگ' نظریاتی سطح پر سرمایہ دارانہ جمہوریت اور اشتراکی آمریت کی جنگ بن گئی۔

معاشی گرفت' استعماری عزائم

سرمایہ داری' منڈی کی معیشت کی بالادستی (superiority) ' انسانی حقوق' آزادی اور جمہوری اداروں کی خوبیاں جیسے موضوع زیر بحث رہے۔ اس طرح سیاسی بالادستی کی لڑائی کا ایک نظریاتی آہنگ بھی رہا۔ افغانستان میں روس کی شکست' منتشر اور غیر موثر ہو جانے کے بعد' امریکہ کے اہل علم اور حکمت عملی ساز اداروں نے دُنیا کو یہی نعرہ دیا کہ: ''اب لبرل ڈیموکریسی کو آخری بالادستی حاصل ہو گئی ہے۔ مارکیٹوں کی معیشت ہر مسئلے کا حل ہے اور امریکہ کو دُنیا کے دوسرے نظاموں پر نظریاتی فتح حاصل ہوئی ہے۔ امریکہ کی حکومت نے جارج بش ہی کی صدارت میں اپنے ''نئے عالمی نظام'' (New World Order) کو شہ تاج کی حیثیت دے ڈالی' اور بیسویں اور اکیسویں صدی کو امریکہ کی صدی قرار دینے کا نعرہ بلند کیا۔

مارٹی میرزوکرمین (Mortimir Zuckerman) چیف ایڈیٹر یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ اور دی نیویارک ڈیلی نیوز کے ناشر اور چیئرمین ہیں' وہ مشہور رسالہ فارن افیرز میں A Second American Century کے عنوان سے رقم

طراز ہیں اور ہمیں اس نتیجے پر پہنچانا چاہتے ہیں:

ساتویں صدی فرانس کی تھی' انیسویں برطانیہ کی' اور بیسویں امریکہ کی اور اب ۲۱ویں صدی بھی امریکہ کی ہوگی۔[۲]

اس وقت دُنیا کی کل پیداوار میں امریکہ کا حصہ ۲۵ فی صد ہے جو اگلے ۱۲ سال (۲۰۱۰ء) میں ایک اندازے کے مطابق' کم ہوکر ۲۰ فی صد رہ جائے گا۔ لیکن پھر بھی کل دُنیا کی پیداوار کے پانچویں حصے پر قابض ہونے کے باعث' امریکہ توقع رکھتا ہے کہ اگلی صدی میں بھی اس کی سب سے بڑی معاشی قوت کی حیثیت برقرار رہے گی۔

معیشت کے ساتھ ساتھ ثقافت اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی وہ دُنیا پر چھایا ہوا ہے۔ لباس میں جینز' کھانوں میں میکڈونلڈ' پیزاہٹ (pizzahut)' مشروبات میں کوکا کولا اور پیپسی اور فلمی دُنیا میں ہالی ووڈ اور والٹ ڈزنی اسی عالمی غلبے کی علامتیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایٹمی اور خلائی استعداد پر اجارہ داری' حقوق کے باب میں چودھراہٹ اور ایک تازہ امریکی قانون کے تحت مذہبی تفریق کے الزام پر دُنیا کے دوسرے ممالک پر معاشی پابندیاں لگانے کا اختیار اس کے مقام کو وسعت دیتا ہے۔ اسی طرح منشیات اور تشدد یا دہشت گردی کے نام پر دُنیا کے دوسرے ممالک پر امریکی قوانین زبردستی نافذ کرنے کا زعم اور منصوبہ ـــــ یہ سب چیزیں پوری دُنیا پر ایک عالمی طاقت کی بالادستی کو بدستور قائم رکھنے کے منصوبوں کا حصہ ہیں۔

بلاشبہ امریکہ کے حکمرانوں کا ہدف' امریکہ کو واحد اور ناقابل چیلنج عالمی قوت کے طور پر برقرار رکھنا ہے۔ امریکہ کے قومی سلامتی کے سابق مشیر اور جان ہاپکن یونی ورسٹی کے پروفیسر زبگینو بریزنسکی نے اپنی کتاب میں اسے بڑے کھلے لفظوں میں بیان کیا ہے:

مختصر یہ کہ امریکہ کی پالیسی کا ہدف کسی معذرت کے بغیر دو طرفہ ہونا چاہیے'

۲- فارن افیرز مئی - جون ۱۹۹۸ء' ص ۳۱

اول: امریکہ کی غالب حیثیت کو کم سے کم ایک نسل اور ترجیحاً اس سے بھی زیادہ کے لیے برقرار رکھنا۔ دوم: ایک ایسی جغرافیائی سیاسی صورت حال پیدا کرنا جو سیاسی و اجتماعی تبدیلیوں کے دھچکوں اور تناؤ کو جذب کرے اور ساتھ ہی دُنیا کے پُرامن انتظام کے لیے مشترکہ ذمہ داری کی جغرافیائی سیاسی بنیاد بن جائے۔[۳]

اس سلسلے میں پروفیسر بریزنسکی' عسکری اور معاشی قوت کے ساتھ مخصوص نظریاتی اہداف کی حامل این جی اوز اور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے عالمی جال اور ہالی ووڈ کلچر کی عالمی یلغار کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ یورپ اور ایشیا سے کوئی مقابلے کی قوت نہ اُبھرنے پائے' یعنی:

> یہ لازمی ہے کہ یورپ اور ایشیا سے اب کوئی چیلنج سامنے نہ آئے جو یورپ اور ایشیا پر غلبہ حاصل کرنے' اور اس طرح امریکہ کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔[۴]

تب ہی اس ہدف کا حصول ممکن ہو سکے گا جسے اس ساری تگ و دو کا حاصل اور اس کتاب میں ٹیپ کا بند کہا جا سکتا ہے:

> اس لحاظ سے مکمل کامیابی' واحد اور اول و آخر حقیقی عالمی قوت ہونے کی حیثیت سے امریکہ کے کردار کا قرار واقعی اظہار ہوگا۔[۵]

یہ تو ہیں امریکی قیادت کے عزائم!

لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت دُنیا کو جو چیلنج درپیش ہیں' کیا فی الحقیقت اس حکمت عملی سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

گذشتہ بارہ برسوں میں ''منڈی کی معیشت'' کی ایسی کمزوریاں ایک بار پھر کھل کر

۳- بریزنسکی The Grand Chessboard ۱۹۹۷' ص ۲۱۵

۴- بریزنسکی' ایضاً' ص xiv

۵- بریزنسکی' ایضاً' ص ۲۱۵

سامنے آ گئی ہیں' جو سوچنے سمجھنے والے دماغوں کو مضطرب کیے ہوئے ہیں۔ وہ کسی ایسے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں' جو منڈی کی معیشت کے مثبت پہلوؤں کی حفاظت کرتے ہوئے اس کے نتیجے میں رونما ہونے والے مسائل یعنی بڑھتی ہوئی معاشی ناہمواریوں' علاقائی اور عالمی امیروں کا امیر تر اور غریبوں کا غریب تر ہوتے چلے جانے اور مالیاتی عدم استحکام کے تدارک کی راہیں سجھا سکے۔

معاشی تزلزل

دُنیا کے مالیاتی نظام' عدم استقرار (unstability) کا شکار ہیں۔ یہ عمل دُنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی معیشت کو تہ و بالا کر رہا ہے۔ میکسیکو چار برس پہلے' فرانس اور برطانیہ میں دو برس پہلے اور جاپان' کوریا' انڈونیشیا' فلپائن' تھائی لینڈ' ملائیشیا ایک برس سے اس تجربے سے گزر رہے ہیں۔ ان معیشتوں کو سنبھالا دینے کے لیے آئی ایم ایف کا حل غیر موثر ہو گیا ہے۔ قرضوں کا بار بڑھ رہا ہے۔ خود امریکہ ۵ ہزار بلین ڈالر سے زیادہ کا مقروض ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کا قرضہ ۲ ہزار ۲ سو بلین ڈالر سے بڑھ گیا ہے۔ وہ ہر سال صرف سود کی شکل میں ۲۶۰ بلین ڈالر ادا کر رہے ہیں' جو ان کو ملنے والی معاشی امداد اور سرمایہ کاری سے کہیں زیادہ ہیں۔ ترقی یافتہ دُنیا کی معیشت بلبلے کی شکل اختیار کر گئی ہے' جو اچانک کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔

آج صرف مبادلہ خارجہ کی سندات (derivatives) کی یومیہ تجارت ایک ہزار بلین ڈالر سے زیادہ ہے' جو اصل اشیا کی یومیہ عالمی تجارت سے ۳۰ گنا بڑھ کر ہے۔ اس طرح محض کاغذی اثاثے (assets) اور سٹے کی تجارت (speculation) کے ذریعے دُنیا کے مالیاتی نظام پر چند بنک اور سرمایہ کار چھا گئے ہیں اور وہ جسے چاہیں چشم زدن دیوالیہ بنا سکتے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مشہور سٹہ باز جارج سورس (George Soros) بھی پکار اُٹھا ہے:

بین الاقوامی مالیاتی نظام منظم توڑ پھوڑ کا شکار ہے۔ صورت حال کو سنبھالنے کے لیے آئی ایم ایف کے پروگرام نتیجہ خیز نہیں ہوئے۔[6]

دوسرے الفاظ میں آج سرمایہ داری اور معاشی لبرلزم نئے عالمی پیغام کا عنوان بننے کی اہلیت کھو چکے ہیں۔

امریکہ کے اندرونی محاذ پر بھی غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اگرچہ کساد بازاری کے بعد اب معیشت روبہ ترقی ہے' لیکن یہ لہر ابھی وقتی اور غیر مستحکم ہے اور جاپان اور مشرقی ایشیا کے حالات نے اسے متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ بجٹ کا خسارہ ختم ہو رہا ہے' مگر قرضوں پر سود کی شکل میں سالانہ ۲۸۰ بلین ڈالر کا بوجھ ہے۔ حکومت اور عام شہری قرض کے جال میں حسب سابق پھنسا ہوا ہے۔ یہ قرضے اب قومی دولت کا ۹۱ فی صد ہو گئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر سماجی اور معاشرتی انتشار ہے۔

آبادی کی ترکیب (composition) مسلسل بدل رہی ہے۔ افریقی نسل کے امریکی کل آبادی کا ۱۲ فی صد ہیں' ۶ فی صد ایشیائی ہیں' میکسیکو اور لاطینی امریکہ سے اتنے لوگ آ گئے ہیں کہ بستیوں کی بستیاں ہسپانوی زبان اور کلچر کا گہوارا بن گئی ہیں۔ ملک کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ کھل کر ایک کثیر لسانی' کثیر نسلی' کثیر مذہبی اور کثیر ثقافتی ملک کی حیثیت سے سوچے اور ترقی کرے۔ ساری قانونی اور اداراتی اصلاحات کے باوجود نسلی تفریق ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس کے نتیجے میں مزاحمتی اور تصادم آمیز کیفیت رونما ہو رہی ہے۔

بڑی طاقتیں جس سماجی ارتباط اور اتصال (cohesion) کی بنا پر اندرونی تناؤ اور ٹکراؤ سے محفوظ رہی ہیں' وہ اب باقی نہیں۔ جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے اور خاندان کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے۔ جذباتی ہیجان' ذہنی امراض اور جنسی بیماریاں معاشرے کو گھن کی

۶- فنانشل ٹائمز' ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء

طرح کھا رہی ہیں۔ جذباتی اور روحانی خلا' ایمان کی کمی' مشترک عزائم کا فقدان' تہذیب وتمدن کے لیے خطرہ بن رہے ہیں۔ فوج کیل کانٹے سے لیس ہے' مگر لڑنے کے جذبے اور قربانی کی دولت سے محروم ہے۔ جس کا تجربہ ویت نام ہی نہیں' لبنان اور صومالیہ میں ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ انسان کے بجائے مشینی جنگ پر انحصار بڑھ رہا ہے[ے] یہ پہلو متعلقہ حالات کا دوسرا رخ پیش کرتے ہیں' جن کی روشنی میں امریکی معاشرے میں اسلامی دعوت کے کام کی اہمیت بالکل ایک دوسری نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔

امریکہ میں مسلمان

تاریخی اعتبار سے مسلمان کئی ادوار میں براعظم امریکہ میں آئے۔

پہلی اہم ترین لہر اسپین سے اُبھری اور جنوبی وسطی امریکہ تک پہنچی۔ پھر انیسویں صدی میں یورپ' شرق اوسط اور وسطی ایشیا سے مسلمان اس سرزمین پر آئے' لیکن ان دونوں لہروں کے اثرات بہت جلد کمزور' بلکہ معدوم ہو گئے۔ پھر ایک لہر وہ تھی جس میں افریقہ کے مسلمانوں کو غلام بنا کر لایا گیا۔ ان سے ان کی آزادی کے ساتھ ان کا دین' ان کی زبان' ان کی تہذیب ہر چیز چھین لی گئی۔ آج کے افریقی امریکی (Afro-Americans) اس دَور کی پیداوار ہیں' اور اب اپنی اصل (roots) کی تلاش میں ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اور خصوصیت سے گذشتہ تیس برسوں کے دوران بڑی تعداد میں مسلمان دُنیا کے گوشے گوشے سے امکانات کی اس سرزمین پر آئے۔ اس طرح تقریباً ۷۰ لاکھ مسلمان شمالی امریکہ میں مکین ہیں' جو آبادی کا ۳ فی صد بنتے ہیں۔ اسلام

ے- ۱۹۹۱ء سے اب تک' وقفوں سے امریکہ اور برطانیہ کے عراق پر بلا روک ٹوک فضائی حملے' اور پھر [illegible] سے دسمبر ۲۰۰۱ء تک افغانستان کے نہتے لوگوں پر امریکی فضائی یلغار اس کی مثال ہے۔

اور مورمون مذہب دو تیزی سے پھیلنے والے مذاہب شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک ہزار سے زیادہ مساجد آباد ہیں اور ہر علاقے میں مسلمانوں کے دینی، تعلیمی، رفاہی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ ملک میں بنیادی آزادیاں سب شہریوں کو حاصل ہیں۔ باہر سے آنے والے مسلمان بالعموم تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہیں، اس لیے سوسائٹی میں وہ ایک مقام حاصل کر رہے ہیں، اور ان شاء اللہ آہستہ آہستہ ایک موثر قوت کی شکل اختیار کر لیں گے۔

شروع میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان کا قیام عارضی ہے اور تعلیم یا ملازمت کی ایک مدت پوری کرنے کے بعد اپنے اپنے وطن کو لوٹ جائیں گے۔ لیکن ان تیس برسوں میں جو جوہری فرق واقع ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ ''مہاجرت'' کی ذہنیت تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ ان میں یہاں آباد ہونے اور اس زمین کا حصہ بن کر اپنا کردار ادا کرنے کا تصور جڑ پکڑ گیا ہے۔ باہر سے آئے ہوئے مسلمان اور مقامی مسلمان، دونوں مل کر ایک مضبوط مسلم کمیونٹی بننے کا داعیہ رکھتے ہیں۔

علیجاہ محمد کی بلیک مسلم تحریک کا ایک حصہ اب بھی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ نیشن آف اسلام کے طور پر فرحان کی قیادت میں کام کر رہا ہے۔ لیکن ان کے بڑے بڑے گروہ یا افراد اپنے طور پر حقیقی اسلامی تعلیمات کا سراغ پا کر مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنے اور ایک الگ برادری وجود میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں یا بقیہ مسلم آبادی میں ضم ہو رہے ہیں۔ اس طرح اپنی شناخت رکھنے والی ایک مسلم برادری وجود میں آ رہی ہے۔ اب اسلام امریکہ کی سرزمین پر کوئی باہر سے درآمد قوت نہیں، بلکہ اس ملک کا ایک حصہ ہے۔

یہ بڑی اہم تبدیلی ہے جسے میں نے اپنے سفرِ امریکہ میں محسوس کیا ہے۔

اسلام، عمل اور امن کا نام ہے

'اسلام' اور 'مسلمان' کا رشتہ بڑا نازک ہے۔ بلاشبہ مسلمان وہ ہے جو اسلام کو

قبول کرے' اپنی زندگی اللہ کی بندگی میں دے۔ وہ اپنی زندگی ان مقاصد کے لیے وقف کردے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے مقاصد مقرر کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اسلام کے تابع ہے' اسلام مسلمانوں کے تابع نہیں۔ جن مغربی مفکرین نے اسلام کی یہ تعریف کی ہے کہ: ''اسلام وہ ہے جو کچھ مسلمان کریں'' (جیسے ولفریڈ کینٹ ول اسمتھ) انھوں نے بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔

مسلمانوں کو اسلام کا نمونہ ہونا چاہیے اور معیاری اور مطلوبہ مسلمان وہی ہے جس کی زندگی اسلام کی عکاس اور آئینہ دار ہو۔ اسلام تو ایک معیار اور کسوٹی ہے۔ یہ اللہ کی ہدایت کا نام ہے۔ یہ وہ دین ہے جو تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا علیہم السلام کے ذریعے اور اپنی مکمل شکل میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بھیجا' اور جو اپنی اصل شکل میں قرآن و سنت میں محفوظ ہے۔ مسلمان وہ ہیں جن کو یہ امانت سونپی گئی ہے۔ انھیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خود بھی اس دین پر چلیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں اسے قائم کرنے کی جدوجہد کریں' اسے پوری انسانیت تک پہنچائیں اور شہادت حق کا فریضہ انجام دیں۔ اسلام کوئی نسلی مذہب نہیں ہے اور نہ اس پر مسلمانوں کی اجارہ داری ہے۔

خود قرآن نے کہا ہے کہ اگر تم اس دین کا حق ادا نہیں کرو گے تو ہم دوسروں کو یہ ذمہ داری ادا کرنے کے لیے مامور کر دیں گے۔ کتنے ہی سرفراز ہیں جو پس پردہ چلے جائیں اور کتنے ہی پیچھے ہیں جو قیادت سے سرفراز کیے جائیں گے۔ بنی اسرائیل کو امانت میں خیانت کے جرم میں امامت سے معزول کیا گیا اور اُمت مسلمہ کو اس منصب پر فائز کیا گیا۔ خود مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ کس طرح مختلف علاقوں' قوموں اور نسلوں کو بلند و پست کیا جاتا رہا اور ؎

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے

جس طرح اللہ' رب المشرقین و رب المغربین ہے' رب العالمین ہے

اور ہمارے قائد و رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کے لیے (للناس اجمعین) مبعوث کیے گئے اور تمام عالموں کے لیے رحمت ہیں' اسی طرح یہ اُمت بھی کسی ایک علاقے اور جغرافیائی حصے کی اسیر نہیں۔ ساری زمین اللہ کی ملک اور حضور اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق مسجد کے مانند ہے۔ مسلمان کا یہ حق ہی نہیں بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ زمین کے ہر ہر چپے تک اسلام کے پیغام کو پہنچائے اور وہاں اسلامی زندگی کے قیام کی کوشش کرے۔ اسلام کے اس پیغام اور اس تصور کو دور حاضر کی اسلامی تحریکات نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور الحمدللہ! آج پوری دُنیا میں مسلمان بڑی حد تک اس تصور کی علم برداری کر رہے ہیں۔

پوری دُنیا' دارالدعوت

فقہا نے اپنے دور میں دارالاسلام' دارالحرب' دارالکفر اور دارالامن کی جو اصطلاحات وضع کی تھیں وہ مبنی برحق تھیں۔ لیکن آج کے حالات میں' دُنیا کے تمام ہی ممالک کے اقوام متحدہ کی رکنیت اختیار کرنے' ایک دوسرے کو قبول کرنے اور باہم سفارتی تعلقات اور تجارتی معاملات استوار کرنے' نقل و حرکت کے ضوابط میں اشتراک اور قانون کی بالادستی اور حقوق کی ضمانت کے باب میں خاص روایات قائم ہو جانے سے جو صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر دعوت اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لیے مناسب حکمت عملی کی تشکیل ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور عالم اور داعی علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے پوری دُنیا کو دارالدعوۃ قرار دیا ہے۔ دورِ رسالت مآبؐ میں حبشہ کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا وہ ہمارے لیے مثال ہے۔ بعد میں صحابہ کرامؓ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مسلمان تاجر' داعی اور مبلغ دُنیا کے گوشے گوشے میں گئے۔ انھوں نے وہاں پر اسلام کا پیغام پہنچایا' مسلمان بستیاں قائم کیں جو فروغ اسلام کی تحریک کا بیج بن گئیں۔ گجرات'

موپلہ اور سری لنکا سے لے کر کینٹن اور شنگھائی تک مسلمان بستیاں وجود میں آئیں۔ اس تاریخی روایت کی روشنی میں امریکہ' یورپ اور دوسرے ممالک میں دعوت اسلامی کو منظم انداز میں پیش کرنے اور مسلم آبادیوں کو منظم اور مضبوط کرنے کے مسائل پر غور ہونا چاہیے۔

مغرب اور اسلام کے تعلقات

ایک اور نازک مسئلہ اُمت مسلمہ اور مغربی اقوام کے تعلق کا ہے۔

مغرب اور خود امریکہ کے ہاتھوں مسلم دُنیا پر جو قیامت ٹوٹی ہے اور جو کچھ گزر رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس صورت حال کا سامنا کر کے راستہ نکالنا مسلم عوام' مسلم دینی قیادت' مسلم دانش اور مسلم حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی احتیاط یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ امریکہ اور یورپی ممالک کی حکومتوں اور وہاں کے عوام میں فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہماری تنقید کا ہدف ان ممالک کی قیادتیں اور ان کی سامراجی اور ظالمانہ پالیسیاں ہیں۔ جس طرح اللہ کے رسولوں نے گمراہ قوموں سے برسرِ جنگ ہونے کے باوجود ان قوموں کے عوام الناس تک دعوت پہنچائی' ان کو جہنم اور کفر کی آگ سے بچانے کی خدمت پوری دل سوزی اور ہمدردی سے انجام دی۔ بالکل اسی طرح ایک صاحب دعوت' اُمت کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بھی وہاں کے عام انسانوں کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھیں' بلکہ ان تک اسلام کا پیغام پہنچانے اور اصلاح کی کوشش کریں۔

یہ بڑا نازک کام ہے' مگر یہ دونوں کام اپنے اپنے طور پر صحیح خطوط پر انجام پانے چاہییں اور کسی ایک کو دوسرے پر قربان کر دینا صحیح نہیں ہوگا۔ دعوت دین تو ہمیں ظالم اور جابر حکمرانوں تک بھی پہنچانی ہے' لیکن حکمرانوں کے ظلم کی وجہ سے عوام سے کٹ جانے یا ان کو متاثر کرنے اور اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش نہ کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ یہ

کام تو مسلمانوں کو ہر حال میں کرنا چاہیے۔ ایک جمہوری معاشرے میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس طرح ہم عوام میں اپنے ہم نوا پیدا کر سکتے ہیں اور خود حکومتی پالیسیوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان انصاف کے علَم بردار بنیں' معاشرے کے مظلوم انسانوں کا سہارا بنیں' ظلم و عدوان جہاں بھی ہو اور جس شکل میں ہو' ہم اس کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ سوسائٹی کے اصل اخلاقی' معاشی' سیاسی' تہذیبی مسائل کو سمجھیں اور لے کر اُٹھیں۔ لوگ ہمیں صرف واعظ ہی کی صورت میں نہ دیکھیں بلکہ ہم مظلوم کی زبان بن جائیں' کمزوروں کے لیے سہارا بنیں اور ان کو تقویت دینے کا باعث ہوں' تاکہ سب مل کر نیکی اور انصاف کو پروان چڑھا سکیں۔

اگر ہم دشمن کے ساتھ بھی انصاف کا معاملہ کرنے والے بن جائیں تو دشمن بہت جلد ہمارا حلقہ بگوش ہو سکتا ہے۔ ہم صرف مسلمانوں کے حقوق کے علَم بردار نہ بنیں' بلکہ ہمیں تو تمام انسانوں کے لیے حق و انصاف کی علامت ہونا چاہیے۔ اسی وقت وہ تبدیلی آسکے گی جو ایک طرف تعصب اور جہالت کے پردوں کو چاک کر دے تو دوسری طرف مخالف کے دلوں کو مسخر کر لے۔

مکی دور کا یہ واقعہ ہمارے لیے ایک راہ نما مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ ابوجہل نے اس سے دو قیمتی اُونٹ خریدے ہیں' مگر ہر طرح کوشش کے باوجود اس کو رقم ادا نہیں کر رہا۔ حضورؐ اس شخص کے ساتھ ابوجہل کے گھر پر آئے' دروازہ کھٹکھٹایا اور جب ابوجہل باہر نکلا اور آپؐ کو دروازے پر دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے اس سے اُونٹ خریدے ہیں؟'' اور جب جواب اثبات میں ملا تو آپ نے فرمایا کہ: ''پھر اس کے پیسے کیوں ادا نہیں کرتے۔ اسے اس کا حق ادا کر دو!'' ابوجہل خاموشی سے گھر میں گیا اور قیمت ادا کر دی۔

امریکہ ہی نہیں' ساری دُنیا کے مسلمانوں کو اسوۂ رسولؐ کے اس پہلو سے لامتناہی

اور ابدی روشنی حاصل کرنا چاہیے۔

مسلم عالم گیریت

اُمت مسلمہ کی وحدت اسلام کا عظیم عطیہ ہے۔

قومی ریاست کے اس دور میں قومی اور جغرافیائی حد بندیوں کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا' لیکن ان کا اسیر بن جانا بھی بہت بڑا سانحہ ہوگا۔ مسلمانوں کو اعتدال کی راہ اختیار کرنا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف وہ اس ملک' اس قوم اور وہاں کے مسلمانوں اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کریں اور دعوت اسلامی کو اپنی زندگیوں کا مرکز و محور بنائیں۔ دوسری طرف اُمت مسلمہ سے اپنا رشتہ اور تعلق استوار رکھیں۔ وہ اپنی تہذیبی جڑوں کو نہ بھولیں۔ اُمت کے مسائل اور مشکلات کو اپنے مسائل اور مشکلات سمجھیں اور ان مسائل کے حل اور مشکلات کو رفع کرنے کے لیے مقدور بھر کوشش کریں۔

ان دونوں پہلوؤں کے ادراک اور مناسب اقدام کے ذریعے ہی ہم اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔

شہادت حق کے چار نکات

ہر جگہ کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ جہاں ہیں ان کے لیے اولیں میدان کار وہی علاقہ ہے۔ وہاں ان کو شہادت حق اور اقامت دین کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے موثر کوشش کرنی اور مضبوط ادارے تشکیل دینے کی فکر کرنی چاہیے۔

اس سلسلے میں چار امور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں:

اول: **اپنی اصلاح**: اپنے اخلاقی' دینی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت اور اپنی اصلاح کی فکر کرنا۔ اسلامی عمارت کا سب سے بنیادی پتھر' فرد ہے۔ مسلمان مرد ہو یا

عورت، بچہ ہو یا بوڑھا، وہ اگر اچھے انسان اور اسلام کا اچھا نمونہ بن سکیں تو اسلامی دعوت اور ہماری دوسری تمام دینی و اجتماعی سرگرمیاں بارآور ہوں گی۔ اس لیے دعوت کے اہداف میں سب سے پہلا ہدف اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننا اور بنانا ہے۔

دوم: مسلم خاندان: خاندان کے نظام کو آج ساری دُنیا ہی میں شدید چیلنج درپیش ہیں، لیکن امریکہ اور یورپ میں تو بڑی منظم اجتماعی تحریکیں خاندان کے ادارے کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس جنگ کو بڑے سائنسی انداز میں، غیر محدود وسائل کے بل بوتے پر لڑ رہی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و تمدن کا مستقبل آج داؤ پر لگا ہوا ہے۔

اگر کسی قوم میں خاندان کا نظام تباہ ہو جاتا ہے تو پھر کوئی چیز اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ مسلم خاندان کی حفاظت اور اس کی ترقی، امریکہ میں خاص طور پر بڑا اہم ہدف ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ خاندان کے نظام کو ان اصولوں پر منظم و مرتب کیا جائے جو قرآن و سنت میں مرقوم ہیں۔ ''رواج اور عرف'' میں بہت سی چیزیں صحیح اور ضروری ہیں، لیکن بہت سی چیزیں علاقائی یا تاریخی اثرات کے تحت ایسی بھی داخل ہوگئی ہیں جو حق پر مبنی نہیں۔

اسلام نے خاندان کے نظام کو مرکزی اہمیت دی ہے اور اسے جس عمومی تقسیم کار پر قائم کیا ہے۔ اسے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اسلامی احکام اور ان کی روح کے مطابق ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اس نظام کو شوریٰ کے اسلامی اصولوں کے مطابق چلنا چاہیے۔ حقوق و فرائض میں جو توازن اسلام نے قائم کیا ہے، اسے پورے طور پر ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم اور اچھی مثال وہ ستون ہیں جن پر یہ نظام قائم ہوتا ہے۔ اپنے اور اپنے اہل اولاد کو جہنم کے عذاب سے بچانا ہماری ذمہ داری ہے، قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶:۶) گھر کو اہمیت دینا، اہل خاندان کو وقت دینا اور صرف نان و نفقہ ہی نہیں، ان کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنا چاہیے۔ پھر مل جل

کر ایک ایسا گھرانا تشکیل دینا چاہیے‘ جہاں معاملات قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق انجام دیے جائیں۔ ‏‏جس کا ہدف اسلامی نمونے کے مطابق اور ہر ہر ملک کے حالات کے مطابق اپنا کردار ادا کرنا ہو۔ بلاشبہ اس میں ماں کا کردار بڑا کلیدی ہے۔ تاہم اس ضمن میں باپ‘ بزرگ اور جوان ہر ایک کو اپنا رول صحیح صحیح ادا کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم بھی ان تباہیوں سے نہ بچ سکیں گے جو فطرت سے انحراف کا لازمی نتیجہ ہیں۔

سوم: **مسلم کمیونٹی کا قیام:** اسلام جہاں انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ انفرادی جدوجہد کی تلقین کرتا ہے‘ وہیں جماعت کے قیام اور اجتماعی اور منظم جدوجہد کو بھی اسلامی زندگی کا لازمی حصہ‘ بلکہ امتیازی تشخص قرار دیتا ہے۔ اسلام پر مبنی اجتماعی زندگی کے بغیر مسلمان اُمت کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے اجتماعی جدوجہد ہو۔ اس کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن کے ذریعے سوسائٹی مستحکم ہوتی ہے۔ مسجد‘ مدرسہ‘ وقف‘ خدمت خلق کے ادارے‘ دعوت و تبلیغ کا نظام‘ اجتماعی کفالت کے ادارے‘ تعلیم‘ ہنرمندی (skills) اور تحقیق کا اہتمام‘ ثالثی اور قضا‘ قانون کی بالادستی اور آخرکار ایسا انتظام کہ ریاست کی قوت قاہرہ اسلام کے تابع ہو سکے۔ ان میں سے جو ادارے جہاں کہیں قائم ہو سکتے ہیں‘ ان کی فکر کرنا۔ شوریٰ کی بنیاد پر مسلم معاشرے کو مربوط و متحد کرنا‘ اسلامی زندگی کے فروغ کے لیے ضروری اور مطلوب ہے۔

چہارم: **اُمت مسلمہ سے ربط و تعلّق:** مختلف کمیونٹیز میں تعاون‘ مختلف علاقوں اور ممالک میں رابطہ‘ عالمی اداروں کا قیام اور ان سے تعاون‘ اُمت کے مسائل اور معاملات کا فہم و ادراک اور ان کے حل کے لیے مناسب تعاون‘ عالمی سطح پر اسلامی احیا اور قیام دین کی جو جدوجہد ہو رہی ہے اس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرنا۔

مسلمان دُنیا میں جہاں بھی ہوں‘ انھیں اس فریم ورک میں اپنے اہداف اور ترجیحات متعین کرنی چاہییں۔ جو کچھ قابلِ حصول ہو اس کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل

ہونا چاہیے۔ جو ابھی قابل حصول محسوس نہ ہو اس کے لیے متفکر اور سرگرداں رہنا چاہیے۔

امریکہ میں مسلم تنظیموں کا لائحہ عمل

امریکہ کے مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کی قیادت کو ہم خاص طور پر اس طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں' کہ انھیں اسلام کی ابدی تعلیم اور مسلمانوں کی شان دار روایات کی روشنی میں اپنے حالات کے مطابق لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے۔ جو چیزیں منصوص ہیں ان کے بارے میں کسی سمجھوتے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان پر ہماری دُنیا اور آخرت کا انحصار ہے اور ان کے ذریعے ہمارا جداگانہ تشخص قائم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ چند باتوں کا اہتمام ضروری ہے:

۱- تعاون اور احترام: ایسی آبادیوں میں جہاں مسلمان دُنیا کے مختلف علاقوں سے آئے ہیں' وہ اپنے ساتھ یقیناً اپنے اپنے علاقے کی روایات اور رسوم اور مسائل اور اُلجھنیں بھی لائے ہیں۔ اس ذیل میں اصولی اور اہم' فروعی اور جزوی میں فرق بہت ضروری ہے۔ اسی طرح تحمل' بردباری اور ایک دوسرے کے لیے دل ہی میں نہیں' تنظیم اور معاشرت میں بھی جگہ بنانا بہت ضروری ہے۔

امریکہ میں مقامی مسلمانوں اور خصوصیت سے افریقی امریکی مسلمانوں کی قابل ذکر موجودگی کی وجہ سے ان کو ساتھ لے کر چلنے' انھیں عزت اور محبت کا مقام دینے' ان کی روایات اور مشکلات کا احساس کرنے' ہمدردی اور حکمت کے ساتھ مل جل کر رہنے اور نئے ادارے فروغ دینے کا کام اشد ضروری ہے۔

مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے جزیروں میں نہیں بٹ جانا چاہیے۔ الگ جزیرے ہوں تو ان میں باہمی ربط و ارتباط کے ذریعے رشتے استوار کرنا اور اس طرح اتحاد اور وسعت اختیار کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم ایک ہم مزاج (homogenous) برادری کی تصویر نہیں بن سکتے تو اسلام کے عالمی پیغام کو کیسے پیش کرسکیں گے؟ دین اور رسم و رواج

کا فرق اور مسلم معاشرے کے تنوع کے درمیان وحدت اور یکسانی کی تلاش اور قیام بڑے اہم چیلنج ہیں۔

۲- **خواتین کا مسئلہ:** خواتین کا رول بھی معاشرے کا اہم مسئلہ ہے۔ آج کی دُنیا میں محض یہ مثالیں دینا کافی نہیں کہ اسلام نے عورتوں کو زندہ دفن کرنے جیسے قبیح فعل کو حرام قرار دیا اور انھیں عزت کا مقام دیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شریعت کی حدود کا احترام کرتے ہوئے' مسلمان مرد اور عورت دونوں خاندان کے ادارے کے تحفظ اور معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے کا کام انجام دیں۔ گھروں میں مشاورت کا نظام قائم کیا جائے۔ عورتوں کی اسلامی ہی نہیں عموی تعلیم کا اہتمام ہو۔ حجاب کی حدود میں رہتے ہوئے دُنیا میں ایک مثالی معاشرے کی تصویر پیش کی جائے تاکہ **بعضهم اولیآء بعضٍ** (المائدہ ۵:۵۱) کو عملی شکل میں دیکھا جاسکے۔

۳- **نئی نسل کے لیے فکرمندی:** بچوں کی تعلیم و تربیت خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ اس کا آغاز بالکل فطری طور پر گھر اور خاندان کے ماحول میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی اسکولوں اور کالجوں کا قیام اور اسلامی خطوط پر مسلمان بچوں اور بچیوں اور نوجوانوں کے لیے مناسب اور موثر تنظیموں کا قیام ضروری ہے۔ جو دینی تعلیم و تربیت کا کام بھی انجام دیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی عمر' ذوق اور ضرورت کے مطابق انھیں مختلف النوع سرگرمیوں کے بھرپور مواقع فراہم کریں۔ الحمدللہ' نوجوانوں کی تنظیموں کی تو فکر کی جارہی ہے' لیکن چھوٹے بچوں خصوصیت سے ۸-۹ سال سے لے کر ۱۲-۱۳ سال تک کے بچوں اور بچیوں کے لیے مناسب ادارے موجود نہیں۔ ان کی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

۴- **دعوت' تعلیم اور تحقیق:** مسلمانوں کو تعلیم و تحقیق کے میدان میں دوسروں سے بڑھ کر حصہ لینے کی ضرورت ہے' تاکہ کل کی مسلم برادری بہترین صلاحیتوں سے آراستہ ہو اور ایک جان دار قیادت وجود میں آسکے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے

کہ مسلمانوں کی مستقبل کی مذہبی قیادت' امریکہ اور اسی طرح یورپ اور دوسرے ممالک میں وہیں کے لوگوں میں سے رونما ہو۔ اس کے لیے ٹھوس دینی تعلیم اور جدید ذرائع ابلاغ و دعوت کی تعلیم ضروری ہے۔ علاقائی یا ملکی سطح پر ایسے اداروں کا قیام وقت کی ضرورت ہے۔

۵-اسلامی لٹریچر: امریکہ میں دیدہ زیب' مدلل اور موثر اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کے لیے کام کرنے والے اداروں اور افراد کار کی تیاری اہم کام ہے۔ الحمدللہ' اس مرتبہ بچوں کے لیے نیا لٹریچر میرے علم میں آیا۔ نیز اس معاشرے سے متعلق موضوعات پر بھی نئی کتب اور نئے سمعی و بصری لوازمات آنا شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی یہ ضرورت کا دس فی صد بھی پورا نہیں کر رہے۔ امریکہ اور یورپ کے لیے دوسرے علاقوں میں تیار کردہ لٹریچر کی افادیت ہے' مگر صرف ایک حد تک۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ موجودہ لٹریچر کو ازسرنو مدّون کر کے پیش کیا جائے۔ اصل ضرورت نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور نئے لٹریچر اور جدید ٹکنالوجی پر مبنی لوازمے کی فراہمی ہے۔ ان سب کاموں کے لیے سب تنظیموں کو مل کر منصوبے بنانے چاہییں اور کام کو باہم تقسیم کر کے وقت کی ضرورت کو پورا کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ امریکہ جیسی بڑی مارکیٹ کے لیے مناسب مارکیٹنگ اداروں کا قیام ازبس ضروری ہے۔

۶-معاشی خود انحصاری: مسلم برادری کو حرام سے بچانے' حلال کو فروغ دینے اور معاشی خود انحصاری پیدا کرنے کے لیے نئے اداروں کا قیام اور باہمی تعاون سے مسلمانوں کے تجارتی نیٹ ورک کا قیام ضروری ہے۔ اس سلسلے میں افریقی امریکی مسلمانوں کے مسائل بہت گمبھیر ہیں۔ جیلوں میں قبول اسلام کی تحریک الحمدللہ بہت قوی ہے' لیکن جیلوں سے باہر آنے کے بعد ان نومسلموں کو معاشرے میں سمونے اور معاشی اعتبار سے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے مناسب انتظامات کی شدید کمی ہے۔ اس طرف فوری توجہ درکار ہے۔

۷- **مسلم میڈیا:** مسلم میڈیا کی ترقی وقت کی آواز ہے۔ اس کے لیے مسلمانوں کا اپنا میڈیا بھی ضروری ہے اور امریکہ کے قومی میڈیا میں مسلمانوں کا نفوذ بھی۔ امریکہ میں انٹرنیٹ پر چلنے والے اسلامی پروگرام میں نے دیکھے' اس سے بے حد مسرت ہوئی۔ لیکن ضرورت تو ہر میدان میں مسلمانوں کے موثر وجود' تشخص اور اعلیٰ فنی مہارت کی ہے اور یہ ممکن بھی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ منظم انداز میں اس کی فکر کی جائے۔ نوجوانوں کو کیریر پلاننگ میں مدد دی جائے' تاکہ وہ مسلم برادری کی ضرورت کے مطابق اپنی ترجیحات مقرر کریں۔

۸- **دعوت و عمل کی لگن:** مقامی آبادی میں کام کرنے' سوسائٹی کے ہر طبقے سے روابط رکھنے اور انھیں صرف تبلیغ ہی نہیں' بلکہ اپنی مثال اور مسلم اداروں اور تنظیموں کے کاموں میں شریک کر کے اسلام اور مسلمانوں کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں کوئی مشنری طبقہ نہیں اور نہ عیسائیت کی طرح کوئی مذہبی اسٹیبلشمنٹ ہے۔ یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے محلے' دفتر اور فیکٹری میں' اپنے اسکول' کالج اور یونی ورسٹی میں' غرض وہ جہاں بھی کام کر رہا ہے اپنے قول و عمل سے دعوت دین کا کام کرے۔ دوسروں میں دلچسپی لے' ان کی ہمدردی حاصل کرے' ان کی مشکلات میں مدد کرے اور مشترک مفاد کو بنیاد بنا کر انھیں اپنے اور اپنے دین سے قریب لائے۔ سوسائٹی کے مشترک اجتماعی مسائل کو اٹھائے اور بتائے کہ اسلام کے ذریعے کس طرح فرد کی روحانی اور اخلاقی زندگی اور معاشرے کی اجتماعی زندگی بلکہ پوری دُنیا کا نظام بہتر بن سکتا ہے۔ آج امریکی معاشرے کے پاس خود اپنے افراد کو یا عالمی سطح پر عام انسانوں کو دینے کے لیے کوئی پیغام' کوئی مثال' کوئی نمونہ نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلام کو وہ پیغام' وہ مثال اور وہ نمونہ بنانے کی کوشش کریں۔

۹- **جمہوری عمل میں حصہ:** امریکہ کی اجتماعی زندگی' قومی اور بین الاقوامی معاملات پر ملک اور اس کی قیادت کی پالیسیاں بھی ہماری دلچسپی کا مرکز ہونا

چاہییں۔ جمہوری معاشرے میں ان کو متاثر کرنے کے واضح طریقے ہیں۔ ان طریقوں اور راستوں کو دوسرے کے لیے چھوڑ دینا کوئی عقل مندی نہیں۔ مسلم اُمت کے مسائل کے بارے میں بھی ہمدردانہ رویہ پیدا کرنا اور اصل حقائق کو دلائل کے ساتھ پیش کرنا بڑا اہم میدان کار ہے۔ امریکہ اور اس کے عوام اور ملّت اسلامیہ کے درمیان بہت سے معاملات پر اشتراک مفاد ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا مخصوص گروہ امریکہ کو ناک سے پکڑ کر اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتا ہے تو کیا دُنیا بھر کے مسلمانوں سے دوستی امریکہ کے مفاد میں نہیں؟

امریکہ میں ہی نہیں، تمام مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان، ان ممالک اور مسلم اُمت کے درمیان پل کا کام دے سکتے ہیں۔ وہ دنیا سے تصادم اور ظلم کو کم کرنے اور تعاون اور مل جل کر رہنے کی راہیں ہموار کرنے میں ایک موثر اور اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، بہ قول علامہ اقبالؒ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے☆

☆ترجمان القرآن، اگست ۱۹۹۸ء

اشاریہ

نوٹ: افغانستان، امریکہ اور پاکستان کے الفاظ کو اشاریے میں نہیں لیا گیا

- پروفیسر خورشید احمد نے معاشیات' علوم اسلامیہ اور قانون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ شعبہ معاشیات کراچی یونی ورسٹی میں تدریسی ذمہ داریاں انجام دیں۔ آپ عصر حاضر میں عالمی اسلامی تحریکوں کے رہبر اور ترجمان ہیں۔ عالم اسلام اور مغرب کے درمیان مکالمے میں ملّت اسلامیہ کے مفاد پر پختگی سے قائم رہنے' منطقی استدلال برتنے اور غیر جذباتی انداز اپنانے کے باعث تمام متعلقہ حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

- عصر حاضر میں اسلامی فکر کو درپیش چیلنج کا جواب دینے اور اسلامی علمی اداروں میں ربط وارتباط پیدا کرنے کے ساتھ آپ نے اسلامی معاشیات کی جدید علمی وتدریسی تشکیل میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس پر انھیں پہلا ''اسلامی ترقیاتی ایوارڈ'' ۱۹۸۸ء اور ''شاہ فیصل ایوارڈ'' ۱۹۹۰ء عطا کیا گیا۔

- دی اسلامک فاؤنڈیشن' برطانیہ اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد کے چیئرمین ہیں۔ اس سے قبل اسلامک ریسرچ اکیڈمی' کراچی کے سیکرٹری جنرل تھے۔ سینیٹ آف پاکستان کے ممبر (۱۹۸۵-۹۷ء) رہے۔ قبل ازیں پاکستان کے وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی وترقیات اور ڈپٹی چیئرمین منصوبہ بندی کمیشن (۱۹۷۸-۷۹ء) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسٹوڈنٹس وائس' نیوایرا' چراغ راہ' کے مدیر اعلیٰ اور اقبال اکیڈمی کے تحقیقی مجلے اقبال ریویو کے ڈپٹی ایڈیٹر رہے۔ اس وقت ماہ نامہ ترجمان القرآن کے مدیر ہیں۔